بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ66جون-2023جلدنمبر16

Tahreek-e-adab vol-16, issue-66 June 2023

مدیر Editor

جاویدانور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik Ex.HOD Urdu,Jammu University

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

عظیم حسین، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد، ڈاکٹر فروز حیدری،
عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Azeem Hussain(Director,Idiol Offshore,Mumbai)
Prof. Arifa Bushra(Dept. of Urdu,Kashmir University)
Rasheed Ahmad(Chairman Rosewood Academy,VNS
Dr. Feroz Haidry H.O.D.Urdu,VN Government Institute of Arts and Social Sciences,Nagpur
Irfan Arif(H.O.D.Dept. of Urdu,Govt.SPMR College of Commerce,Cluster University of Jammu,Jammu)
Dr.Chman Lal Bhagat(Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Vol-16 (جلد نمبر 16) Year of Publication 2023

شمارہ نمبر : شمارہ، 66 جون، Issue 66 June 2023

سرنامہ خطاط: انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زر سالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زرِ رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Tahreek-e-adab IFSC IOBA 0001968 Current A/C no.196802000000440 Indian Overseas Bank, Glenhill School Ext. Counter,Manduadih Bazar,Varanasi-221103(U.P) India

***

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087 State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرا اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔اسلام: مذہب امید، زندگی: ایک قیمتی موقع،
دونوں حالتوں میں صبر مولانا وحید الدین خاں 7
2۔قادر کی قدرت (5)(سوانح) خالد حسین 12
مضامین:
1۔اسلوب: تعریف، توضیح پروفیسر آفتاب احمد آفاقی 23
4۔عارف نقوی کا ناولٹ "بجھتے جلتے چراغ" پر ایک نظر پروفیسر اسلم جمشید پوری 34
5۔ہمہ جہت فن کار: کشمیری لال ذاکر ڈاکٹر راشد عزیز 41
6۔محرومیت بنام مشمولیت: مشمولی تعلیم میدان عمل میں ڈاکٹر تلمیز فاطمہ نقوی 45
7۔مخمور سعیدی: جدید شاعری کا ترجمان ڈاکٹر فرخندہ ضمیر 54
8۔شہری مقامی اداروں کی دستوری حیثیت اور مسائل ڈاکٹر سید نجی اللہ 57
افسانے:
1۔شہرت (افسانچہ) عارف نقوی 65
2۔پہچان، خودسری، گمراہی وحشی سعید 67
3۔اور پھر یوں ہوا نور شاہ 69
4۔دوسرا شوہر ڈاکٹر نذیر مشتاق 71
5۔بڑی فیملی نگار عظیم 76
6۔میری ماں ڈاکٹر حمیرہ سعید 82
7۔ہم میٹھے ہو گئے رفیعہ نوشین 85
مضامین:
1۔کشمیری زبان: لسانی شناخت کے مسائل و راہ حل ڈاکٹر مدثر رشید راتھر 89
2۔مہجورؔ: کشمیری ادب کے تناظر میں سبزار احمد نائیکو 95

3۔سعدی شیرازی کی شاعری میں پیام امن ڈاکٹر صفی محمد نائک،ڈاکٹر شازیہ بانو 99
4۔مخدوم کی عشقیہ شاعری ڈاکٹر ظہور دین 102
5۔عصری تعلیم کے حوالے سے ابن سینا کے تعلیمی فلسفہ
کی اہمیت ڈاکٹر عمران انصاری،ڈاکٹر امین انصاری 107
6۔امراؤ جان ادا لکھنوی معاشرے کا ایک مرقع ڈاکٹر الطاف حسین ڈار 116
7۔مولانا الطاف حسین حالی کی اردو نثر پر عربی زبان وادب کا اثر ڈاکٹر اصغر علی بیگ 120
8۔معرفی کتاب تاریخی راج درشنی ڈاکٹر اختر حسین شاہ 128
9۔لسانی صلاحیتوں کا عمومی جائزہ (ایل۔ایس۔آر۔ڈبلیو)
سید توقیر امام، پروفیسر ڈاکٹر فیض احمد 135
10۔" سنہ لانکہِ پٹھ" حسن کا دریچہ آصف علی بٹ 142
11۔شیخ یعقوب صرفی کے احوال اور فارسی آثار پر ایک نظر
ڈاکٹر شازیہ بانو،ڈاکٹر صفی محمد نائک 146
12۔امین کامل کے افسانوں میں کرداروں کی تہہ داری ڈاکٹر مدثر رشید 153
13۔" اختر محی الدین" بحیثیت کشمیری افسانہ نگار سبزار احمد نائیکو 157
غزلیں: 160
یعقوب تصور،عرفان عارف،نسیم بیگم نسیم،خورشید بسمل،ثریا جبین
مضامین:
1۔بچوں کے منفرد مضمون نگار زماں آزردہ سبرینہ جاوید 165
2۔برصغیر میں پنڈت شعراء پر" مثنوی معنوی" کے معنوی اثرات۔اعجاز احمد ملک 170
3۔مخطوطہ شناسی میں تدوین متن کی اہمیت جنید حسین 178
4۔قصیدہ" مخبر الاسرار": ایک مطالعہ محمد اکرم 183
5۔غالب کی اردو شاعری میں تصور حیات اشتیاق احمد 187
6۔جموں وکشمیر کے گوجر بکروال طبقے میں مفلسی کے اسباب مقصود احمد، محمد مشتاق 192
7۔شیخ العالم اور ریشی سلسلہ اعجاز یوسف ملک 203
8۔ناول" خواب حقیقت" کشمیر کی تہذیب وثقافت کا ترجمان ام سلمہ 207

9۔جموں وکشمیر میں ادب اطفال کی صورت حال	سبرینہ جاوید	210
10۔پروفیسر ابن کنول کی ادبی خدمات	رضیہ بشیر	214
11۔قاضی عبدالستار: بحیثیت تاریخی ناول نگار	شہنواز انصاری	219
12۔تلنگانہ کے ثانوی اسکولی نصاب میں آفاتی انتظام کے مواد کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد تبریز عالم	225
13۔اسعد بدایونی کے شعری مجموعہ" دھوپ کی سرحد" کا موضوعاتی مطالعہ	شائستہ شریف	229
14۔ڈرامہ" انارکلی" جدید تنقید و تجزیاتی مطالعہ	آفتاب احمد شاہ	233
15۔حامدی کاشمیری: بحیثیت نقاد	اسریٰ بانو	240
16۔ہندوستان میں سیاسی شرکت کے ذریعے خواتین کی خودمختاری۔	ڈاکٹر شبانہ کیسر	244
17۔اورنگ آباد میں ورکنگ کلاس اور نان ورکنگ کلاس خواتین کا ازدواجی ایڈ جسٹمنٹ	چودھری قیصر جہاں	249
18۔ملک زادہ منظور احمد کی ناول نگاری (کالج گرل کے حوالے سے)	محمد فیض صدیقی	258
19۔پریم چند	راشد تسنیم، نیہا رفیق	263
20۔صنف نظم کے تدریسی مقاصد اور طریقہ کار	ڈاکٹر محمد ارسد انصاری	266

Islam:Mazhab-e-Ummeed by Maulana Wahiduddin Khan

مولانا وحیدالدین خاں

اسلام ۔مذہبِ اُمید

اسلام اُمید کا مذہب ہے۔اسلام کی تمام تعلیمات اُمید اور حوصلہ کا سبق دیتی ہے۔بظاہر مشکل اور ناکامی اور محرومی جیسے حالات میں بھی اسلام انسان کو اُمید اور حوصلہ کا سبق دیتا ہے۔وہ شام کے اندھیرے میں بھی صبح کی روشنی کی خوشخبری سناتا ہے۔قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ وترجون من اللہ مالا یرجون (النساء ۱۰۴)۔یعنی اور تم اللہ سے وہ اُمید رکھتے ہو جو اُمید وہ نہیں رکھتے۔اس سے معلوم ہوا کہ ایک شخص جو اسلامی فکر کا حامل ہو وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو تاریکی میں روشنی دیکھتا ہے، جو وہاں بھی پُراُمید رہتا ہے جہاں دوسرے لوگ اُمید اور حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں۔

اس معاملے میں اسلام اس حد تک جاتا ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دے دیا گیا ہے۔قرآن میں ایک پیغمبر کی زبان سے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ولاتیئسوا من روح اللہ انہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔(یوسف ۸۷)یعنی تم اللہ کی رحمت سے نااُمید نہ ہو، اللہ کی رحمت سے صرف منکر ہی نااُمید ہوتے ہیں۔اس کے مطابق، اہل اسلام کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں کہ وہ مایوس ہوجائیں۔حالات بظاہر خواہ کتنے ہی زیادہ غیر موافق ہوں مگر اہل ایمان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ آخر وقت تک پُر امید بنے رہیں۔یہی وجہ ہے کہ اسلام میں خودکشی کی موت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سچائی کا یقین: موجودہ دُنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اس یقین پر قائم ہو کہ اس نے سچائی کو پالیسا ہے۔وہ جس راستہ پر چل رہا ہے اس کے حق ہونے پر اسے کوئی شبہ نہ ہو۔اس قسم کا یقین آدمی کی لازمی ضرورت ہے۔یہی یقین آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان معتدل طور پر رہے۔اس کو ذہنی سکون حاصل ہو۔وہ رات کو اطمینان کی نیند سوئے اور دن کو اعتدال کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے۔اسلام آدمی کو یقین کی یہی نعمت عطا کرتا ہے۔ایک پہاڑ یا ایک جانور کی یہ ضرورت نہیں کہ وہ دُنیا میں اپنے وَجود کا جواز تلاش کرے۔مگر انسان فطری طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ یہ جانے کے وہ کیا ہے اور کس مقصد کے تحت دنیا میں پیدا کیا گیا ہے۔اس کو ایک لفظ میں زندگی کا نظریہ

(آئیڈیالوجی) کہا جاسکتا ہے۔فلسفہ اس نظریۂ حیات کی تلاش کا علم ہے۔مگر پانچ ہزار سال سے بھی زیادہ مُدت کی تلاش کے باوجود ابھی تک فلسفہ اپنی تلاش کا جواب نہ پا سکا۔فلسفہ اپنے آخری مرحلہ میں پہنچ کر انسان کو صرف تشکیک اور بے یقینیت دینے میں کامیاب ہوا۔فلسفہ کے بعد سائنس کا درجہ آتا ہے مگر سائنس نے پیشگی طور پر یہ مان لیا ہے کہ وہ حقیقت کا صرف جزئی علم دے سکتی ہے، کُلی حقیقت تک پہنچنا سائنس کے لئے ممکن ہی نہیں۔

گویا سائنس نے خود ہی یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ مقابلہ کے میدان میں اُترنے کی سرے سے اہل نہیں۔اب آخری چیز جس سے اس معاملہ میں رَجوع کیا جائے وہ مذہب ہے۔یہاں بھی منظر زیادہ مختلف نہیں۔بظاہر دُنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب پائے جاتے ہیں مگر اسلام کے سوا تمام مذاہب کی حالت بلا استثناء یہ ہے کہ ان کو نہ علمی تائید حاصل ہے اور نہ تاریخی اعتباریت۔ان مذاہب کی مقدس کتابیں تحریف کی بنا پر صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتوں کا مجموعہ بن گئی ہیں۔

اسی طرح ان کے تاریخی حالات اتنے کم معلوم ہیں کہ خالص علمی اور عقلی اعتبار سے ان کی سچائی پر یقین نہیں کیا جاسکتا۔اس طرح یہ تمام مذاہب بھی عملی طور پر اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ انسان کو وہ سچائی دے سکیں جس پر وہ کامل یقین کے ساتھ قائم ہوجائے۔افکار کے اس جنگل میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نہ صرف کامل سچائی کا حامل ہے بلکہ واقعاتی اعتبار سے وہ ایک ایسا مذہب ہے جس کی تاریخی اعتباریت میں کوئی شبہ نہیں۔اسلام انسان کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جو غیر مشتبہ سچائی کا حامل ہے۔جو کُلّی صداقت کا سرمایہ اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔جو اپنی تاریخی نوعیت کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ انسان اس یقین کے ساتھ اس کو اختیار کرسکے کہ اس نے سچائی کو پالیا ہے جس کی تلاش اس کی فطرت میں پیشگی طور پر موجود تھی۔

اسلام ایک متلاشی روح کا حقیقی جواب ہے۔وہ انسان کی شخصیت کی تکمیل ہے۔وہ انسان کو وہ غیر متزلزل یقین دیتا ہے جس کے سہارے وہ دُنیا میں زندہ رہ سکے۔اسلام آدمی کی قبل از موت زندگی کو بھی بامعنی بناتا ہے اور اس کے بعد از موت زندگی کو بھی۔

زندگی ایک قیمتی موقع

زندگی اگر صرف وہی ہے جو موجودہ دنیا میں ہر آدمی کو ملتی ہے تو بلاشبہ وہ اتنی زیادہ بے معنی ہے کہ اس سے زیادہ بے معنی چیز اور کوئی نہیں۔انسان لامحدود صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔مگر دنیا میں وہ اپنی ان صلاحیتوں کا پانچ فیصد حصہ بھی استعمال نہیں کرپاتا کہ وہ مرجاتا ہے۔انسان کے

اندر تمنّاؤں اور آرزوؤں کی ایک کائنات بسی ہوئی ہے مگر کوئی بھی شخص اپنی ان تمنّاؤں اور آرزوؤں کی تکمیل اس دنیا میں نہیں پاتا۔ تمام موجودات اور مخلوقات میں انسان واحد مخلوق ہے جو مستقبل کا تصّور رکھتا ہے۔ مگر تمام انسان ابھی اپنے حال میں ہوتے ہیں کہ ان کی دینوی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے ،بغیر اس کے کہ انہوں نے اپنے مستقبل کو پایا ہو۔ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے کامیاب زندگی کا حریص ہے ،مگر یہاں کوئی بھی انسان اپنی کامیابی کو نہیں پاتا۔ بظاہر انسان کے لئے صرف یہ المناک انجام مقدر ہے کہ وہ اپنی کامیابی کی تاریخ بنانے سے پہلے اس دُنیا سے چلا جائے۔

اسلام اس اَندھیرے میں انسان کے لئے ایک روشنی ہے۔ اسلام کا جنّت کا تصّور آدمی کو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی ناکامی کو کامیابی سے بدلے۔ کس طرح وہ اپنے خوابوں کے اس مستقبل کا مالک بنے جہاں وہ اپنی شخصیت کی تکمیل (Fulfillment) کو پاسکے۔ حقیقت کا یہ انکشاف جو اسلام کے ذیعہ کیا گیا ہے وہ ہر آدمی کے لئے زندگی کو ایک قیمتی موقع بنا دیتا ہے۔ اب ہر آدمی ایک مطلوب منزل دریافت کرلیتا ہے جس کی طرف وہ چل سکے۔ ہر آدمی ایک ایسے نشانے کو جان لیتا ہے جس کو وہ اپنی تمام سرگرمیوں کا مرکز توجہ بنالے۔

دونوں حالتوں میں صبر

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عجبت من قضاء اللہ عزوجل للمؤمن ان اصابہ خیر حمد ربہ شکر وان اصابتہ مصیبہ حمد ربہ وصبر المومن یوجر فی کل شئی (مسند الامام احمد بن حنبل ا ر ۱۷۳)۔ یعنی مومن کے معالے میں اللہ کا فیصلہ کیسا عجیب ہے۔ اگر اس کو بھلائی پہنچتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور شکر کرتا ہے اور اگر اس کو کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ حمد کرتا ہے اور صبر کرتا ہے۔ اس طرح مومن کو ہر چیز میں اجر ملتا رہتا ہے۔ مومن سے مُراد وہ انسان ہے جس کا شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہو، جس کی سوچ اس حد تک ترقی کرچکی ہو کہ وہ ہر پیش آنے والی صورتحال پر مثبت جواب (Posivite Response) دے سکے۔ وہ قریبی حالات سے اوپر اُٹھ کر حقائق کو دیکھنے والا بن چکا ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کا ذکر اوپر کی حدیث میں کیا گیا ہے۔ ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو کوئی پسندیدہ چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ اس غلط فہمی میں نہیں پڑتا کہ یہ اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ خدا کے قائم کردہ نظام کی بنا پر ممکن ہوا ہے۔ یہ چیز اس کو حقیقت پسند بناتی ہے اور اس کو نظام خداوندی کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح اگر اس کو کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آئے تب بھی اس کا ترقی یافتہ شعور اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ اس کا ذہنی سکون نہ ٹوٹے۔

وہ فریاد یا شکایات کے بجائے صبر و تحمل کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔
موجودہ دُنیا میں یہ مزاج آدمی کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔اس کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ حالات کے اُتار چڑھاؤ کے باوجود وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہے۔وہ ہر نہیں میں اپنے لئے ایک کا راز دریافت کرلے۔اس کی زندگی کبھی تعطل سے دوچار نہ ہو۔اس کی اُمیدوں کا چراغ کبھی بجھنے نہ پائے، وہ اس کو ہمیشہ روشنی اور حرارت دیتا رہے۔
دشمن میں دوست: قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے---اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بُلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔اور بھلائی اور بُرائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔(حم السجدہ ۳۳ ۔ ۳۴)
کسی سے دشمنی ہو جائے یا کسی آدمی کو ایک شخص اپنا دشمن نظر آئے تو اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ یہ میرا دشمن ہے۔اس کا حل صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو تباہ کر دیا جائے۔مگر اسلام ایسے معاملے میں بھی ایک اُمید افزاء پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ تمہارے دشمن کے اندر تمہارا ایک دوست چھپا ہوا ہے۔اس دوست کو دریافت کرو، اور پھر تمہارا دشمن تمہارا قریبی ساتھی بن جائے گا۔دوستی یا دشمنی کوئی پیدائشی صفت نہیں۔کوئی آدمی پیدائشی طور پر کسی کا دشمن نہیں ہوتا۔اگر ایک شخص آپ کو اپنا دشمن نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اس کی ایک مصنوعی حالت ہے۔آپ اپنے میٹھے بول اور اپنے حُسن سلوک سے اس کو ایک نیا انسان بنا سکتے ہیں۔آپ اپنے دوستانہ عمل سے اس کو اس حد تک بدل سکتے ہیں کہ آپ کے خلاف اس کی ضد اور نفرت ختم ہو جائے۔جو شخص اب تک بظاہر آپ کا غیر بنا ہوا تھا، وہ آپ کا اپنا بن جائے۔یہ ہر انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں بہتر امکانات کی فہرست اتنی لمبی ہے جو دُشمن تک کو دوست کے خانہ میں درج کئے ہوئے ہے۔یہ اسلامی تعلیم آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ کانٹے کو بھی پھول کے روپ میں دیکھے، وہ مخالف انسان میں بھی اپنا ایک موافق انسان پالے۔یہ خود فطرت کا ایک اٹل قانون ہے نہ کہ سادہ طور پر محض ایک مذہبی عقیدہ۔
صبر کا فائدہ: ایک حدیث قُدسی کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: إذا ابتليت عبدي بحبيبتيه فصبر عوضته منهما الجنة۔(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/۱۲۰) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں سے آزماتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے تو مَیں اس کو اس

کے بدلے جنّت دے دیتا ہوں۔ روای کہتے ہیں کہ وہ دو محبوب چیزوں سے مُراد دو آنکھیں ہیں۔

دو آنکھوں کی محرومی پر صبر کا جو انعام کسی کو خُدا کی طرف سے ملتا ہے اس کا تعلق صرف جنّت سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے انسان کا انعام موجودہ دُنیا ہی سے شروع ہو جاتا ہے جس کی آخری اور تکمیلی صورت یہ ہے کہ اس کو جنّت میں داخلہ مل جائے۔ ایسا انسان دُنیا میں نابینا ہونے کے باوجود کامیاب رہتا ہے اور آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ بینا بھی اور کامیاب بھی۔ دونوں آنکھوں کی محرومی پر جب ایک آدمی صبر کر لے تو اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ اس کی اندرونی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اس کی داخلی شخصیت میں ایک نیا نفسیاتی عمل شروع ہو جاتا ہے جو اس کے اندر چھُپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس کے دماغ کی وہ مخصوص کھڑکیاں کھُل جاتی ہیں جو خالق فطرت نے صرف اس لئے اس کے اندر رکھی ہیں تا کہ وہ ایمرجنسی کے وقت اس کے کام آئیں۔

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے دماغ میں بہت سے خانے ایسے ہیں جو عام حالات میں بالکل بند رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت کھلتے ہیں جب کہ انسان کسی ہنگامی حالت سے دوچار ہو جائے۔ صبر انہیں بند دروازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ ایسے حادثے کے موقع پر جو لوگ غم اور فریاد کا شکار ہو جائیں، ان کے دماغ کے یہ ہنگامی خانے بدستور بند پڑے رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایسے موقع پر صبر کا مثبت رسپانس (Positive response) دیں وہ فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ظاہری آنکھوں سے محروم ہو کر وہ داخلی آنکھوں کی صورت میں اس کا بدل پا لیتے ہیں۔

راقم الحروف نے خود اپنی زندگی میں کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر بھوپال کے جناب الطاف احمد صاحب طویل عرصے سے بینائی سے محروم ہیں مگر وہ اپنے تمام کام معمول کے مطابق اور کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات ڈاکٹر ایوب لبنانی سے ہوئی۔ وہ ٹمپل ٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں اور اپنے تمام کام بالکل معمول کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ مشین کی مدد سے وہ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں۔ آنکھ انسان کی تمام قیمتی چیزوں میں سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جب آنکھ جیسی قیمتی چیز سے محرومی پر صبر سے انسان کو نئی زندگی ملتی ہے تو دوسری محرومیوں پر صبر سے بدرجۂ اولیٰ اس کو یہ چیز حاصل ہوگی۔ صبر ایک ایسی نعمت ہے جو کسی انسان کی ہر محرومی میں اس کا مددگار ہے۔ صبر کسی انسان کے لئے کھونے کو دوبارہ پانا بنا سکتا ہے۔

☆☆☆

Qadir ki Qudrat by Khalid Hussain(Ex.Deputy Commissioner)

address-Jammu,cell-9419183485

خالد حسین (سابق ڈپٹی کمشنر، رہائش جموں)

قادر کی قدرت (خالد حسین کی سوانح "میں زندہ آدمی ہوں" قسط 5)

میں اپنے فن کی بُلندی سے کام لے لوں گا مجھے مقام نہ دو میں مقام لے لوں گا (نا معلوم)

میرا نام ولی محمد بٹ اور تخلص اسیرؔ ہے۔ میں ایک ادیب اور شاعر ہُوں۔ تاریخ بھی میرا من پسند مضمون ہے اور ان موضوعات پر میری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ میں کشمیر ایڈمنسٹریٹیو سروس کا امتحان پاس کر کے سرکاری انتظامیہ میں شامل ہوا تھا اور مجھے اکوئنٹس کیڈر مِلا تھا۔ ملازمت کے ابتدائی دِنوں میں میری پوسٹنگ بحیثیت اکونٹس افسر محکمہ ٹرانسپورٹ میں ہوئی تھی۔ وہاں ایک دِن خالد حسین اپنی سرکاری جِپسی کو رجسٹر کرانے آیا تو بات چیت میں پتہ چلا کہ اُسے ادب سے دلچسپی ہے۔ پھر میری پوسٹنگ ضلع ڈوڈہ میں بحیثیت ضلع خزانہ افسر اور بعدازاں ضلع فنڈ افسر ہوئی جہاں خالد حسین ڈی، آر، ڈی، اے ڈوڈہ کا پروجیکٹ افسر اور پھر اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ ڈوڈہ تعینات رہا۔ ڈوڈہ میں ہم دونوں کو تقریباً چھ سال اکٹھے رہنے کا موقع ملا۔ خالد حسین سے میری قربت دوستی میں بدلی۔ ادب ہمارا بنیادی مرکز تھا۔ خالد حسین افسانہ نگار تھا۔ وہ اکثر اپنی کہانیاں سُناتا۔ ہم نے ایک ادبی تنظیم بنائی اور کئی کُل ہند مشاعرے کروائے۔ جن میں ملک کے نامور شعرا نے شرکت کی۔ ہمارے ضلع ترقیاتی کمشنر اور ضلع مجسٹریٹ محمد اقبال کھانڈے مرحوم بھی ادب نواز تھے اور وہ ادبی پروگرام اور مشاعرے کروانے میں ہماری بھرپور مدد کرتے تھے۔

اُن دِنوں ضلع ڈوڈہ 14 بلاک پر مشتمل تھا اور سات تحصیلیں تھیں۔ ڈوڈہ ضلع کی سرحد ایک جانب ہماچل پردیش کے ضلع چمنبہ، دوسری طرف ضلع کرگل کی تحصیل زنسکار، تیسری طرف ضلع اُدھمپور کے صحت افزا مقام پتنی ٹاپ اور چوتھی طرف پیر پنچال میں جواہر سُرنگ تک تھی۔ مرگن اور سنتھن ٹاپ کی پہاڑیاں بھی کشمیر کے ضلع اننت ناگ سے ملتی تھیں۔ ضلع چمنبہ کی کمشنری پانگی سے دریائے چناب (پُرانا نام چندر بھاگا) پاڈر بلاک میں داخل ہوتا ہے جو ضلع ڈوڈہ کا ہی ایک بلاک ہے۔ ضلع ڈوڈہ کا کُل رقبہ 11800 مربع کلومیٹر تھا جو وادیٔ کشمیر کے رقبہ سے صرف 3 ہزار کلومیٹر کم

تھا۔آج اِس ضلع کے تین اضلاع بن گئے ہیں یعنی ضلع رام بن ،ضلع کشتواڑ اور ضلع ڈوڈہ ۔اپنی پوسٹنگ کے دوران شاید ہی کوئی گاؤں یا پہاڑ ایسا ہو جہاں خالد حسین پیدل نہ گیا ہو۔اُن دِنوں ضلع ڈوڈہ کا بیشتر حصہ سڑکوں کے ساتھ جُڑا ہوانہیں تھا۔اورتقریباً سارے بلاکوں کا سفر پیدل یا گھوڑے پر کیا جاتا۔کشتواڑ سے آگے پاڈر جانے کیلئے تین دِن کا سفر پیدل کرنا پڑتا جبکہ آج کل وہاں پختہ سڑک بن چکی ہے جو پانگی تک جاتی ہے۔اسی طرح بلاک مڑواہ اور بلاک واڑون جانے کیلئے بھی تین دِنوں کا پیدل سفر کرنا پڑتا۔کشتواڑ اورڈُول سے پاڈراور مچیل یاترا کیلئے بھی پیدل مسافت طے کرنا پڑتی۔مچیل سے ایک راستہ کرگل کی تحصیل زنسکار (پدم) کو جاتا ہے اور دوسری طرف لیہہ کو۔اسی طرح ڈوڈہ سے بھاگواہ اور دیسہ کا سفر بھی پیدل تھا۔وہاں سے پیر پنچال کو عبور کر کے ضلع اننت ناگ کا سیاحتی مقام ویری ناگ کا گاؤں کپرن آتا ہے۔ڈوڈہ ضلع کی ایک پہاڑی کا نام ہنس راج ٹاپ ہے، جہاں سے تین اضلاع کی حدیں ملتی ہیں۔ان سب پسماندہ علاقوں کا دورہ خالد حسین نے پیدل یا گھوڑے پر کیااورغریب لوگوں کی دادرسی کی ۔یہاں میں ایک ایسے دردناک سفر کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا اہم کردار خود خالد حسین تھا۔اُس وقت کے نوجوان ضلع ترقیاتی کمشنر محمد اقبال کھانڈے نے بلاک پاڈر جانے کا پروگرام بنایا اور اپنے ساتھ ڈی،آر،ڈی،اے کے پروجیکٹ افسر خالد حسین اور جموں کشمیر بنک کے ڈسٹرکٹ منیجر عبدالرشید تیلی ۔ایس ،ڈی،ایم اور تحصیلدار کشتواڑ کو بھی ہمسفر بنایا تاکہ اُس دُوردراز اور پسماندہ علاقے کے لوگوں کے مسائل موقع پر سُنے جائیں اور اُن کو حل کیا جائے۔

بلاک افسر پاڈر نے مویشی اور خچریں خریدنے کے لئے پچاس کیس تیار کئے تھے۔محکمہ رُورل ڈیولپمنٹ کی طرف سے ان کی خرید کیلئے مالی امداد اور جموں کشمیر بنک نے قرضہ دینا تھا۔خالد حسین اور اور بنک کے اعلیٰ افسر عبدالرشید تیلی نے فیصلہ کیا کہ اٹھولی (پاڈر کا صدر مقام) میں موقع پر ضلع ترقیاتی کمشنر کی موجودگی میں مقامی لوگوں کو مویشی مہیا کئے جائیں۔تین دِن کی پیدل مسافت کے بعد وہ لوگ اٹھولی پہونچے تھے ۔رات آرام کرنے کے بعد دوسرے دن لوگوں کے وفود ضلع ترقیاتی کمشنر سے ملتے رہے اور بلاک افسر اور بنک کا برانچ منیجر کیس منظور کرواکر جانوروں کی خرید کروانے لگے۔اسی اثنا میں کھانڈے صاحب کو وائرلیس پر پیغام ملا کہ وہ فوراً ڈوڈہ پہونچیں کیونکہ اگلے دِن گورنر صاحب تشریف لا رہے ہیں ۔اقبال کھانڈے صاحب اُسی وقت ایس،ڈی،ایم ، تحصیلدار کشتواڑ اور دوسرے عملے کے ساتھ واپس لوٹ گئے جبکہ خالد حسین اور عبدالرشید تیلی وہاں

رُک گئے تا کہ بنک قرضے اور محکمانہ امدادی رقم سے مقامی لوگوں کو جرسی گائے ، خچریں اور چنّو ر اور چنّوریاں (یاک اور گائے کی کراس بریڈ) خرید کر اُنھیں دی جاسکیں۔ کام مکمل کرنے کے بعد خالد حسین ،اُسکا ماتحت سرکاری عملہ اور جموں کشمیر بنک کا ضلع منیجر واپسی کے سفر پر روانہ ہوئے ۔خالد حسین گھوڑے پر سوار تھا جبکہ اُس کا اسسٹنٹ پروجیکٹ افسر ڈاکٹر ریاض عنایت اللہ بھی گھوڑے پر سوار تھا۔ضلع بنک افسر عبدالرشید تیلی نے ضِد کی کہ وہ بھی گھوڑے پر بیٹھے گا۔خالد کے منع کرنے کے باوجود وہ نہ مانا۔

لہٰذا اُسکے لئے بھی ایک گھوڑا منگوایا گیا۔کشتواڑ بلاک کا انسپکٹر دُھونی چند، تین گرام سیوک اور چپڑاسی رات کو ٹھہرنے اور کھانے کا بندوبست کرنے کیلئے علی الصبح شاشو کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس کیلئے نکل پڑے تھے۔اور اب صرف خالد حسین۔عبدالرشید تیلی اور ڈاکٹر ریاض ہمسفر تھے۔عبدالرشید تیلی اناڑی گھوڑ سوار تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ گھوڑا عقل مند جانور ہوتا ہے اور وہ اپنے سوار کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ جنگل میں پگڈنڈی پر چلتے چلتے ایک پہاڑی کا کونا دیکھ کر عبدالرشید تیلی سمجھا کہ اُس کا سر پہاڑی کے کنارے سے نہ ٹکرا جائے۔ چنانچہ اُس نے اپنے بچاؤ کیلئے کنارے کو ہاتھ سے روکا۔جسکی وجہ سے گھوڑا توازن کھو بیٹھا اور عبدالرشید کا پاؤں رکاب میں پھنس گیا۔رکاب سے پاؤں نکالنے کے لئے اُس نے پاؤں کو جھٹکے دیئے۔اس عمل سے گھوڑا اپنے سوار سمیت گر پڑا اور پگڈنڈی سے نیچے لُڑھک گیا۔رکاب میں پاؤں پھنسنے کی وجہ سے گھوڑے نے سوار کو بھی گھسیٹ لیا۔یوں گھوڑا اور عبدالرشید تیلی لُڑھکتے لُڑھکتے تقریباً 600 فٹ نیچے دریائے چناب کے پاس پہونچ گئے۔یہ منظر دیکھ کر خالد حسین اور ڈاکٹر ریاض گھوڑوں سے اُترے اور پہاڑی کی ڈھلان کی طرف چھلانگیں ماردیں۔اُن کے کپڑے کانٹوں سے پھٹ گئے۔دونوں عبدالرشید تیلی کے پاس پہونچ گئے جو درد سے کراہ رہا تھا۔گھوڑا مر چکا تھا۔خالد حسین نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو پتہ چلا کہ عبدالرشید تیلی کے بازو کی ہڈی چکنا چُور ہو چکی تھی۔کمر کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔اُس نے پانی مانگا۔

ڈاکٹر ریاض مُردہ گھوڑے کی کاٹھی کھولنے لگا تا کہ کمبل نکالا جاسکے۔خالد حسین دوڑ کر چناب دریا کے کنارے پر گیا اور ہاتھوں میں پانی بھر کر لانے لگا لیکن پانی رشید تیلی تک نہ پہونچ پاتا اور ضائع ہو جاتا۔خالد حسین کو ایک مردہ جانور کی کھوپڑی ملی۔اُسے دھو کر اُس نے پانی بھرا اور عبدالرشید کو پلایا۔پھر خالد اور ریاض نے کمبل میں رشید تیلی کو ڈالا اور پہاڑی چڑھنے لگے۔کسی غیبی طاقت نے اُنھیں اِتنی ہمت دی کہ وہ اُسے پگڈنڈی پر لے آئے۔اُس نے پھر پانی

مانگااور ڈاکٹر ریاض پانی تلاش کرنے کے لئے دوڑا۔اس دوران عبدالرشید تیلی نے پیشاب کرنے کیلئے کہا۔خالد نے اُسکی زِپ کھولی اور پیشاب کرایا۔اُس کے چہرے کا رنگ زرد ہوچُکا تھا۔اُس نے خالدحسین کی طرف دیکھااوردم توڑ دیا۔ڈاکٹر ریاض صاحب جب پانی لے کرآیا تو عبدالرشید تیلی کی لاش دیکھ کرزاروقطار رونے لگا۔خالدحسین نے اُسے دلاسہ دیااور سمجھایا کہ یہ رونے کا وقت نہیں ہے بلکہ لاش کوواپس اٹھولی لے جانے کیلئے انتظام کرنے کا وقت ہے کیونکہ دوتین گھنٹے بعدسورج غروب ہوجائے گا اوررات کے اندھیرے میں لاش کو لے جانا بہت مشکل ہوگا۔خالدحسین نے ڈاکٹر ریاض کوعبدالرشید تیلی کے جسدِ خاکی کے پاس بٹھایااورخود شاشو کی طرف چل پڑا جوحادثہ کی جگہ سے تقریباً دس کلومیٹر دُور تھا تا کہ انسپکٹر دُھونی چند اورگرام سیوکوں کوواپس لایا جائے اورلاش کواٹھولی لے جانے کا بندوبست کیا جاسکے۔شاشو پہنچ کرجب خالدحسین نے سارا ماجرا بیان کیا تو وہ سبھی رونے لگے۔پھروہ سب واپس حادثے والی جگہ کی طرف چل پڑے۔رات کے دس بج چکے تھے۔دُھونی چند اکیلا مشعل جلا کر اٹھولی کی طرف نکل گیااورموضع کجائی اور پڈیرنا سے کچھ لوگوں کو لے کرآیا۔اُن کے ساتھ ایک چارپائی اوررسّی تھی۔عبدالرشید تیلی کی لاش کو چارپائی پرلٹایا گیا اور چارپائی کورسّیوں سے باندھا گیا۔کیونکہ راستہ تنگ ہونے کی وجہ سے کئی بار چارپائی کو ٹیڑھا کرنا پڑتا تھا۔لاش کو لے کرسبھی وہاں سے روانہ ہوئے اوررات دوبجے جب اٹھولی پہونچے تو ساری بستی جاگ رہی تھی اورلوگ جوق درجوق ڈاک بنگلے میں آنے لگے۔سبھی رورہے تھے۔خاص کرعورتیں بین کررہی تھیں۔

صبح تک آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ آنے لگے۔خاص کر کجائی اور پڈیرنا سے۔کسی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ گذرے کل عبدالرشید تیلی لوگوں میں قرضے کی رقم بانٹ رہا تھااور آج اُسکی لاش اُنکے سامنے پڑی تھی۔خالدحسین نے اپنے ڈپٹی کمشنرمحمداقبال کھانڈے کووائرلیس کے ذریعے اس حادثے کی اطلاع دی اور ہیلی کاپٹر بھیجنے کی گذارش کی تا کہ لاش کوسری نگر لے جایا جاسکے اورلواحقین کے حوالے کیا جاسکے۔دِن کے دوبجے ملٹری کا ہیلی کاپٹراٹھولی پہونچا۔پائلٹ نے لاش کوہیلی کاپٹر میں رکھوایااورخالدحسین کوساتھ لے کرسری نگر کے لئے روانہ ہوگیا جہاں اُس نے بادامی باغ آرمی کنٹونمینٹ کے ہیلی پیڈ پرلینڈ کیا۔عبدالرشید تیلی کے جسدِخاکی کو لینے کیلئے اُس کے اہلِ خانہ آئے تھے جن میں اُس کا ماموں عبدالصمد تیلی بھی تھا جواُس وقت نیشنل کانفرنس کا صوبائی صدر تھا۔عبدالرشید تیلی کی میّت کواُس کے آبائی قبرستان دُرگجن میں دفنایا گیا۔خالدحسین جنازے میں شامل

ہوا۔قبر پر مٹی ڈالی اور دُعائے مغفرت پڑھ کر واپس ڈوڈہ آ گیا۔

بٹوت سے ڈوڈہ جاتے ہوئے عسّر بلاک کے دو گاؤں بگھر اور عسّر آتے ہیں۔اِن دیہات کے بالکل سامنے والی پہاڑی پر''ٹاپ نیل'' کا گاؤں ہے۔ وہاں جانے کیلئے دریائے چناب پر بنے رسّیوں کے پُل کو عبور کرنا پڑتا ہے۔''ٹاپ نیل'' میں عسّر بلاک کی طرف سے ہائی سکول کی عمارت بن رہی تھی ۔ گاؤں کے کچھ لوگ خالد حسین کے دفتر آئے اور شکایت کرنے لگے کہ ٹھیکیدار مقامی گرام سیوک کے ساتھ مل کر گھٹیا میٹریل استعمال کر رہا ہے۔اُس نے سیمنٹ بیچ دیا ہے اور چھت پر ڈالنے کیلئے لوہے کی چادریں (سی ، جی ، آئی شیٹ) بھی فروخت کر دی ہیں۔خالد حسین نے خود موقع ملاحظہ کرنے کا فیصلہ لیا۔اُس نے بلاک ڈیولپمنٹ افسر عسّر ، جونیئر انجینئر اور گرام سیوک کو ساتھ لیا اور فجر کی نماز کے بعد چلنا شروع کیا۔بگھر کی سڑک سے ٹاپ نیل بڑا نزدیک دِکھائی دیتا ہے۔لیکن جب اُنہوں نے بگھر سے ٹاپ نیل کا سفر شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ لوہے کے چنے چبانے والا معاملہ ہے۔تین گھنٹے سے زیادہ تو بگھر سے چناب دریا پر بنے رسّیوں کے پُل تک پہونچنے میں لگے حالانکہ خالد حسین ، بی ، ڈی ، او اور انجینئر گھوڑوں پر سوار تھے ۔ وہاں اُن کے لئے ناشتے کا انتظام کیا گیا تھا۔

برف باری کی وجہ سے راستے میں بہت زیادہ پھسلن تھی اور گھوڑے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پا رہے تھے ، چڑھائی بھی خطرناک تھی ۔انجینئر غلام حسین سلہریا اور گرام سیوک کیشو رام ٹھاکر نے مشورہ دیا کہ گھوڑوں سے اُتر ا جائے ۔ ورنہ کوئی بھی حادثہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اب سبھی پیدل چلنے لگے۔ پگڈنڈی کا راستہ اتنا دشوار گذار تھا کہ کئی جگہ ہاتھوں سے برف صاف کر کے پتھر یا درخت کو سہارے کے لئے پکڑا جاتا۔ جب یہ قافلہ ٹاپ نیل پہونچا تو اُس وقت رات کے آٹھ بج چکے تھے ۔ ہمارے ٹھہرنے کا انتظام سرپنچ کے گھر کیا گیا تھا۔تھکاوٹ سے سب نڈھال ہو چکے تھے۔ سرپنچ کے بیٹوں نے گرم پانی میں نمک ڈال کر اُن کے پاؤں دُھلائے ۔ رات کا کھانا کھا کر خالد حسین ، اُسکے لئے تیار کئے گئے کمرے میں چلا گیا اور سو گیا صبح جب وہ اُٹھا تو ناشتہ تیار تھا اور گاؤں کے لوگ سرپنچ کے صحن میں بیٹھے تھے تاکہ اے ، سی ، ڈی ڈوڈہ خالد حسین کو دیکھ سکیں اور اپنے مطالبے پیش کر سکیں۔ پھر وہ سکول کی زیرِ تعمیر بلڈنگ دیکھنے چلا گیا جو وہاں سے تقریباً ایک کلومیٹر دور تھی۔سکول کی عمارت پر ٹین کی چادروں کا چھت پڑ چکا تھا۔صرف اندر پلستر کا کام چل رہا تھا۔گاؤں والے ٹھیکیدار کی تعریف کر رہے تھے ۔ دراصل شکایت کُنندہ اور اُسکے ساتھیوں کو اس بات کی تکلیف تھی کہ اُن کو کام

نہیں ملا تھا۔اس قسم کی شکایات اُن علاقوں میں عام ہوتی ہیں۔وہاں خالد حسین کو ایک بوڑھا براہمن ملا۔ پورے گاؤں میں صرف وہی ہندو تھا جو اپنے افرادخانہ کے ساتھ وہاں رہتا تھا۔باقی کا سارا گاؤں مُسلم آبادی پر مشتمل تھا۔پوچھنے پر بوڑھے پنڈت نے بتایا کہ یہاں کی ساری آبادی کے پُرکھے ہندو تھے اور یہ سب اُن کی اولاد ہیں۔صرف میرا خاندان اپنے دھرم پر قائم رہا۔اُس بوڑھے پنڈت نے مانگ کی کہ گاؤں کے واحد پُرانے مندر کی مرمت کرائی جائے اور اُس سے ملحقہ میدان میں شردھالوؤں/ زائرین کے ٹھہرنے کیلئے سرائے بنا کردی جائے تا کہ سالانہ میلے پر یاتریوں کے رہنے کا انتظام ہوسکے۔خالد حسین بلاک افسر کو ساتھ لیکر موقع پر گیا تو اُس نے دیکھا کہ پانی کا ایک قدرتی جھرنا بہہ رہا ہے اور اُس جھرنے کے اندر چھوٹا سا انتہائی خوبصورت مندر بنا ہے جس میں شری رام، سیتا اور لچھمن کی چھوٹی چھوٹی مورتیاں رکھی گئی ہیں۔

بوڑھے براہمن کا کہنا تھا کہ مندر کو بڑا کیا جائے لیکن خالد حسین نے اُسے سمجھایا کہ یہ مندر یقیناً اُن کے بزرگوں نے بنایا ہوگا۔اس لئے مندر کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ بلکہ پُرانے زمانے کی نشانی سمجھ کر اسکی حفاظت کی جائے۔البتہ ساتھ ملتے میدان میں زائرین کے لئے ایک بڑی سرائے بنائی جائے گی اور ایک خوبصورت باغ بھی بنایا جائے گا تا کہ دھارمک میلے میں آنے والے یاتری لُطف اندوز ہوسکیں۔ بوڑھا براہمن بہت خوش ہوا۔ پھر وہ خالد حسین کو تقریباً ایک کلومیٹر دُور ایک ایسی جگہ پر لے گیا جہاں پتھر سے تراشا ہوا ایک گھوڑا کھڑا تھا جو ہاتھ لگانے سے ہلتا تھا۔بوڑھے براہمن نے بتایا کہ اس گھوڑے کا چمتکار یہ ہے کہ اس پر بیٹھنے سے یہ ہلتا نہیں بلکہ ساکن رہتا ہے۔جب خالد حسین اُس پر بیٹھا تو وہ مضبوط کھڑا تھا اور اُس کا ہلنا بند ہوگیا تھا۔بی،ڈی ،او الطاف حسین بابا نے کیمرے سے تصویریں کھینچیں جن میں خالد حسین گھوڑے پر سوار ہے۔بعدازاں خالد حسین نے خود مجھے یہ تصاویر دکھائی تھیں۔گاؤں میں اُس وقت تقریباً اڑھائی،تین سو افراد رہتے تھے۔وہ کشمیری اور سراجی بولیاں بولتے تھے۔رام بن،رام سُو سے لے کر ڈوڈہ ، بھاگواہ اور کاستی گڑھ وغیرہ سارا علاقہ مقامی بولی سراجی ہی بولتا ہے یا پھر کشمیری۔کشتواڑ سے لے کر رام بن تک چناب دریا کے دونوں اطراف کے علاقے کو سراج بھی کہا جاتا ہے۔خالد حسین نے پتھروں کو تراش کر بنائے گئے اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے گھوڑے گُول کے علاقے میں بھی دیکھے تھے۔گھوڑا گلی نام کے اس علاقے میں جو بھی افسر دورے پر جاتا تو وہ وہاں سے ایک آدھ گھوڑا اپنا ڈرائنگ روم سجانے کیلئے لے آتا۔لیکن اب مقامی لوگ کسی کو بھی

پتھر کے یہ گھوڑے لے جانے نہیں دیتے۔ اپنے اجداد کی یہ نشانیاں وہ اب سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اِن پہاڑی علاقوں میں پانی کے چشموں پر بنے سنگ تراشی کے کئی خوبصورت نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں ۔جنکو دیکھ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ پُرانے زمانے میں لوگ اِن دشوار گذار علاقوں میں کس طرح سنگ تراشی کرتے تھے۔

یہ شاید 15 اگست 1992ء کی بات ہے جب میں اور خالد حسین دیگر ضلع افسران کے ساتھ یومِ آزادی کی پریڈ میں شمولیت کے بعد ڈپٹی کمشنر عبدالرشید پرے کی طرف سے دیئے گئے ظہرانے میں شرکت کرنے کیلئے اُن کی سرکاری رہائش پر تھے کہ اُسی وقت ایس، ایس، پی اشوک گپتا اور ڈی، آئی، جی انوپ سنگھ کو ڈی، ایس، پی بھدرواہ کا وائرلیس پیغام ملا کر سرتھل کے جنگل میں پولیس نے ملی ٹینٹوں کو گھیر لیا ہے اور جلد ہی اُن کا صفایا کر دیا جائے گا۔ ڈوڈہ ضلع کے سپرانٹنڈنٹ پولیس شری اشوک کمار گپتا نے فوری طور پر بھدرواہ جانے کا فیصلہ کیا تا کہ سرتھل میں پولیس فورس کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ اُنہوں نے اپنی سرکاری جیپسی کے بدلے خالد حسین کی جیپسی میں جانے کو ترجیح دی۔ خالد حسین نے اپنے ڈرائیور کلبھوشن سنگھ کو حکم دیا کہ وہ ایس، ایس، پی صاحب کے ساتھ بھدرواہ جائے اور اُن کے ساتھ ڈیوٹی دے جب تک کہ وہ واپس نہیں آجاتے۔ اشوک گپتا صاحب بھدرواہ سے سیدھا سرتھل چلے گئے اُن کی دیکھا دیکھی اُدھمپور۔ ڈوڈہ رینج کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس انوپ سنگھ جی کی جیپ بھی جب وہاں پہونچی تو ملی ٹینٹوں نے ہتھ گولے پھینکے۔ جس کی وجہ سے انوپ سنگھ جی زخمی ہوگئے ۔ڈرائیور اور دو سپاہی بھی زخمی ہوئے جبکہ جیپ کے پرخچے اُڑ گئے۔ اُدھر سرتھل کے جنگل میں ملی ٹینٹوں نے پولیس کا گھیرا توڑ کر پولیس کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور پولیس کے آٹھ سپاہی شہید ہو گئے جبکہ S.S.P اشوک گپتا کو ایک گولی گردن میں لگی اور اُنھیں ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر جموں کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ وہ گولی آج بھی اشوک گپتا جی کی گردن میں پھنسی ہے۔ ڈاکٹروں نے گولی کو اسلئے نہیں نکالا کہ اُس سے اُنھیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

پولیس کے سپاہیوں کی جانیں تلف ہونے کی وجہ سے بھدرواہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُس وقت کے ضلعی صدر دیا کرشن کوتوال نے ہڑتال کی کال دی تھی۔ خالد حسین کا ڈرائیور بھی ہڑتال کی وجہ سے بھدرواہ میں پھنس گیا تھا۔ مقامی مسلمانوں اور ہندوؤں میں تلخی بڑھتی جا رہی تھی اور کئی بار ایک دوسرے کے گھروں اور دُکانوں پر حملے ہو رہے تھے۔ حالات بہت کشیدہ تھے۔ آخر ضلع انتظامیہ نے کرفیو لگا دیا۔ اُسی بیچ ڈپٹی کمشنر نے خالد حسین کو مرحوم دیا کرشن کوتوال (جو بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی

کے ریاستی صدر بنے) سے ملنے اور حالات بہتر بنانے میں اُن کی مدد لینے کے لئے کہا۔اُدرانا (گاٹھا) میں اُن کے گھر پر ملاقات ہوئی۔اُس کے بعد جامع مسجد بھدرواہ میں مُسلم نمائندوں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ بات واضح طور پر اُبھری کہ سبھی امن چاہتے ہیں۔دودِن کی بات چیت کے بعد کرفیو اُٹھالیا گیااور خالدحسین اپنے ڈرائیور کلبھوشن کے ساتھ واپس ڈوڈہ آ گیا۔

جن دِنوں خالدحسین پونچھ ضلع میں اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ تعینات تھا۔اُن دِنوں وہاں بھی مِلی ٹینسی عروج پر تھی۔پونچھ ضلع تین اطراف سے پاکستانی انتظام والے کشمیر سے گھِرا ہوا ہے۔آزادی سے پہلے پونچھ جاگیر کی چار تحصیلیں تھیں جن میں اب ہمارے پاس صرف ڈیڑھ تحصیل ہے جبکہ اڑھائی تحصیلیں پاکستانی انتظامیہ کشمیر میں شامل ہیں۔یعنی تحصیل مینڈھراور تحصیل حویلی کے 83 گاؤں۔پونچھ پہاڑوں اور جنگلات سے بھرا علاقہ ہے۔مِلی ٹینٹ سرحد عبور کرنے کیلئے کپواڑہ کے علاوہ یہ راستے بھی استعمال کرتے تھے،اور ان راستوں سے ہی کشمیر میں اپنی کاروائیاں کرتے تھے۔ حالات بہت خراب تھے۔پولیس،سیکورٹی فورس اورفوج کے ساتھ اُن کے مقابلےتقریباًروز ہوتے رہے۔سرکار نے ضلع پونچھ اور ضلع راجوری کیلئے ایک خصوصی کمشنر شری سُدھرسنگھ بلوریہ کوتعینات کیا گیا۔پونچھ میں اُس وقت ڈپٹی کمشنر پی،دھرچکروتی اور پولیس سربراہ پتمبرلال گپتا تھے۔ڈپٹی کمشنر پونچھ اورراجوری دونوں سپیشل کمشنر بلوریہ صاحب کے ماتحت تھےاوراُنھیں ہی جواب دہ تھے۔ مِلی ٹینسی کے اُس ماحول میں خالدحسین پونچھ کے بلاکوں،پنچایتوں اوردیہاتوں کے دورے کرتا اور بے روزگار نوجوانوں کو بلاک کے چھوٹے چھوٹے کام دیتا۔اُسے دوست احباب مشورہ دیتے کہ وہ اکیلے دُوردُراز علاقوں میں نہ جایا کرے۔لیکن خالدحسین کا جواب ہوتا کہ جوگولی اُس کے لئے بنی ہے وہ اُسے ضرور لگے گی اور جونہیں بنی،وہ اُسے کبھی نہیں لگ سکتی۔باقی زندگی اورموت اللہ کے ہاتھ ہے۔بچوں کومِلی ٹینٹوں کی صفوں میں جانے سے روکنے کے لئے خالدحسین نے ڈپٹی کمشنر پی، دھرچکروتی کوصلاح دی کہ ''پونچھ میلہ'' کے عنوان سے بلاک اورضلعی سطح پر کھیل کُوداور کلچرل پروگرام کرایا جائے۔سب سے پہلے پنچایت کی سطح پر کھیلوں کے مقابلےکرائے جائیں۔

فاتح ٹیموں کا مقابلہ بلاک کی سطح پرکرایا جائے اور پھر بلاک لیول پر کامیاب ہونے والی ٹیموں کا مقابلہ ضلع کی سطح پرکرایا جائے۔اس طرح نوجوانوں کا ذہن کھیلوں اورتمدنی پروگرام میں لگا رہے گااوروہ بنیاد پرستی سے بچے رہیں گے۔چکرورتی کو خالدحسین کا مشورہ بہت پسند آیا۔اُنہوں نے سپیشل کمشنر سُدھرسنگھ بلوریا صاحب سے بات کی۔وہ بھی اس پر پوزل سے خوش ہوئے۔اس

بڑے پروگرام کیلئے سرکار نے فنڈ مہیا کرادیئے ۔چکرورتی صاحب نے خالد حسین کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی جس میں خوش دیو مینی بھی ایک ممبر تھا جو اُردو، پنجابی اور پوٹھواری کا ایک مشہور ادیب اور شاعر ہے۔دونوں نے مل کر مختلف پروگرام تیار کیئے۔کھیلوں کے آخری مقابلے پونچھ میں کروانے کے علاوہ مشاعرے اور سنگیت کے رنگارنگ پروگرام ضلعی سطح پر منعقد کرانے کا فیصلہ لیا گیا اور نارتھ زون کلچرل سنٹر پٹیالہ کے ڈائریکٹر کو چٹھی لکھ کر پنجاب کے آرٹسٹوں کو پروگرام میں شرکت کرنے کیلئے کہا گیا۔''پونچھ میلہ'' دودِن تک کرایا گیا۔کبڈی، والی بال، فُٹ بال اور کرکٹ کے مقابلے ہوئے ۔پورن چندوڈالی اور پیارے لال وڈالی، بھائیوں کو بُلایا گیا۔اُنھوں نے اپنے پنجابی گیتوں سے میلہ لوٹ لیا۔سرُدول سکندر اور اُسکی پارٹی نے پونچھ کے لوگوں کا دِل جیت لیا۔پنجاب کی لڑکیوں نے گِدا ڈالا اور مقامی لڑکوں کے بھنگڑا ناچ سے لوگ خُوب محظوظ ہوئے۔پونچھ میلہ بہت کامیاب رہا۔ اسکے علاوہ خالد حسین نے دہلی کی مشہور قوالن چنچل بھارتی کو پونچھ میں آنے کی دعوت دی۔اُس نے پونچھ کے میونسپل ہال میں قوالیوں کا زبردست پروگرام پیش کیا اور مقامی لوگ کئی دِنوں تک سنگیت کی مستی میں ڈُوبے رہے۔ملی ٹینسی کے باوجود سُدھر سنگھ بلوریا صاحب (آئی،اے،ایس) نے لورن سے کُچھ دُور نندی شُول آبشار پر جانے کا پروگرام بنایا۔

چکرورتی صاحب، ایس،ایس، پی پیتمبر لال گپتا اور خالد حسین اِس دورے میں بلوریا صاحب کے ہم سفر تھے۔نندی شُول لورن کے موضع سُلطان پتھری سے چھ کلومیٹر دُور ہے۔اس آبشار کا پانی دراصل پیر پنچال پہاڑی درے سے ایک گلیشیئر پر گرتا ہے۔جس کی وجہ سے گلیشئر میں ایک بہت بڑا سوراخ ہو گیا ہے۔اور تقریباً 150 فٹ گہرا کنواں بن گیا ہے۔آبشار کا پانی اِس کنویں میں گرنے سے قوس قزح بن جاتی ہے۔یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔پہاڑی کے دوسری طرف ضلع بڈگام کا توش میدان کا علاقہ ہے۔بلوریا صاحب کے حکم پر خالد حسین نے مقامی بلاک افسر کو وہاں سیاحوں کیلئے ٹورسٹ ہٹ بنانے کیلئے کہا۔اسی طرح ایک بار پھر بلوریا صاحب نے مغل روڈ پر پونچھ ضلع کے آخری گاؤں ''پوشانہ'' جانے کا پروگرام بنایا۔خالد حسین کے علاوہ کئی دیگر ضلعی افسر بھی اس سفر میں اُن کے ساتھ تھے۔مغل روڈ جھنگڑ،نوشہرہ، راجوری، تھنہ منڈی، ڈیرا گلی، بہرام گلا،نُوری چھم، چندی مڑھ ،ڈوگریاں اور پوشانہ سے ہوتی ہوئی پیر کی گلی تک جاتی ہے اور کشمیر کے ضلع شوپیاں سے جاملتی ہے۔ اُن دِنوں پیدل سفر ہوا کرتا تھا۔جب کہ آجکل موٹر والی سڑک بن چکی ہے۔اس سڑک پر جگہ جگہ مغل سرائے بنی ہیں۔نُوری چھم کی آبشار ملکہ نُور جہاں سے منسوب ہے۔اِس آبشار میں ملکہ نُور جہاں

نہایا کرتی تھی اور ایک قدِ آور شیشہ بھی پہاڑی کو تراش کر فکس کیا گیا تھا جسے خالد حسین نے 1990ء میں خود دیکھا تھا لیکن اب وہ شیشہ وہاں نہیں ہے۔ البتہ نشان باقی ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کی وفات بھی اسی مغل روڈ پر پیرگلی کے پاس ہوئی تھی۔ اس خبر کو پوشیدہ رکھنے کے لئے شاہی طبیب نے جہانگیر کا پیٹ چاک کیا اور ساری گندگی باہر پھینک دی۔ انتڑیوں اور اُوجھری کو چنگس کی سرائے میں دفن کر دیا۔ پیر کی قبر سمجھ کر لوگ وہاں منّت مانتے ہیں اور نذر نیاز دیتے ہیں۔ اُنھیں کون بتائے یہاں انتڑیاں دفن ہیں۔ انتڑیوں کو تُرکی زبان میں چنگس کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس موضع کا نام بھی چنگس ہے۔ خالد حسین کا کہنا تھا کہ مغلوں کی بنائی ہوئی سرائیوں میں پہلے مغل رہا کرتے تھے۔ پھر پٹھان، پھر سکھ اور پھر ڈوگرہ سپاہی۔ اور آجکل یہ سرائیں بھارتی فوج کے استعمال میں ہیں۔ مغل روڈ کا علاقہ انتہائی خوبصورت ہے۔ آب و ہوا کے لحاظ سے، چراگاہوں کے لحاظ سے اور سرسبز میدانوں کی وجہ سے۔ پونچھ اور راجوری کے لوگوں کے لئے کشمیر جانے کا یہ مختصر ترین راستہ ہے لیکن صرف چھ مہینوں کیلئے کھُلا رہتا ہے۔ اگر پوشانہ سے ڈُگجن (ڈُگجی) تک ٹنل بن جائے تو یہ راستہ پورا سال کھُلا رہ سکتا ہے اور بانہال کارٹ روڈ پر ٹریفک کا دباؤ کم ہو سکتا ہے۔ پوشانہ کے لوگ کشمیری اور پہاڑی (پوٹھوہاری) زبانیں بولتے ہیں۔

سرکار کی طرف سے راشن، تیل خاکی اور دیگر سہولتیں اِن لوگوں کو میسر ہیں لیکن لگ بھگ یہاں کی ساری آبادی صرف تین مہینے یہاں گذارتی ہے باقی نو مہینے یہ تھنہ منڈی میں رہتے ہیں جہاں ان لوگوں نے پُختہ مکانات تعمیر کئے ہیں۔ نوری چھم سے دائیں طرف ایک پیدل راستہ پیر پنچال کے سلسلہ کوہ میں واقع اٹھارہ جھیلوں کی طرف جاتا ہے۔ جو اپنے شفاف پانی اور چراگاہوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ یہ جھیلیں راجوری کے درہال کی چوٹی سے آنے والے راستے میں بھی پڑتی ہیں۔ اگر اِن جھیلوں تک سرکار موٹر سڑکیں بنا دے تو جموں خطے میں یہ اہم سیاحتی مرکز بن سکتا ہے۔ یا ہیلی کاپٹر سروس شروع کرے تو سیاح یہاں آ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اب تک تو صرف گوجر بکروال اور گدی ہی اِن جھیلوں اور ملحقہ چراگاہوں کا لُطف اُٹھاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے مویشی، بھیڑ بکریاں اور گھوڑے لیکر یہاں گرمیوں کا موسم گذارتے ہیں۔ اِن جھیلوں کے کُچھ نام اس طرح ہیں۔ نندن سر، کٹوری سر، چندن سر، اکال دچھنی، بھاگ سر، سمور سر، دیپا سر اور کوثر سر۔ (کوثر ناگ) کوثر سر جانے کیلئے ایک راستہ شوپیاں سے بھی جاتا ہے۔ خالد حسین نے اس طرح کے کئی ایڈوینچرز کئے تھے اور کئی بار تو وہ موت کے مونہہ سے بچ کر نکلا تھا۔ دو بار تو وہ دچھن، مڑھوا اور واڑون پیدل گیا اور مرگن

کا پہاڑ عبور کر کے اننت ناگ کے آخری گاؤں لہنون کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔اسی طرح دوبارہ وہ چھاترو سے مغل میدان اور سنتھن ٹاپ کو پار کرتا ہواڈُکسم اور لگر ناگ گیا۔ان پسماندہ علاقوں میں جانے سے خالد حسین کو لوگوں کی غربت کا اندازہ ہوا۔اُن کے مسائل سمجھنے اور اُن کو حل کرنے کا موقع ملا۔خالد حسین کی کئی کہانیوں کے پلاٹ انہی علاقوں سے منسوب تھے۔ان علاقوں میں جا کر خالد حسین کے اندر کا ادیب نئے اور ان چھوئے موضوع تلاش کرتا تھا ہم دونوں نے مل کر ڈوڈہ اور جموں میں کئی ادبی پروگرام کئے۔جن کا ذکر میں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔اُس زندہ دِل انسان کو اللہ تعالیٰ جنت الفردوس عطا کرے۔آمین۔

اِس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اِک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص ہمیشہ یاد رہا
(نوشی گیلانی)

☆☆☆

Usloob:Tareef,Tauzih by Prof.Aftab Ahmad Afaqi (Head,Dept. of Urdu
Banaras Hindu University,Varanasi)cell-9450527733
پروفیسر آفتاب احمد آفاقی (صدر، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

اسلوب: تعریف، توضیح

''اسلوب'' یا طرز نگارش کی کوئی حتمی تعریف ہنوز موجود نہیں، تاہم ادب میں اسلوب سے مراد فن کار کے طرز تحریر کی انفرادیت یا الفاظ اور جملوں کو فنی اعتبار سے برتنے کے سلیقے سے ہے۔

لفظ اسلوب انگریزی لفظ کے Style کا مترادف ہے۔ یونانی لفظ اسٹائلوز (Stylo's) اور لاطینی میں اسٹائیلس (Stylus) اسلوب کے ہم معنی ہیں۔ ہندی میں اسلوب کو شیلی (शैली) کہا جاتا ہے۔ مختلف لغات میں اسلوب کی مندرجہ ذیل تعریفیں ملتی ہیں: نور اللغات کے مطابق اسلوب (ع۔ بالفتح) مذکر، راہ، صورت، طور، طرز، روش، طریقہ، اسلوب، بندھنا، لازم صورت پیدا ہونا، راہ نکلنا۔ خاتمہ کلام پر شوق کا یہ شعر درج ہے ؎

پہنچا جس وقت سے مکتب زندگی کا بندھا کچھ اسلوب

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مطابق: لکھنے کا طریقہ، کسی ادبی شخصیت، ادبی گروہ یا دور کا اپنا منفرد طریق اظہار، مصنف کا تخلیقی ضابطہ جس میں توضیح، قوتِ تاثیر اور حسن وغیرہ اجزا موجود ہوں۔

کیسلر انگلش ڈکشنری میں اسلوب کے معنی یہ درج ہیں:

''۔۔۔۔طرز تحریر، اظہارِ خیالات، بولنا، برتاؤ کرنا وغیرہ۔ معاملہ جس کا اظہار عمل میں آچکا ہو، قسم اندا، طریقہ، خاصیت، ادبی تحریر کی عمومی خصوصیت، فن کارانہ اظہار، اندازِ زیبائش، کسی خاص شخص، عمر، مکتب اور شخصیت کو متمائز کرنا، زبان میں خیالات کا ٹھیک ٹھیک اظہار۔۔۔۔''

ان تعریفوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب میں فن کارانہ اظہار، منفرد طریق اظہار اور تخلیقی ضابطہ و توضیح جیسے عنصر موجود ہوتے ہیں تاہم اس کے ساتھ قوتِ اظہار اور پیرایۂ بیان کی ندرت اور انفرادیت بھی، جب تک شامل نہ ہو اسلوب کی تعریف مکمل نہیں ہوتی۔ ایک مغربی نقاد کے نزدیک بہترین یہ ہو سکتی ہے ''وہ خاص تحریر جس میں ایک آدمی اپنے خیالات، زبان کے ذریعے ادا کرتا ہے۔ یہ محض زبان اور الفاظ کے استعمال سے مختلف ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جو الفاظ اس نے

استعمال کیے ہیں وہ مناسب ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا انداز خشک، ناقص اور سخت یا موثر قسم کا ہو۔ اسٹائل دراصل ایک مصنف کے دماغی غور و فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اپنی ظاہری شکل میں اسلوب ’جملوں کی ساخت، اور ان کی رنگارنگی، الفاظ کا انتخاب و ترتیب، ارکانِ تہجی کی تعداد و ترکیب، تشبیہ و استعارات اور پسندیدہ تصورات کا استعمال، خیالات کا معنی خیز تلاطم اور لسانی صفت گری سے عبارت ہے۔‘‘ ا؎

امیر اللہ خاں شاہین کے لفظوں میں:

"اسلوب نام ہے اس آواز کا جس کی صورت گری ان علامتوں سے ہوتی ہے جو لفظوں کی شکل اختیار کر کے ایک مفہوم ادا کرتی ہیں۔ ان لفظوں سے جملے اور عبارتیں اور ان سے زبان وجود میں آتی ہے۔ شاعری میں آواز آہنگ سے اور نثر میں یہی اسلوب سے عبارت ہے۔‘‘ ۲؎

ادبی تخلیق نام ہے ’’مواد اور اسلوب‘‘ کی مکمل وحدت کا۔ موضوع کے انتخاب اور تعین سے لے کر الفاظ کو جملوں کے قالب میں ڈھالنے تک کے مرحلے میں فن کار جس طرح زبان سے کام لیتا ہے اور اپنے تخلیقی جوہر کو نمایاں کرتا ہے یہی دراصل ’اسلوب‘ ہے۔ بہ الفاظ دیگر اسلوب فن کار کی فنی اور تخلیقی استطاعت کا نام ہے جس کی بنیاد پر کوئی فن پارہ قاری کو متاثر و متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی نثری یا شعری تخلیق میں تخلیق کار کی شخصیت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ گرچہ یہ عمل بہت کچھ لاشعور کے تابع ہے مگر اس کی اسی انداز میں کارفرمائی تخلیق فن کو انفرادی عمل بناتی ہے۔ ڈاکٹر بوفان (Buffan) نے اسلوب اور انسانوں کے رشتے کو سب سے پہلے محسوس کیا تھا، وہ لکھتا ہے:

"STYLE IN MAN"

یعنی ’’اسلوب خود ایک انسان ہے‘‘ اس تعریف سے بوفان کا مطلب یہ تھا کہ مصنف کی شخصیت اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کے ساتھ الفاظ میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مزید برآں بوفان انسانی خصائل و سیرت کے نقوش بھی اسلوب میں تلاش کرتا ہے۔ اور یہ اصلاً مصنف کی سیرت و شخصیت ہی کے فرق کے سبب بعض کے اظہار خیال میں سادگی سلاست اور روانی ملتی ہے اور بعض کے یہاں پیچیدہ اندز میں بیان کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلوب حقیقتاً فنی صورت گری کا عمل ہے۔

مثلاً کلاسیکل اسٹائل یا موڈرن اسٹائل۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی دور کے مختلف طرزِ نگارش کو بھی کیا بہ اعتبار موضوع اور کیا بہ اعتبار تکنیک، اسٹائل کہتے ہیں۔ مثلاً تاثر نگاری کا اسٹائل، مجرد پرستی کا

اسٹائل، بیانیہ اسٹائل، رزمیہ اسٹائل وغیرہ۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک ہی شخص بہ اعتبار موضوع اپنے اسٹائل کو بدلتا بھی رہتا ہے۔ وہ بہ یک وقت مختلف قسم کے اسٹائلوں پر قادر ہوسکتا ہے۔ اس کا اطلاق اس کی ہر قسم کی تحریروں پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ اگر چہ خود کو مختلف اسٹائلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے، مگر چھپ نہیں پاتا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ اسٹائل کا صرف اپنا ایک فنی معیار ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا رشتہ مصنف کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے۔ ۳؎

گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں:

''ادبی اسلوب بدیع و بیان کے پیرایوں کو شعر و ادب میں بروئے کار لانے اور ادبی حسن کاری کے عمل سے عہد برآ ہونے سے عبارت ہے۔ یعنی ایسی شے ہے جس سے ادبی اظہار کے حسن کی دل کشی میں اضافہ ہوتا ہے۔۔۔ گویا اسلوب زیور ہے ادبی اظہار کا جس سے اظہار کی جاذبیت، کشش اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔'' ۴؎

ادبی اظہار کا یہ پہلو جسے ہم اسلوب سے تعبیر کرتے ہیں، قاری کی جمالیاتی حس کو آسودگی اور طمانیت بخشتا اور اسے ذہنی مسرت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اسلوب کی تشکیل میں مصنف کے لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ اور الفاظ کو برتنے کے عمل کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عمل اصلاً مصنف کی شخصیت سے متعلق اور منسلک ہے۔ ادیب الفاظ کے ذریعے اپنی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح اس کے الفاظ کی مدد سے ہم اس کی شخصیت کا مرقع تیار کر سکتے ہیں۔ اسلوب ک واسی لیے مصنف کی شخصیت کا عکس بلکہ شخصیت قرار دیا گیا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی ادبی تخلیق میں الفاظ کا انتخاب واستعمال تمام تر مصنف کی شخصیت کا تابع ہے۔ بہ قول ابوذر عثمانی:

''۔۔۔۔جب ہم کسی ادیب یا مصنف کے اسلوب سے بحث کرتے ہیں تو ہم اپنی توجہ محض ادب و فن کے چند مقرر اور مانوس نکتوں کی جستجو تک محدود نہیں رکھتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان میں فن کار کی شخصیت کا رنگ کہاں تک نمایاں ہے اور اس کے زیر اثر ان میں کیا معنوی تبدیلیاں ہوئی ہیں؟ فن کار نے کس طرح اپنے موضوعات کو برتا ہے اور اپنے جذبات و احساسات کی تنظیم اور افکار و خیالات کی تشکیل کس طرح کی ہے۔ کس طرح اپنے مشاہدے اور مطالعے کو یکسو و منضبط کیا ہے اور بکھرے ہوئے تاثرات کو ایک رشتہ میں منسلک کر کے انہیں موزوں اور مناسب شکل میں جلوہ گر کیا ہے۔ جب تک ان سارے پہلوؤں پر غور نہ کیا جائے کسی فن کار کے اسلوب کی صحیح قدر و قیمت نمایاں نہیں ہو سکتی۔ دراصل یہ بحث فن کار کی شخصیت سے بڑا گہرا تعلق رکھتی ہے اور تخلیق فن کے خارجی اور داخلی

دونوں عناصر پر محیط ہے۔''۵؎

ممتاز حسین اسلوب میں انفرادیت کو شخصیت کی اثر پذیری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ موصوف کی یہ توجیہہ توجہ طلب ہے:

''اسلوب میں جو انفرادیت پیدا ہوتی ہے وہ شخصیت ہی سے اثر پذیر ہوتی ہے ورنہ فن تو قوانین حسین کے تابع ہے جس کا ایک خارجی معیار ہوتا ہے اور اسے کوئی بھی شخص حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن آخر الذکر صورت میں ایک فنکار کے اسلوب کو دوسرے فن کار کے اسلوب سے الگ پہچاننا مشکل ہو جائے گا اور یہ کہنا غلط ہے کہ ایک ہی شے کے بیان کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں اور اگر ہو بھی تو اسلوب اس لیے پیدا نہیں ہوتا ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کسی نے کوئی ایک طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ کسی منشی کے لیے صحیح ہو تو ہو فن کار کے حق میں صحیح نہیں ہے اور چوں کہ ہم اسٹائل کی بات محرر اور منشیوں کے رشتے سے نہیں کر رہے ہیں بلکہ فن کار، شاعر اور ادیب کے رشتے سے، یہ بات اور بھی زیادہ یوں صاف ہو سکتی ہے کہ ہم کسی شاعر یا ادیب کے اسٹائل کو اس کے خیالات اور جذبات کی قسموں سے نہیں بلکہ اس کے طریق فکر، اور اس کے آواز یا لب و لہجے سے پہچانتے ہیں۔ اسلوب کی انفرادیت خیال یا جذبات کی انفرادیت سے نہیں بلکہ طریق فکر اور آواز کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے۔ اسلوب میں انفرادیت اسی شخصیت کے مخصوص طریق فکر، افتادِ طبع اور منہاج ذوقی خصوصیات کی انفرادیت سے پیدا ہوتی ہے۔''۶؎

ممتاز حسین اسلوب اور شخصیت کے رشتے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی مزید توضیح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اسلوب کو افکار اور جذبات کی نوعیت سے نہیں بلکہ شخصیت کے رشتے سے پہچانا جاتا ہے۔ اسلوب اس نقش کا نام ہے جو شخصیت تحریر میں چھوڑتی ہے۔ یہ اس کے نبھانے سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے نقش کو انسان اس وقت مرتسم کرتا ہے جب کہ وہ اندازِ بیان کے تمام مستعار اسلوبوں سے درگزر کرتا ہے۔ بہترین اسٹائل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی اسٹائل سے بے خبر اور اپنی شخصیت سے باخبر ہوتا ہے۔ لیکن اسٹائل، تمام تر شخصیت ہی کی شے نہیں ہے، اس کا تعلق ابلاغ کے فن سے بھی ہے جس کا ایک معیار ہوتا ہے۔ ہر چند کہ وہ زمانے کے مذاق کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔''۷؎

ڈاکٹر اطہر پرویز کے الفاظ میں:

''انفرادی اسلوب ایک انفرادی شخصیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک نکھرا ہوا اسلوب ایک نکھری ہوئی

شخصیت کا مظہر ہوتا ہے اس لیے اسلوب کی تشکیل میں جہاں اور عناصر کام کرتے ہیں وہاں اس کے خالق کی شخصیت بھی بڑا اہم فریضہ انجام دیتی ہے۔''

واضح رہے کہ شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں خاندان اور والدین کے اثرات کے ساتھ تعلیم و تربیت، ماحول اور طرزِ زندگی کو بھی بڑا دخل ہے۔ اسی لیے کسی بھی فن پارے کے محرکات کی نشاندہی کے ذیل میں 'اسلوب' کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مڈلٹن مرے (Midelton Murry) نے اپنی کتاب The Problem of Style میں اسلوب کے تشکیلی عناصر پر بات کرتے ہوئے 'ماحول اور عہد' کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ''ادبی نثر کے انداز اور رنگ و آہنگ کی تشکیل میں کسی زمانے کے فیشن، ذوقِ جمال اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والے مزاج کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔'' وہ لکھتا ہے:

"The Literary Genius works itself out in the form of prose fiction or poletical fiction, indifferently and that form will largely depens upon the test of the age." P.N:52-0

کسی بھی مصنف کا ادبی ذوق اس کے مروجہ سماجی، سیاسی اور معاشی نظام میں پروان چڑھتا ہے جس کے اثرات مصنف کے فکر و فن پر بدیہی طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

متذکرہ عبارتوں کو مدنظر رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ فن کار، سلوب اور نفس موضوع کی ہم آہنگی پر پوری توجہ دیتا ہے۔

یہاں اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ فن کار اپنے موضوعات کے انتخاب اور اظہار خیال کی راہوں کے تعین میں آزاد ہے، لیکن وہ اپنے خیالات کا اظہار بہرحال کسی نہ کسی فارم میں کرتا ہے۔ جس کے اصول وضوابط کی پابندی اس پر لازم ہے، ورنہ وہ اپنے خیالات کا شاید صحت مندانہ اور موثر اظہار نہیں کر سکتا اور اس کی فنی کاوشیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے فن کار کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان اصول وقوانین سے پوری پوری واقفیت رکھے اور انہیں اپنے شعور اور مزاج کا بخوبی جزو بنائے تا کہ اس کے خیالات خود بخود ایک مخصوص فارم میں پوری روانی اور سہولت کے ساتھ راہ پا سکیں۔ اس سلسلے میں فن کار کے وہ فنی وسائل خاص طور پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں جنہیں استعمال کر کے وہ اپنی تخلیق اور فن کی دشواریوں کو سہل بناتا ہے۔ دراصل کسی فن کار کی انفرادیت کا انحصار بڑی حد تک انہی فنی وسائل کے کامیاب استعمال اور ان پر بھرپور دسترس پر ہے۔ ۸ے

'لفظ' خیال کی اکائی ہے جس کے توسط سے فکر و بیان کی رنگارنگ تصویریں ابھاری جاتی ہیں۔فن کار خیال و معنی کو موزوں اور مناسب الفاظ کا پیکر عطا کرتا ہے اور اس طرح موضوع و اسلوب کو ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ الفاظ کے در و بست، ترتیب و تنظیم اور زبان و بیان کو اسلوب میں اساسی حیثیت اور تازگی کے علاوہ معنی بندی کا بھی خیال رکھتا ہے، جس کی بنیاد پر الفاظ محض تخیل کے مبلغ نہیں ہوتے بلکہ مصور بن جاتے ہیں اور عبارت میں زور، دل نشینی اور اثر انگیزی کے ساتھ سحر کاری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''انتخاب الفاظ کا معاملہ یقیناً اسٹائل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ انتخاب موضوع کی مناسبت کے علاوہ نثر کے داخلی تقاضوں کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک الفاظ کی مجرو حیثیت کا تعلق ہے، انہیں مانوس یا نامانوس کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، یہ تقسیم ان کے بے جا استعمال سے شروع ہوتی ہے۔اسی لیے بن جانسن نے کہا تھا کہ ادیب کا کام یہ ہے کہ نئی باتوں کو مانوس بنا کر پیش کرے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ زبان میں کوئی دو لفظ مترادف نہیں ہوتے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے 'اوس' اور 'شبنم' ایک ہی چیز کے دو نام ہیں لیکن دونوں میں لطیف فرق ہے وہ برمحل استعمال پر ہی کھلتا ہے ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس شعر میں لفظ 'اوس' آیا ہے اور یہی برمحل ہے۔اب اگر 'شبنم' وزن میں کھپا بھی دیا جائے تو شعر کا سارا لطف مٹی میں مل جائے گا۔لیکن دوسری جگہ ؎

شبنم نے بھر دیے کٹورے گلاب کے

'شبنم' اور کٹورے پر غور کیجیے۔ان سے زیادہ مناسب الفاظ یہاں نہیں آ سکتے جو بھرپور صوتی آہنگ (Harmony) اور تصویریت کے ساتھ جمالیاتی پہلو بھی رکھتے ہوں۔کٹورے کی جگہ پیالے پڑھیے اور دیکھیے مصرع کتنا پھیکا ہو جاتا ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ لفظوں کا انتخاب ایک قسم کا ہنر ہے، ضرب الامثال، محاوروں، متروکات یا نئے لفظوں کی تشکیل اور انہیں مناسب ترین موقع پر استعمال اسی ہنر کے ذیل میں آتے ہیں۔ آر۔ڈی۔ بلیک لکھتا ہے:

''صاحب اسلوب کو چاہیے کہ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرے جو اس کے خیالات کو پراگندہ نہ کر سکیں بلکہ خیالات کی مکمل طور پر عکاسی کریں۔لیکن اگر وہ چاہے تو ایسے لفظوں کا بھی استعمال کر سکتا ہے جن کا

اندرون ذلالت اور ابتزال (Mean & Valgar) سے تشکیل پاتا ہے۔ظاہر ہے اسلوب کی معقولیت سے ایک نوع کی شائستگی (Decorum) پیدا ہوتی ہے۔''۹؎

یہ درست ہے کہ الفاظ کے انتخاب کے لیے کوئی اصول، طریقہ یا ضابطہ مقرر نہیں ہے پھر بھی لکھنے والے کی بصیرت، علمی شغف اور پختہ مذاق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ الفاظ خیالات کے ترجمان یا ابلاغ کا ذریعہ ہوتے ہیں۔لہٰذا الفاظ کی سادگی، قواعد کی درستگی اور تراکیب زبان کا خوب صورت التزام عمدہ اسلوب میں بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ فن کار اپنے قارئین سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ یہ بات مناسب نہیں کہ اگر بات معمولی اور سیدھی سادی ہو تو اس کے لیے الفاظ مغلق اور تراکیب پیچیدہ استعمال کی جائیں، اس طرح کی تحریر میں سادگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کچھ کج خلقی ہی کی دلیل ہے کہ فن کاران کو خواہ مخواہ ایک معمہ نما پارۂ غزل یا غزل کا کوئی شعر بنا دے اور ان کے وقت کے زیاں کے باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قطعیت کا خیال رکھتا ہے۔ یہ بھی موزوں نہیں کہ فن کار اپنے قارئین کا وقت یونہی ضائع کرے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بات اس طرح کہہ سکتا ہے کہ اختصار ملحوظ رہے۔۱۰؎

لوکس الفاظ کی سادگی اور قطعیت پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ سادگی کا اطلاق الفاظ اور معانی کے لوازمات پر بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سادگی سے مراد سلاست اور صفائی ہے جب کہ قطعیت افکار وجذبات کے صحیح معنی ومفہوم کے ابلاغ سے عبارت ہے۔ مولوی عبدالحق زبان کی سادگی کے علاوہ اثر پذیری ولطف اندوزی کو اسلوب کا جزو قرار دیتے ہیں:

''زبان کا آسان ہونا کافی نہیں، اس میں جان، اثر اور لطف ہونا چاہیے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ایسی زبان صرف کامل ادیب ہی لکھ سکتے ہیں ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدی ہو۔ دوسرے ہر ایک کے مزاج اور افتادِ طبیعت پر منحصر ہے۔ ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو، اگر مجبور کریں بھی تو ممکن نہیں۔ وہ نیا ڈھنگ تو اختیار کیا کرے گا، اپنا بھی بھول جائے گا۔ میرے کہنے کا منشا یہ ہے کہ یہ جو آج کل چاروں طرف 'آسان آسان' کا پرچار کیا جارہا ہے مجھے تو بے جا سا معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کوئی بے جان چیز تو ہے نہیں کہ جہاں چاہا اٹھایا، رکھ دیا۔ اس کے گنوں کو پرکھنے والے مشاق ادیب ہی ہو سکتے ہیں کسی اعلا درجے کے ادیب یا شاعر کا کلام اٹھا کر دیکھیے ہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نگینہ ہے جو اپنی جگہ جڑا ہوا ہے۔''۱۱؎

زبان ایک بدلتا ہوا سانچا ہے۔ وہ اپنی تبدیلی کے باعث زندہ رہ سکتی ہے۔ تغیرات اس کی

زندگی کی علامت ہیں۔ الفاظ، محاورات، فقرے اور استعارے میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے۔ یہ عمل الفاظ کے ساتھ بھی جاتی ہے اور فضا کی تبدیلی کے ساتھ اسٹائل کے لہجے میں بھی یہ بدلاؤ آتا ہے، بہ قول خواجہ الطاف حسین حالیؔ:

''مصنف کی قدرتِ بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ایک یہ ہے کہ وہ ہر ایک مضمون کی حالت کے مناسب ہو کیوں کہ اس قسم کے کلام کا پیرایۂ بیان جدا ہوتا ہے۔جس ڈھنگ پر ناول لکھا جاتا ہے اس ڈھنگ پر تاریخ یا ببلیو گرافی نہیں لکھی جاتی، جہاں متانت اور سنجیدگی کا موقع ہوتا ہے وہاں ظرافت نازیبا معلوم ہوتی ہے۔تشبیہہ و استعارہ اگرچہ نظم و نثر کا زیور ہے مگر کسی سر رشتے کی سالانہ رپورٹ یا کسی مقدمے کے فیصلے یا کسی پبلک جلسے کی روئیداد میں اس سے زیادہ کوئی چیز بدنما نہیں معلوم ہوتی؛ اسی لیے کہا گیا ہے کہ 'ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد'۔مگر جہاں تک دیکھا گیا ہے ہر مصنف پر اس کی طبیعت کے میلان کے موافق رفتہ رفتہ کسی خاص پیرایۂ بیان کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ ایک خاص مضمون کے سوا اور کسی موضوع پر کچھ نہیں لکھ سکتا یا جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کو اپنے خاص رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔غرض کہ جس مصنف یا مضمون نگار کو دیکھیے اس پر کوئی نہ کوئی بھوت سوار ہوتا ہے۔'' ۱۳؎

اس سے ظاہر ہے کہ جو مصنف فطری آواز میں نہیں بول سکتا اس کی آواز میں نقاہت اور بے چینی ظاہر ہے۔ ایسے مصنف کا اسلوب بھی بے اثر اور دروغ گوئی پر مبنی ہوگا۔لیکن اسلوب صرف الفاظ کا گورکھ دھندہ نہیں ہوتا، نہ وہ آسمان سے وارد ہوتا ہے نہ لاشعور کی تہوں سے نکلتا ہے، وہ ایک خود آگاہ شخصیت کی خواہش ترسیل کا ثمرہ ہوتا ہے اور ہر شخصیت، خاص تہذیب، خاص معاشرے کے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہے۔ اس کا ذہن اور شعور ان سے کسب فیض کرتا ہے، زندگی اور اس کے گونا گوں مسائل کے تئیں اس کے مخصوص اور منفرد رویے ہوتے ہیں، انہی رویوں کی سمت و رفتار کو مخصوص فکر اور نظریۂ حیات کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک ادیب یا تخلیق کار کے یہاں یہ فکر و نظر بے جان نہیں ہوتا۔ اس کے جذبہ و احساس کی نادیدہ لہریں اظہار کے عمل میں اس کا تخیل بھی اس کی فکر میں رنگ بھرتا ہے اور اس طرح اس کے اسلوب کو ایک منفرد لسانی اور جمالیاتی Pattern میں ڈھالتا ہے۔ ۱۴؎

اسلوب کے سلسلے میں موضوع کو خاص حیثیت حاصل ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر کسی موضوع کو ایک ہی اسلوب نہیں ہوسکتا، تاہم مصنف کا ذہن موضوع کی مناسب سے واضح اور غیر مبہم

ہونا چاہیے ورنہ اسلوب محض الفاظ کی کثرت کا ایک بے جان اور بے رنگ پیکر بن کر رہ جائے گا۔ موضوع کے اعتبار سے تحریروں میں تبدیلی ممکن ہے مگر ساتھ ہی ہر موضوع میں لب ولہجہ، الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ترتیب وانداز بیان سے جہاں قاری کے ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے وہیں پڑھنے والا مسرور اور متحیر بھی ہوتا ہے۔ بہ قول محی الدین قادری زورؔ:

''وہی اسلوب بہترین خیال کیا جا سکتا ہے جس میں گونا گونی اور رنگونی کی کثرت پڑھنے والے کو مسرت اور حیرت میں ڈال دے۔'' ۱۵؎

غرض کہ صحت مند اسلوب زندہ ومنفرد لفظوں کی ترتیب وتنظیم سے وجود میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں جملوں کی ساخت میں ایجاز واختصار اور موضوع کی مناسبت سے لفظیات پر بالخصوص توجہ دی جاتی ہے۔ اچھے اسلوب میں فصاحت وبلاغت، سلاست وشگفتگی، تاثیر ودل کشی کی کارفرمائی ہوتی ہے اور خوب صورت الفاظ سے پیدا کی جاتی ہے۔

لوکسؔ (Lucas) نے اسلوب کے تمام عناصر کا تجزیہ کرنے کے بعد جن بنیادی خصائص کی طرف توجہ دلائی ہے ان میں سلاست (Clarity)، بلاغت (Brovity)، متانت (Urbanity) اور سادگی (Simplicity) بطور خاص ہیں، ساتھ ہی لب ولہجے کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور ادبی نثر کو صناعی کا عمل تصور کرتے ہیں اور بے ساختگی کو اچھے اسلوب کا وصف قرار دیتے ہیں:

''ادب کی زبان میں شعوری طور پر صناعی کا عمل ناگزیر ہے۔ تحریر کی زبان جو ادب کی بنیاد ہے، بڑی حد تک مصنوعی ہوتی ہے۔ لفظ مصنوعی میں شعوری پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کے شعور کے ارتقا میں زندگی کے سارے پیچ وخم آجاتے ہیں اس لیے اچھا اسلوب بے ساختہ معلوم ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے صدیوں کے ذہن کا عطر اور ایک شخصیت کی بصیرت کی ساری روشنی اور گرمی ہوتی ہے۔'' ۱۶؎

گو اسلوب کی تعمیر وتشکیل میں محنت وادکار اور انتخاب الفاظ کے علاوہ شخصیت اور عصری میلانات کا بھی اثر ہوتا ہے اور ان میں سے کسی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عہد جدید کے نظریات اساتذۂ قدیم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ یہ زمانی فرق ہے کہ آج کے نقاد خیال کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اب کوئی علم عروض، علم قافیہ، صنائع اور بدائع کی کتابیں پڑھنا ضروری نہیں سمجھتا اور نہ ویسی عبارت لکھنے کی خواہش یا کوشش کرتا ہے جیسی انیسویں صدی تک ہمارے انشا پرداز لکھتے

ہیں۔ دورِ حاضر میں اسلوب کو پرکھنے کے معیار بھی بدل گئے ہیں، اب اس اسٹائل کو سائنٹفک سمجھتے ہیں جو آسان، سبک، سادہ اور مختصر ہو۔ اسلوب کی بنیاد دو چیزوں پر ہے خیال اور الفاظ۔ ان میں خیال کی اہمیت کو ترجیح حاصل ہے۔ اگر ہمارے ذہن میں خیال کسی ابہام اور شک کے بغیر موجود ہے تو اس کا بہترین پیرایۂ اظہار اختصار ہے۔ ۱۷؎

اختصار کا دوسرا پہلو قوتِ اظہار ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ پوری طرح معرضِ اظہار میں آجائے اور اس میں خیال کی پختگی کے ساتھ الفاظ کی پختگی بھی ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو اسلوب پیدا نہیں ہوگا۔ اپنا مفہوم تو سب ہی ادا کر دیتے ہیں لیکن عام لکھنے والوں کا اپنا اسلوب اس لیے نہیں ہوتا کہ ان کا خیال بھی ناپختہ ہوتا ہے اور قوتِ اظہار بھی خام ہوتی ہے۔ یہ پختگی اسلوب میں سنجیدگی یا Urbanity پیدا کر دیتی ہے۔ اسے طنز و مزاح، شگفتگی یا شوخی کی ضد نہ سمجھا جائے۔ اچھے اسلوب کے لیے Wit بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا بنفشی شعاعیں صحت کے لیے ہوسکتی ہیں۔ اچھے اسلوب کے لیے یہ شرط نہیں کہ تحریر کا موضوع ہی ہلکا پھلکا، شگفتہ اور عام پسند ہو، نہایت خشک اور ناپسندیدہ باتیں بھی اچھے اسلوب میں کہی جا سکتی ہیں۔ جہاں شگفتگی اور طنز و مزاح یا شوخی کا ذکر آیا ہے وہاں ایک بہت خفیف اور غیر محسوس حد فاصل بھی ہے ان محاسن کو ابتذال اور پھکڑ پن سے علاحدہ کرتی ہے۔ ۱۸؎

حاصل کلام کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلوب مخصوص طرز نگارش یا طرزِ اظہار ہے جس میں شخصی اوصاف کی کارفرمائی نمایاں ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں الفاظ، فقرہ، تشبیہات و استعارات کی تنظیم و ترتیب کا دوسرا نام اسلوب ہے، طرزِ نگارش کا یہ عمل جس کی بنا پر تخلیق کار یا مصنف دوسرے لکھنے والوں سے متمیّز ہوجاتا ہے 'اسلوب' کی رہین منت ہے۔

مصادر:

۱؎ حالی کی نثر نگاری: عبدالقیوم۔

۲؎ اسالیب نثر: امیر اللہ خاں شاہین۔

۳؎ ادب اور شعور: ممتاز حسین، ص ۲۴۱۔

۴؎ ادبی تنقید اور اسلوبیات: گوپی چند نارنگ، ص ۱۴۔

۵؎ فنکار سے فن تک: ابوذر عثمانی، ص ۳۵۔

۶؎، ۷؎ ادب اور شعور: ممتاز حسین، ص ۲۵۔

۸۔ فنکار سے فن تک: ابوذر عثمانی، ص ۳۶۔
۹۔ دید و دریافت: نثار احمد فاروقی۔
۱۰۔ اسلوب اور اسلوبیات: طارق سعید، ص ۱۸۵۔
۱۱۔ لوکس: بحوالہ ایضاً، ص ۱۸۶۔
۱۲۔ بحوالہ ایضاً، ص ۱۸۹۔
۱۳۔ حیات جاوید: حالی، ص ۴۹۲۔
۱۴۔ قمر رئیس، مشمولات اسلوب اور اسلوبیات۔
۱۵۔ اردو کے اسالیب بیان: محی الدین قادری زور، ص ۱۱۴۔
۱۶۔ نظر اور نظریے: آل احمد سرور، ص ۵۲، ۵۳۔
۱۷، ۱۸۔ دید و دریافت: نثار احمد فاروقی، ص ۱۷۷۔

☆☆☆

Arif Naqvi ka Novelette"Bujhte Jalte Chiragh"par ek nazar by Prof.Aslam Jamshedpuri (Head,Dept. of Urdu Chaudhry Charan Singh University Meerut) cell-9456259850

پروفیسر اسلم جمشید پوری (صدر، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ)

عارف نقوی کا ناولٹ ''بجھتے جلتے چراغ'' پر ایک نظر

اردو ناولٹ کی ابتدا، اردو ناول کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ ناولٹ دراصل، اردو ناول کی ایسی شکل ہے، جس کا کینوس چھوٹا ہوتا ہے، جس میں کردار کم ہوتے ہیں۔ جس میں زندگی کے ایک یا دو رخ کو دکھایا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اردو ناول اور ناولٹ میں امتیاز نہیں کرتے ہیں۔ جب کہ یہ ناول سے چھوٹا اور طویل افسانے سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کا ٹریٹمنٹ بھی ناول اور طویل افسانے سے مختلف ہوتا ہے۔ ناولٹ کی کہانی میں گٹھاؤ اور پینا پن ہوتا ہے۔ اس میں کہیں بھی بہت زیادہ لن ترانی کی گنجایش نہیں ہوتی۔ کردار بھی ناول کی طرح مضبوط و مستحکم نہیں ہوتے۔

اردو میں پہلا ناولٹ ڈپٹی نذیر احمد کا ''ایامیٰ'' ہے۔ جس کے تعلق سے ہمارے بہت سے ناقدین متفق ہیں۔ خاص کر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، جنھوں نے اردو ناولٹ پر پہلا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اپنی دلیلوں سے ثابت کرتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کا ''ایامیٰ'' اردو کا پہلا ناولٹ ہے۔ اردو ناولٹ نے ڈپٹی نذیر احمد کے بعد خوب ترقی کی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، پریم چند وغیرہ نے اچھے ناولٹ، اردو کو عطا کیے۔ لیکن سجاد ظہیر کا ناولٹ ''لندن کی ایک رات'' کو بعض ناقدین اردو کا پہلا باضابطہ ناولٹ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض ناقدین کی آرا ہے کہ 'لندن کی ایک رات' اردو ناولٹ کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہاں سے اردو ناول، ناولٹ اور افسانوں میں 'شعور کی رو" کا پہلی بار استعمال ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دوران اردو ناولٹ نے کافی ترقی کی۔

کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، وغیرہ نے اچھے ناولٹ تحریر کیے۔ جب جدیدیت کا دور دورہ ہوا تو اردو ناولٹ نے بھی ایک نئی کروٹ لی۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جوگندر پال وغیرہ نے اردو ناولٹ کو کافی عروج عطا کیا۔ بیسویں صدی کے اواخر تک اردو ناولٹ نے کافی ترقی کی۔ مختلف رسائل و جرائد نے ناولٹ نمبر شائع کیے۔ تنقیدی و تحقیقی

مقالات منظر عام پر آئے۔لیکن نئی صدی میں اردو ناولٹ کا وجود خطرے میں نظر آتا ہے۔اب ہمارے ناول نگار بھی، ناولٹ نگار کہلانا، خلافِ شان سمجھتے ہیں۔اور ستر اسی صفحات سے لے کر ڈیڑھ سوصفحات کے آس پاس کے ناولٹ کو بھی، ناول کہلانا پسند کرتے ہیں۔جبکہ ناولٹ کا اختصاصی پہلو یہ ہے کہ وہ ناول سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔اوراس کا کینوس ناول کے مقابلے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔لیکن پھر بھی ہمارے بعض فکشن نگار ناولٹ نگا کی بجائے ناول نگار رکہلانا پسند کرتے ہیں۔اور اپنے کم صفحات کے ناولٹ کو بھی، ناول لکھتے ہیں۔ ہمارے بعض فکشن نگاروں کی دیکھا دیکھی دوسرے فکشن نگاروں نے بھی فیشن کے طور پر اس عمل کو اپنا لیا۔جس سے نئی صدی میں اس صنف کو ناول میں ضم ہو جانے کا خطرہ لاحق ہے۔

عارف نقوی ایک ہشت پہل شخصیت کا نام ہے۔آپ نے ادب کی مختلف اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔آپ نے ڈرامے لکھے،انہیں اسٹیج کیا۔بطوراوراداکاراور ہدایت کار کام کیا۔آپ کے ڈراموں کا ایک مجموعہ پروفیسر اسلم سید کی ترتیب میں شائع ہوا۔آپ نے شاعری کی اور کئی مجموعے منظر عام پر آکر عوام کی داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔آپ نے صنفِ افسانہ میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔اورافسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔آپ نے کئی سفرنامے بھی لکھے۔آپ کے سفر ناموں کے دو مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔اپ نے خاکے ،تنقید،تاریخی مضامین اور متعدد کتابوں پر تبصرے بھی کئے۔آپ نے صحافت میں بھی خود کو ثابت کیا۔جرمنی میں رہتے ہوئے کئی انگریزی اوراردواخبارات کے علاوہ پی ٹی آئی اورانٹر پریس سروس روم اورآل انڈیا ریڈیو کی نمائندگی بھی کی۔آپ نے اپنا ناولٹ ''جلتے بجھتے چراغ'' لکھ کر ناول کی دنیا میں بھی قدم رکھا۔

عارف نقوی کا کمال یہ ہے کہ نظم ونثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔اردو میں بہت کم ایسے لوگ ہوئے ہیں،جنہیں نظم ونثر پر ایک جیسا عبور حاصل ہو۔عارف نقوی کی نظمیں اورغزلیں ہوں یا نثری اصناف میں ان کی تحریریں (افسانے،سفر نامے،خاکے،تنقید،ڈرامے،تاریخی اور صحافتی مضامین) سب پر آپ کومساوی قدرت حاصل ہے۔دراصل عارف نقوی کا تعلق ترقی پسندی کے اس قافلے سے ہے،جس نے آزادی کے بعد ہوش سنبھالا اور لکھنا شروع کیا۔آپ کو ابتدا ہی میں شارب ردولوی ،احراز نقوی، افتخار عارف ،آغا سہیل ،شمیم نکہت کا لکھنو یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران ہی ساتھ ملا۔آپ نے طالب علمانہ زندگی ہی میں لکھنااورڈرامے کرنا شروع کر دیا تھا۔دہلی آنے کے بعد

آپ کو سجاد ظہیر کا ساتھ ملا۔سجاد ظہیر کی رہنمائی میں آپ کو ترقی پسندی کے اہم ادباء و شعراء سے ملنے اور استفادہ کرنے کے مواقع میسر آئے۔دہلی میں رہتے ہوئے آپ نے شاعری،ڈرامہ نگاری،اور صحافتی صلاحیتوں کو کافی صیقل کیا۔پھر آپ اسکالر شپ پر جرمنی چلے گئے۔جرمنی میں رہتے ہوئے آپ نے نظم ونثر،دونوں پر خوب محنت کی اور ہر لمحہ آپ نکھرتے اور مستحکم ہوتے چلے گئے۔آج جب آپ نے جرمنی میں ساٹھ سال کا طویل عرصہ گذار لیا ہے تو آپ کا دامن اردو نظم ونثر کی تخلیقات سے مالا مال ہے۔

عارف نقوی کی تحریروں میں ترقی پسندی کے عناصر بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔وہ معاشرے میں مساوی حقوق کے قائل ہیں۔انہوں نے ترقی پسندی،جدیدیت،مابعد جدیدیت اور نئی صدی کے نشیب وفراز کو بھی دیکھا۔لیکن ان کے نقطہ ءنظر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔وہ آج بھی سماج کے حاشئے پر زندگی گذارنے والے افراد مثلاً نوکر ،رکشے والا،جوتے پالش کرنے والا،ٹھیلہ لگانے والا وغیرہ کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اور ہر وقت ان کی مالی اور عملی مدد کو تیار رہتے ہیں۔وہ روایت کی مثبت اقدار کو بالکل اچھوتے طریقے سے،نئے سماج میں زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔عارف نقوی کی تحریروں میں پائی جانے والی امید ویاس ،مایوسی اور نامرادی کے اندھیروں کو دور کرتی ہیں۔انسانیت کا سبق پڑھاتی ہیں،ساتھ ہی انسان سے پیار کرنا سکھاتی ہیں۔یعنی عارف نقوی کی تخلیقات میں خدا ترسی،انسان دوستی اور جذبہ ءترحم ملتا ہے۔جوانہیں اس عہد میں بھی ترقی پسند ثابت کرتا ہے۔

عارف نقوی کے ناولٹ ''جلتے بجھتے چراغ''میں مصنف نے یادوں کا سہارا لیتے ہوئے ماضی کی بازیافت کرنے کی سعی کی ہے۔ناول میں عارف نقوی نے جرمنی،ترکی اور عراق کی زندگی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لکھنو کی تہذیب کو بھی بہت قریب سے نہ صرف جذب کیا ہے بلکہ اس کو بہت کامیابی سے پیش بھی کیا ہے۔ماریہ اور ساجد ناولٹ کے مرکزی کردار ہیں۔دونون ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں۔جرمنی میں ساجد کی ماریہ سے ملاقات ایک یونیورسٹی کی ایک کلاس میں ہوئی تھی۔لڑکے ماریہ کے دیوانے تھے۔مگر ماریہ ساجد سے پیار کرتی تھی۔اس کی ماں مغربی جرمنی میں تھی۔ماریہ وہاں کسی بھی حال میں جانا چاہتی تھی۔

''ماریہ ہوش سے کام لو! یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔بہت خطرناک قدم ہے۔میں اگر تمہیں اپنی کار میں چھپا کر چیک پوائنٹ چارلی پر جی ڈی آر کی سرحدی چوکی سے گزروں گا تو وہا تلاشی ہوگی۔وہ

لوگ ذرا سے شکپر ساری کار کی سیٹوں کے نیچے، ڈکی کے اندر ہر جگہ ایک ایک چیز کو ٹٹول کر تلاشی لیں گے۔ اگر میں نے تمہارے اوپر بہت سی چیزیں لاد کر چھپانے کی کوشش کی تو بند ڈکی میں دم گھٹ سکتا ہے۔ تمہاری جان جا سکتی ہے۔ میں پکڑا جاؤں گا اور اگر کسی طرح وہاں سے نکل بھی جاؤں تو مغربی برلن میں قتل کے الزام میں پکڑا جاؤں گا۔ نہیں ڈارلنگ، یہ ہم دونوں کے لئے بہت خطرناک ہے۔ میری محبت کا اتنا بڑا امتحان نہ لو۔''

ناولٹ میں عارف نقوی نے شعور کی رو کا بہتر استعمال کیا ہے۔ وہ لکھنو میں ساجد کا بچپن اور لڑکپن دکھاتے ہیں۔ لکھنو کی تہذیب، لکھنو کے خاص علاقے، امام باڑے، تاریخی عمارتیں، اسکول کالج، یونیورسٹی کا ماحول، لکھنو کی تعزیہ داری اور علم، شیعہ سنی دونوں کا جلوس نکالنا، ذکر کی مجلسیں وغیرہ کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ کی بغاوت، فوجیوں کے تیور، اُس وقت کا لکھنو، طویل جد و جہد آزادی، آزادی کا جشن، خوشی کا ماحول، ہجرتوں کا سلسلہ، فرقہ وارانہ فسادات، عورتوں کی عصمتوں کا تار تار ہونا اور بے شمار لوگوں کا مارا جانا بھی دکھایا ہے۔ لکھنو کا ماحول دیکھیں: چوک کے پاس ہی ایک دوسری سڑک نخاس کہلاتی تھی۔ وہاں سڑکیں چوڑی تھیں۔ کاریں اور ٹانگے اور یکے بھی گزرتے تھے۔ ہر اتوار کو وہاں کئی میل تک ایک خاص بازار لگتا تھا۔ جہاں دنیا کی پرانی قیمتی چیزیں کوڑیوں کے مول ملتی تھیں۔ چاہے پرانی کتابیں ہوں یا کتابوں کی الماریاں، میزیں، لیمپ شیڈ، جھاڑ فانوس، مرادآبادی یا چینی کے برتن اور دوسری نایاب چیزیں۔ جنہیں لوگ اپنی غربت کی وجہ سے اپنے گھروں میں نہیں رکھ سکتے تھے اور کوڑیوں کے مول بیچ جاتے تھے

ساجد کا بچپن اور اس کی تعلیم لکھنو میں دکھائی گئی ہے۔ وہ ایک غریب خاندان سے ہے۔ مگر اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر پیٹر کی بیٹی سے پیار کر بیٹھتا ہے۔ ساجد پڑھائی کے علاوہ ایک ریسٹورنٹ میں جز وقتی ملازمت بھی کرتا ہے۔ وہ گاہے بگاہے اپنی محبوبہ سے بھی ملتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں کافی نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ میری اور ساجد کی محبت کی ایک جھلک دیکھیں:

''تمہارے بغیر مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔'' میری نے کہا۔ ساجد کو ایسا لگا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہے۔ پارک کا سارا منظر اس کے لئے نور میں نہا گیا۔ ہری ہری گھاس میں مخمل کی نرمی آ گئی تھی۔ گلنار کے پیڑوں پر پھول مسکرانے لگے۔ گیندے اور گلاب کی کیاریاں مہکنے لگیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے مدھر راگ پھوٹنے لگے۔ میری نے بتایا کہ وہ بھی یونیورسٹی کے پاس ہی ایک کالج میں پڑھ رہی ہے۔ ''مجھے بھی تم بہت یاد آتی ہو میری! میں تمہارے بغیر دو پل چین سے نہیں رہ سکتا۔ تمہارے بغیر میری

زندگی اب بیکار ہے۔'' ساجد نے جوش سے کہا۔

''دھت!'' میری نے ہنستے ہوئے کہا اور بھاگ کر اپنے گھر چلی گئی۔

اس دن سے وہ روز چھپ چھپ کر میری سے ملتا۔ دونوں کسی پارک میں چلے جاتے۔ اور گھنٹوں عہد و پیمان کیا کرتے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کو لتا اور مکیش کے گیت سناتے۔ دلیپ کمار اور مدھو بالا کے ڈائلاگ بولتے۔ ہاتھوں کو سہلاتے۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے"۔

ان کے پیار کو زمانے کی نظر لگ جاتی ہے۔ میری کے والدین دونوں کے پیار کے خلاف ہوتے ہیں۔ دونوں گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ میری کے والد مقدمہ دائر کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ساجد کو پولس گرفتار کر لیتی ہے اور جیل بھیج دیتی ہے۔ جیل کے حالات ناولٹ میں موثر ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن میری کے ساجد کے حق میں بیان دینے کے سبب، ساجد کا کیس ہلکا ہو جاتا ہے۔ میری کے والد بھی کیس واپس لے لیتے ہیں۔ بلآخر دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگتے ہیں۔ شیلا نام کی ایک بیٹی دونوں کی زندگی میں بہار بن کر آتی ہے۔

لکھنئو میں اچھی ملازمت نہ ملنے کے باعث ساجد، عراق چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ ایک کالج میں ملازمت حاصل کر لیتا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی کو لانے کے لئے ویزا کی کوششیں بھی کرتا ہے۔ لیکن ناکام ہو جاتا ہے۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ عراق کے مذہبی مقامات کی زیارت بھی کرتا ہے۔ پھر وہ پہلے ترکی بعد میں جرمنی چلا جاتا ہے۔ جرمنی میں بھی اسے ایک ریسٹورنٹ میں کام مل جاتا ہے۔ وہ مسز رابے کے گھر پے انگ گیسٹ کے طور پر رہنے لگتا ہے۔ ایک دن اس کی ملاقات مسز رابے شادی شدہ بیٹی انے ماری سے ہوتی ہے۔ تھوڑے سے تکلف کے بعد وہ اور ساجد بے تکلف دوست بن جاتے ہیں۔ دونوں کی قربت بڑھتے بڑھتے، پیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دونوں ہر جگہ ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن جلد ہی انے ماری کے رویے میں تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ رقص کرتی اور گھومتی ہے۔

ساجد کی زندگی میں بھی ماریہ نام کی دوشیزہ داخل ہوتی ہے۔ ماریہ اور ساجد میں جلد ہی پیار ہو جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہمیشہ ساتھ دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ماریہ کی دقت یہ ہے کہ وہ خود مشرقی برلن میں اور اس کی ماں مغربی برلن میں ہیں۔ ماریہ اپنی ماں کے لئے تڑپتی رہتی ہے۔ اور ہر ممکن کوشش کے باوجود ماریہ خود وہاں جا سکتی تھی نہ اس کی ماں ادھر آسکتی تھی۔

ساجد کی بیوی پہلے ہی ساجد سے طلاق لے چکی تھی۔ مگر ساجد کو بیوی اور بیٹی کی بہت یاد آتی

ہے۔وہ دونوں سے ملنے لکھنؤ بھی جاتا ہے۔میری کے گھر جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہیں۔وہ مایوس وناامید واپس جرمنی لوٹ آتا ہے۔آنے کے بعد وہ اسلامی گروپ میں شامل ہوجاتا ہے، جو مسلمانوں پر ہورہے ظلم وستم کے خلاف بڑی کارروائی کی تیاری میں تھا۔ساجد بھی اس گروپ میں شامل ہوجاتا ہے۔لیکن جب اسے ایک مال نما عمارت میں دھماکہ کرنا ہوتا ہے،اس کا ضمیراوراس کے اندر کا شریف انسان باہر آجاتا ہے۔

''ناظم کی کرخت آواز جو کہہ رہا تھا'' جاؤ، اندر جاؤ۔۔جامِ شہادت پیو! یہ گناہگار ہیں انہوں نے ہمارے نبی کی شان میں گستاخی کی ہے۔ جاؤ جامِ شہادت پیو!''

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے کانوں میں آواز آرہی تھی: ''یہ انسان نہیں، شیطان ہے۔یہ بھڑکا رہا ہے۔اشتعال دلا رہا ہے۔اپنی غفلت سے جاگو! ہوش میں آؤ! یہ دہشت پسندی ہوگی۔تیرا مذہب دہشت پسندی نہیں سکھاتا۔انسانیت، محبت، ہمدردی اور رواداری سکھاتا ہے۔دوسروں کے مذہب، بزرگوں اور زندگی کا احترام سکھاتا ہے۔''

میری کی آوازیں۔اس کی ننھی کومل بیٹی شیلا کی آوازیں۔اس کی ماں، بھائی، بہنوں اَنے ماری اور ماریہ کی آوازیں۔ اس پادری کی آواز جس نے اسے یہاں رہائش کا ویزا دلوانے میں مدد کی ہے۔

اسے لگا جیسے اس کی ننھی کومل گڑیا سی بیٹی سامنے کھڑی ہے۔ ''نہیں نہیں نہیں، یہ گناہ ہے۔یہ گناہ ہے۔پاپا، پاپا، نہیں۔یہ نہ کرو۔۔۔اس کے بہن بھائی، میری، اَنے ماری اور ماریہ سامنے کھڑے ہیں''۔

اس طرح وہ ناظم اور اس کے گروپ کے مقصد سے بغاوت کرتا ہے اور آتشی مادے والے بیگ کو برلن کے دریائے اسپرے میں پھینک دیتا ہے۔جس کے بعد ناظم اسے غدار کہتے ہوئے چاقو مار دیتا ہے۔ناولٹ کی کہانی ختم ہوجاتی ہے۔ناولٹ میں ساجد کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ناولٹ میں پہلی جنگِ عظیم، جرمنی کی ہار،ہٹلر کا عروج اور فاتحانہ پیش قدمی، دوسری جنگِ عظیم ،ہٹلر کی شکست اور خودکشی، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے اور خوفناک تباہیوں کا ذکر، جرمنی کا دوحصوں میں تقسیم ہونا حتیٰ کہ برلن کا بھی دوحصوں میں بٹ جانا اور بیچوں بیچ دیوار کا ہونا اور عوام پر اس کے اثرات کو ناولٹ میں خوبصورتی سے قلم بند کیا ہے۔

ناولٹ میں جذبات نگاری، لکھنؤ کی زندگی اور یورپ خاص کر جرمنی کی زندگی کی کشاکش کو بہتر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ناولٹ کی زبان اور کرداروں کے نام ماحول اور علاقائی زبان میں

ہیں۔ناولٹ میں زندگی کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ساجد کے کردار میں کہیں کہیں مصنف کی جھلک نظر آتی ہے۔ بلکہ جب وہ ساجد کو لکھنو کی گلیوں ،بازاروں،امام باڑوں،مسجدوں ،چائے خانوں اور مسلم ماحول میں دکھاتے ہیں،تو قاری محسوس کرتا ہے کہ مصنف اپنے بچپن کے واقعات بیان کرر ہا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو ''بجھتے جلتے چراغ''ایک رومانی ناولٹ ہے،جس میں عارف نقوی نے رومان کے مختلف شیڈس کو دکھایا ہے۔ساجد کا پہلے تو ماریہ سے رومان پیش کیا ہے۔شعور کی رو میں ساجد کا بچپن اور میری سے اس کے عشق اور شادی کی کہانی کو پیش کیا ہے۔لیکن پورے ناول میں مثبت پہلو حاوی رہتا ہے۔زندگی اور انسانیت پورے ناولٹ پر چھائی رہتی ہے۔ناولٹ کا نام بھی مایوسی سے امید کی طرف لے جاتا ہے اور یہی نالٹ کے اختتام پر بھی ہوتا ہے۔

☆☆☆

Hamajehat Fankar:Kashmiri Lal Zakir by Dr.Rashid Aziz (Assot.Prof. Dept. of Urdu Central University of Kashmir,Gandar Bal)
cell-9149959324
ڈاکٹر راشد عزیز (ایسوسیئٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، گاندربل)

ہمہ جہت فنکار: کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر ایک کثیر التصنیف ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں مظلوم ومفلوک الحال عوام کے مشاہدات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ ماہر تعلیم بھی ہیں اور منجھے ہوئے فکشن نویس اور نازک مزاج حساس شاعر بھی۔ ذاکر صاحب کے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے ہوالیکن تقسیم وطن کے حادثے نے اُنہیں فکشن کی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ ترقی پسند فکر سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اپنے ہم عصر ترقی پسند ادیبوں اور تحریک کے نظریہ اور فکر کی روشنی میں اپنا تخلیقی سفر طے کرتے رہے۔ انجمن کے جلسوں میں شرکت کا اثر یہ ہوا کہ روشن خیالی ان کی تخلیقی فکر بنی۔ ذاکر کی قربتیں جہاں منٹو، کرشن چندر، اشک، بھیشم ساہنی اور بیدی کے ساتھ رہیں وہیں ساحر لدھیانوی، مخمور جالندھری، اشک امرتسری، ہنسراج رہبر اور شرر فتح پوری وغیرہ سے بھی رفیقانہ صحبتیں رہیں۔ ذاکر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر قمر رئیس یوں رقم طراز ہیں:

''میں اپنے زمانۂ طالب علمی سے ان کو پڑھ رہا ہوں۔ ان کے ناول اور افسانے ایک واضح سیکولر اور ترقی پسندانہ نقطۂ نگاہ سے اجتماعی زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ اردو اکیڈمی ہریانہ کے معتمد کی حیثیت سے بھی انھوں نے اردو کی تعلیم اور ترقی کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔''

(سوونیر جشنِ کشمیری لال ذاکر 1995 ص 11)

کشمیری لال نے 7 اپریل 1919ء کو متوسط گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ اُن کے والد کا نام گرداس رام اور جائے پیدائش بیگا بانیان، گجرات (پاکستان) ہے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ریاست پونچھ اور سری نگر کے اسکولوں میں حاصل کی اور پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی۔ اے کرنے کے بعد انگریزی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے دوران ہی انہیں شاعری سے شغف ہوا اور

ذاکر تخلص اختیار کیا۔ 1947 کے واقعات نے تو کشمیری لال کے ذہن پر اثر ڈالا ہی لیکن سماجی ہلچلوں نے ان کی فکر کو زیادہ متاثر کیا۔ کشمیر کے مسائل، بھوپال گیس حادثہ، ہندوپاک کی جنگیں اور 84 کے المناک واقعات کے بعد پنجاب کے حالات اور دیگر قومی فسادات کے نتائج کا کرب اور دلدوز واقعات ان کی فکشن نگاری کا ایک پہلو بن گئے جو منٹو، بیدی اور اشک کی طرح ان کی تخلیقات میں نمایاں ہیں۔ایسی تصانیف میں چند خاص کے نام حسب ذیل ہیں۔

(1) جب کشمیر جل رہا تھا (2) انگوٹھے کا نشان (3) اداس شام کے آخری لمحے ((4 خون پھر خون ہے (5) ایک لڑکی بھٹکی ہوئی۔

ذاکر ایک ایسی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں جس نے نظامِ تعلیم اور اُردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے افسانوی ادب اور شاعری کے ساتھ ڈرامے اور ٹی وی کے لیے اسکرپٹ بھی لکھے۔ نظامِ تعلیم کی خدمات میں ان کا روشن کارنامہ تعلیم بالغاں کا نصاب ہے جس کی مدد سے بوڑھے طوطوں کو حروف آشنا کیا جاتا ہے۔ ذاکر کو ملنے والے سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے ادبی اعزاز نعامات میں نہرو لٹریسی ایوارڈ، غالب ایوارڈ، نقوش ایوارڈ (پاکستان) اور UNESCO فیلوشپ پر انہیں ناز ہے۔ ذاکر کا اسلوب نگارش پریم چند کی نثر نگاری، دیہی عوام اور دیہی زندگی سے قریب ہے۔ان کے تخلیق کردہ ادب کا اہم وصف پنجابی لوک گیت، لوک روایات اور گربانی کے الفاظ ہیں جو ان کی تخلیقات میں کہکشاں کی مانند چمکتے ہیں۔ان کی افسانوی تصانیف میں پنجابیت کی ایسی ٹھوس اور ٹھیٹھ مثالیں ملتی ہیں جن سے فن پارے کے حسن میں بلا کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ مثلاً پنجاب کی دھوپ، چاندنی، پانی، ہوا، گلیاں، کھیت، کنویں، دوستیاں، محبتیں اور رشتے وغیرہ کی وارداتیں اور تصویریں اس طرح نمودار ہوتی ہیں کہ قاری ان میں محو ہوجاتا ہے۔ اس کے دل میں مفلوک الحال دیہی عوام کے لیے دردمندی، فاشسٹ قوتوں کے خلاف احتجاج اور حب الوطنی کے جذبات جوش مارنے لگتے ہیں۔ وہ کم وبیش ہر دور میں ترقی پسند تحریک کے حامی رہے ہیں۔

ذاکر کی تحریروں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے لیے کسی ڈکشنری کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ عام اور معیاری زبان میں ایسا امتزاج پیدا کرتے ہیں کہ بڑا اور عمیق مفہوم بھی بآسانی ذہن نشین ہوجاتا ہے۔ان کے بیانیہ میں سادگی وسلاست کی وہ فہم وفراست ہے جس کی بنیاد لوک کہاوتوں، محاوروں اور ضرب الامثال کی اینٹیں چن چن کر رکھی جاتی ہے۔ان کے اسلوب کے جوہر ذیل میں درج مثالوں میں ملاحظہ کیجئے جو ذاکر کے مشاہدات کی بصیرت اور قلبی

وذہنی وسعت کی غماز ہیں۔

☆ ایک بار گھر چھوڑ دو تو پھر گھر ہمیں چھوڑ دیتا ہے۔

☆ اُجڑے ہوئے لوگ اُجڑے ہوئے لوگوں ہی کو قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

☆ گہری نیند میں سونے والوں کو تو سبھی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

☆ عورت تو اولاد سے آباد ہوتی ہے، گھر کی دیواروں اور چھت سے نہیں۔

☆ اب تو خدا ہی اپنی مخلوق سے ڈر رہا ہے۔

☆ درد اور سفر ایک ہی تجربے کے دو نام ہیں۔ درد اپنے آپ میں ایک طویل اور دشوار سفر ہے اور سفر بذاتِ خود ایک درد۔

ذاکر کی تحریروں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کو برتنے کے ہنر پر نہ صرف قادر ہیں بلکہ وہ اپنے تخلیقی اوزاروں سے بے جان شے میں بھی روح ڈال دیتے ہیں۔ سیدھے سادے لفظوں کو ایسی تلمیحات اور معنی و مفہوم کے پیکر عطا کرتے ہیں کہ قاری ہر لفظ کے ساتھ متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔ تقسیم وطن اور دوسرے انسان سوز المیوں کے پیشِ نظر دو مثالیں دیکھئے:

☆ وہ نسل جو ایک پوری فصل کی طرح پروان چڑھی تھی۔

☆ ان شہیدوں میں بیشتر وہ لوگ تھے جنھیں مرتے دم تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کیوں شہید کیے گیے۔

اب تک ذاکر کی سو سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی طویل فہرست کئی درجن ناولوں، ایک درجن سے زیادہ افسانوی مجموعوں، ڈراموں کے مجموعوں، پین اسکیچ اور سفر نامہ ''یہ صبح زندہ رہے گی'' کے علاوہ شعری مجموعہ ''شیشہ بدن خواب'' وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہاں چند تصانیف کے نام درج ہیں۔(1) میرا شہر ادھورا سا (2) اس صدی کا آخری گرہن (3) درد آشنا چہرے (4) بلیک باکس (5) بیروں والا فقیر (6) کرماں والی (7) نئی صبحوں کے سفیر (8) سلاخ ٹوٹتی ہوئی (9) ہم سایہ (10) سندور کی راکھ (11) نگینہ بیکری کا قلندر (12) درد بے زبان ہے

روسی ناول نگار داستوفسکی نے اپنے ایک کردار سے مخاطب ہو کر کہا تھا، ''سونیا میں تمہیں نہیں بلکہ تمہارے اندر دُکھی انسانیت کو سلام کرتا ہوں۔'' ذاکر بھی وکالت کرتے ہیں بدحال، زندگی سے نڈھال اور گورکھ دھندوں میں الجھے مظلوموں کی جوان سے بچنے کی راہیں نہیں ڈھونڈ پائے۔ ان کے فکشن میں جدوجہد کرتے اور سعی وسکت کو آزماتے کرداروں میں کرمو، خوشیا، فیضا، کیدار، رتنا اور

پرکاشو زیادہ جاندار ہیں جو دوسرے کرداروں کے مقابلے زیادہ گہرا تاثر چھوڑتے ہیں۔ایک تو کشمیری لال ذاکر نے صفحۂ قرطاس پر اتنے تخلیقی تاروں کی انجمن سجادی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی روشنی سے چمکتے رہتے ہیں۔دوسرے تخلص کے انتخاب نے ان کے دائمی ذکر کو جلا بخشی ہے۔ ذاکر کا کام ذکر کرنا ہے اور جس کا ذکر ہوتا ہے وہ ذاکر کا دم ہے۔اس کی سانسیں ہیں۔اس بات کو اور ذرا صاف کہیں تو خود کے آنے سے ہی خود کا خدا آتا ہے۔ذاکر نے ذاکر کی اس منزل کو سمجھا اور سمجھ کر بشر دوستی کا دم بھرا۔یہ دوستی تخلیق کا باعث بنی اور ذاکر تخلیق کار۔بشری مشاہدات کی کیفیتوں کو تخلیقی پیکر عطا کرنا ایک بے کراں کرب سے نبرد آزما ہونا ہے۔اس فکر کو ہر بڑے شاعر وادیب نے بیان کیا ہے لیکن ذاکر کا انداز منفرد ہے۔تضاد کے پہلو میں استعارے اور تشبیہہ کا نادر جوہر اس شعر کی جان ہے۔

سوتن کی طرح روح پہ بجلی بھی گری ہے　　　برہن کی طرح لاکھ نقابوں میں جلا ہوں

روشن خیالی اور عرفانِ ذات سے ذاکر اپنے قاری کو بڑی خوبی سے روشناس کراتا ہے۔افسانوی ادب میں تو سماجی بندشوں کی پاسداری ہوجاتی ہے لیکن شاعری میں تخلیق کی دیویاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔شاعر کا شعر قلندر کا نعرہ ہوتا ہے اور اناالحق اس کا ورد۔ذاکر کے بحرِ فکر میں غوطہ زن صرف دو شعر اسی قبیل کے یہاں درج ہیں۔

اس بھری دنیا میں سوڈھب کے خدا دیکھے ہیں　　　سوچتا ہوں کہ میں خود اپنا خدا ہوجاؤں
اس طرح بکھروں کہ بس کون ومکاں میرے ہوں　　　اس طرح سمٹوں کہ ہر بزم میں تنہا ہوجاؤں

عصرِ حاضر کے دلدوز حالات سے ذاکر کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔وہ دوستی میں فریب کا شکوہ ضرور کرتا ہے مگر اقدارِ دوستی کی روایات سے منھ نہیں موڑتا بلکہ اپنی لاش خود اُٹھانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

سُلگ رہے ہیں کواڑوں پہ نام یاروں کے　　　پڑوسیوں نے میرا گھر جلایا لگتا ہے
لٹکنا ہوتا ہے خود ہی وفا کی سولی پر　　　پھر اپنی لاش کو خود ہی اٹھانا ہوتا ہے

ذاکر نے حالاں کہ فکشن میں زیادہ لکھا ہے لیکن ان کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ فطری طور پر وہ شاعر ہی ہیں۔شاید انہیں مزاج کا باغیانہ صفت بشر دوست کہنا مناسب ہے۔

☆☆☆

Mahrumiyat banam shamoliyat: mashmuli talim maidan-e-amal mein
by Dr.Talmeez Fatma Naqvi(Assot.Prof.MANUU College of teacher education,Bhopal)cell-9977152854

ڈاکٹر تلمیذ فاطمہ نقوی (اسوسیئٹ پروفیسر، مانو، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال)

محرومیت بنام شمولیت: مشمولی تعلیم میدانِ عمل میں

پیش نظر مقالہ کا مقصد تعلیم سے محروم پسماندہ طبقے کے طلباء وطالبات کی اسکول سے متعلق ان دقتوں کی نشاندہی کرنا ہے جو ایسے بچوں کی اکتسابی عمل میں حائل ہوتی ہیں اور انہیں معیاری تعلیم سے محروم رکھنے میں نمایاں رول ادا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں کلاس روم اور خود اسکول کے ماحول یعنی تعلیمی ثقافت پر توجہ مبذول ہونا ایک فطری بات ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ان اسباب پر غور کیا گیا ہے۔ جو پسماندہ بچوں کو تعلیمی میدان میں دقتیں پیدا کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شمولیت کی زمینی حقیقت کیا ہے اور اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ذمہ دار بالخصوص اساتذہ کس حد تک اسکیم کی روح کے مطابق عمل پیراں ہیں یا پھر عملی صورت حال میں انحراف بھی کارفرما ہیں۔ موجودہ تحریر سے یہ واضح ہوگا کہ چنوتیوں کی نوعیت اور شدت تصور کی گئی صورت حال سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دقت آمیز ہیں یعنی فراہم کردہ طریقۂ کار ناقص ہے یا ناکافی ہے۔

قانون برائے تعلیمی حق (Right to Education Act.) نے پسماندہ طبقوں کے بچوں کو اعلیٰ طبقاتی اسکولوں میں داخلہ تو یقینی کیا ہے مگر داخلے کے بعد کیا یہ بچے نیے اور مختلف ماحول سے ہم اہنگ محسوس کرتے ہیں کیا تقسیم وتفریق کا یہ سلسلہ ختم ہو رہا ہے یا پھر قائم ودائم ہے؟ اسکول اور کلاس کا ماحول اور اساتذہ کا رویہ مشمولی تعلیم کے مزاج سے مربوط ہے یا پھر ہم آہنگی کی ضرورت نقائص کا شکار بن رہی ہے ان سوالوں کا جواب حاصل کیا جانا موجودہ اسکیم کی کامیابی اور ناکامی کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری محسوس ہوتا ہے۔

ہندوستانی سماج ایک درجہ بند سماج ہیں۔ سماج کی یہ تقسیم محض مادّی حیثیت تک محدود نہیں بلکہ زبان، اندازِ زندگی، رویہ اور ایک دوسرے کے تئیں اندازِ فکر سے بھی عیاں ہوتی ہیں۔ ذات پات کی تقسیم، عزت وتحقیر کی شکل میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اسکول کو سماجی آہنگی اور شمول کے قیام کا

ذریعہ تصور کیا جاتا رہا ہے مگر اسکولی نظام خود طبقاتی خطوط پر منقسم ہے ایک طرف سرکاری یا عام اسکول ہیں جو عام ہندوستانیوں کے بچوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے قائم کئے گئے ہیں مگر دوسری طرف ایسے نجی اور مخصوص اسکولوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو معاشرے کے باحیثیت اور علیٰ طبقوں سے متعلق بچوں کی تعلیمی ضروریات پورا کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیثیت پر مبنی یہ دوہرا اسکولی نظام وسیع اور مضبوط ہوا ہے اسکولوں کی اس تقسیم نے سماجی تقسیم کو مزید مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔دوسرے الفاظ میں یہ نظام طبقاتی ہم آہنگی کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مسلسل حائل ہو رہا ہے۔

اسکولوں کی مذکورہ بالا تقسیم کو ذہن میں رکھتے ہوئے کوٹھاری کمیشن نے ایسے ہمسایہ اسکولوں کے قیام کی سفارش کی جن میں بنا ذات پات، طبقات، جنس کی تقسیم کے سبھی بچّے مشمولی طریقے سے ایک ساتھ تعلیم حاصل کر سکیں۔کوٹھاری کمیشن کے بعد سبھی سرکاری تجاویز اور پالیسیوں میں اسی خاکہ کو روبۂ عمل لانے کی کوشش کی RTE Act. 2009 نے بھی اسی تصور کو قانونی شکل فراہم کی مگر اسکولوں کا جاری نظام ان تجاویز کی ضد کی شکل میں موجود ہے۔مختلف قسم کے طبقاتی اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچّے طبقاتی نظام کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کا وسیلہ بن رہے ہیں۔اس تقسیم کا سلسلہ نرسری کے مرحلہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور آئندہ جاری رہتا ہے۔کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے ان بچوں کو اعلیٰ طبقاتی اسکول داخلہ دینے سے گریز کرتے ہیں انجام کار بچوں کی پروش طبقاتی خطوط پر ہوتی ہیں۔اور ان کی تعلیم پر بھی ان کے طبقاتی نشان منقّش ہو جاتے ہیں۔

RTE Act. 2009 کی دفعہ (c) (1) 12 نے پسماندہ طبقوں کے بچوں کے لیے نجی اسکولوں کے دروازے کھول دیے ان کے لیے 25 فیصدی سیٹیں محفوظ ہوئیں داخلوں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔یہ سلسلہ پہلی جماعت سے شروع ہوا اور دھیرے دھیرے اسکول کی سبھی جماعتوں میں پسماندہ طبقے کے طلبہ کی تعداد ایک چوتھائی ہوگی۔ یعنی اسکول کی سبھی جماعتیں کثیر طبقاتی بچوں پر مشتمل ہونگی۔جس سے طبقاتی تفریق کی جگہ جماعت مخلوط آبادی پر مشتمل ہوگی۔ پروفیسر کرشن کمار ((2012 کے مطابق یہ نئی جماعتیں ہمہ رنگ ہونگی اور تدریسی عمل میں اس سے استفادہ کیا جائیگا۔اساتذہ کے سامنے ایسے طلبہ وطالبات ہونگے کہ جن کی زندگی کے مختلف مشاہدات اور تجربات زندہ مثال کی شکل میں موجود ہونگے۔اور انہیں ثقافتی کثرت کی فہم ہم آہنگی کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔مگر ماہرِ تعلیم کا یہ خیال محض فکر و خیال سے پیدا ہوا ہے۔جس کا میدانِ عمل کی حقیقتوں سے ثابت کیا جانا باقی ہے۔حقیقت یہ ہے

کہ اعلیٰ طبقاتی اسکول ثقافت کے اعتبار سے یک رنگ ہے جہاں ہندوستان کے تہذیبی گلدستہ کی نمائندگی نہیں ہوتی۔نجی اسکولوں کے اساتذہ کا تعلق جماعت کے یک رنگی ماحول سے رہا ہے۔ایسے اساتذہ سے یہ توقع کرنا مشکل ہے کہ وہ پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ اپنا رویہ کو بھی ہمہ رنگ جماعتی ماحول کے مطابق یکسر بدل پائیں گے۔ یہ دلیل بچوں پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ان اسکولوں کے بچے نو دس سال کی عمر تک الگ تھلگ ماحول کی یک رنگی ثقافت میں رچے بسے رہے ہیں،تو نئے ماحول کو وہ کیونکر اور کیسے اپنا پائیں گے۔انہیں ضرورت کے تحت حکماً تبدیل نہیں کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح اسکول کی اخلاقی اقدار کا بھی اچانک تبدیل ہوجانے کی توقع خلاف عقل محسوس ہوتی ہے۔اساتذہ، اسکول اور بچوں کو اس نئے ماحول میں ڈھالنے کے لیے فہم و تربیت کے ساتھ ساتھ وقت بھی درکار ہے ۔گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ پسماندہ طبقوں کے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور یہ اسکول میں طلباء کی کل تعداد کا ایک چوتھائی ہوسکیں۔اس سے اسکول کے ماحول میں ایک مختلف تہذیبی عناصر کے حامل بچوں کی موجودگی اسکول کے ماحول کو کچھ حد تک بدلنے میں اثر انداز ہوسکتی ہے۔ بدلتے ہوئے ماحول کے دوران اسکول کے اساتذہ کو ان بچوں کی موجودگی سے پیدا ہونے والی ضروریات اور درکار طریقہ کار میں تربیت دینے کے لیے وقت دستیاب ہوگا اِن کم سن بچوں کو بھی بدلتے ہوئے ماحول میں ڈھالنے کے لئے دقتیں کہیں کم ہونگی کیونکہ یہ عمر ذہنی رجحانات کو بنانے اور ڈھالنے میں نسبتاً آسان تر ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کے دو فائدے محسوس کیے گئے اول پسماندہ طبقے کے بچوں کو معیاری تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے گا او ساتھ ہی ساتھ بنا کسی تفریق کے مختلف قسم کے بچوں کے ساتھ جماعتی زندگی گزارنے اور اندازِ فکر پیدا کرنے کی سہولت حاصل ہوگی دوسرا فائدہ اعلیٰ طبقہ کے بچوں کے لیے قابل ذکر ہے یہ بچے پسماندہ طبقوں کے بچوں کی زندگی، تجربات اور مشاہدات سے مستفید ہونگے اور انہیں ہمہ رنگ ہندوستانی ماحول میں زندگی گزارنے کے لئے درکار تربیت بھی خود بخود مل سکے گی۔مگر اس ماحول سے مستفید ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اساتذہ مختلف تہذیبی عناصر سے درس وتدریس کے دوران استفادہ حاصل کریں اور تہذیبی ہمہ رنگی کے مختلف پہلوؤں کو تعلیمی اور تہذیبی اثاثہ کی شکل میں بروئے کار لائیں گے۔یعنی طریقہ تدریس طلباء کی انفرادی ضروریات سے ہم آہنگ ہو یہ تبھی ممکن ہے کہ جب اساتذہ وہ استعداد حاصل کرسکیں جس میں معلومات طریقہ کار اور ایسے رویہ شامل ہوں کہ جو سبھی بچوں کی اکتسابی ضروریات پوری کرسکیں۔

مشمولی تعلیم کی جامعیت اور افادیت کے پیش نظر زمینی حقیقت کو سمجھنے کی لازمی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔موجودہ موضوع اس لئے بھی اہم ہو جاتا ہے کہ مشمولی تعلیم پر عمل درآمد کے لئے اساتذہ کے ذہن میں ضرورت مند بچوں کا تصور کیا ہے۔ یہ تصورات در اصل ضرورت مند بچوں کے تئیں اساتذہ کے تعصب اور دقیانوسی تصورات کی وجہ بھی ہیں ،نتیجہ بھی اور انہیں سے بچوں کے تئیں ان کا رویہ بھی متاثر ہوتا ہے انجام کار یہ ہی تعلیمی سلسلے کے معیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔اس طرح موجودہ مقالے کے لئے تحقیقی سوالات ذیل میں مندرج کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ پرائیویٹ اسکول کے اساتذہ کے ذہن میں مشمولی تعلیم کی فہم اور تصور کیا ہے؟

۲۔ ضرورت مند بچوں کے بارے میں اساتذہ کے تصورات کیا ہیں۔؟

۳۔ مشمولی تعلیم کے لئے درکار استعداد کے بارے میں اساتذہ کے خیالات کیا ہیں؟

۴۔ اساتذہ کی مشمولی تعلیم پر روبہ عمل ہونے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کے بارے میں کیا سوچ ہے انہیں اس سلسلے میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں؟

موجودہ مطالعہ کا مقصد ان حقائق کی نشاندہی کرنا ہے کہ جو .RTE Act اور بالخصوص مشمولی ماحول اور تعلیم فراہم ہونے میں حائل ہوسکتے ہیں۔ مقاصد کے حصول کے لئے محقق نے موجودہ مطالعہ میں اساتذہ کا انٹرویو، مرکوز گروہی تبادلہ خیال اور طلباء سے براہ راست بات چیت اور دوران تدریس کلاس روم مشاہدہ شامل کیا۔محقق نے موجودہ مطالعہ مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں واقع 10 نجی سرمایہ سے چلنے والے اسکولوں میں کیا گیا۔ دوران مطالعہ معلوم ہوا کہ ان اسکولوں نے RTE Act کے تحت کیے جانے والے داخلوں کو نہایت بے دلی سے تسلیم کیا ہے۔ان اسکولوں کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے والے اساتذہ اور انہیں کلاسوں کے طلباء اور طالبات کو معطیات کو مجتمع کرنے کے لئے مطالعہ میں شامل کیا گیا۔ جماعتوں کے مشاہدوں کے علاوہ ۶ تا ۸ شرکاء پر مشتمل گروہوں سے براہ راست گفتگو کی گئی۔کل شرکاء کی تعداد پچاس پر مشتمل تھی۔طلباء اور اساتذہ کا انتخاب با مقصد نمونہ سازی تکنیک کے تحت عمل آیا۔

اسکولوں کے ناظم سے اجازت لینے کے بعد ان اساتذہ کے ساتھ گروہی بتادلہ خیال کیا گیا جو RTE Act کے تحت داخل ہونے والے بچوں کے ساتھ تدریسی یا غیر تدریسی عمل میں شامل تھے معطیات کے مجتمع کرنے کے دوران اساتذہ ،طلباء و طالبات کو اپنی دلی احساسات کو ظاہر کرنے کے لئے تحریک دی گئی۔نتائج اخذ کرنے اور تشریح کے لئے اطلاعات کا کیفیتی تجزیہ وتنقیدی مطالعہ کیا

گیا۔اس کی بنیاد پر ذیل میں درج حقائق سامنے آتے ہیں۔

مشمولی تعلیم کی فہم: اساتذہ کی مشمولی تعلیم کی فہم موجودہ اسکیم کو عملی شکل دینے کے لئے بنیادی ضرورت قرار دی جاسکتی ہے۔اسکولوں میں اساتذہ کی مشمولی تعلیم کی فہم نہایت محدود اور ناقص محسوس ہوئی ان کی نظر میں یہ سرکار کی طرف سے تھوپی گئی ایک اسکیم ہے۔تین چوتھائی اساتذہ نے سرکار کی اس پالیسی کو منفی انداز میں لیا۔ان کی نظر میں یہ سطحی ہے اس اسکیم کو لاگو کرنے کے طریقہ لیکر بھی اساتذہ کے ذہن میں شک وشبہات پائے گئے۔اسکیم کو لاگو کرنے سے پہلے اسکیم کے بارے میں اساتذہ کو مشمولی تعلیم کے تصور سے بھرپور آگاہی فراہم نہیں کی گئی ایسے اساتذہ جن کی معلومات ہی ناقص ہو اور جو غیر ہمدردانا رویے کے شکار ہو اسکیم کو صحیح معنوں میں لاگو کرنے کی توقع رکھنا غیر مدلل ہوگا۔ تدریسی ڈگری حاصل کرنے کے دوران بھی انہیں اس سلسلے میں تربیت نہیں دی گئی یہ دیکھا گیا کہ تدریس کے دوران ہی یہ اساتذہ اپنے مشاہدات کی بنیاد پر طریقۂ تدریس اپنا رہے ہیں۔اور یہ طریقہ انفرادی ہے۔ بالخصوص معاشری اور ثقافتی بہتات کے پسِ منظر میں اساتذہ کے تدریسی طریقہ اور رویہ نہایت ناقص محسوس ہوئے۔

مختلف تحقیقی مطالعوں سے بھی یہ ثابت ہے کہ پسماندہ طبقوں کے بچوں کے تئیں اساتذہ کا رویہ منفی ہے۔ان کی نظر میں ان بچوں سے معیاری تعلیم کی توقع رکھنا بہت بے جا ہے۔اساتذہ کا رویے کا تدریسی عمل پر اثر ہوتا ہے اور یہ عمل بچوں کی کارکردگی پر بھی اثرانداز ہوتا ہے۔بچوں کی غیر معیاری کارکردگی کے بارے میں اساتذہ کی یہ متفقہ رائے پائی گئی کہ ان کی تمام تر ناقص کارکردگی اور ناکامی کی وجہ ان بچوں کی معاشرتی، ذاتی اور معاشی پسِ منظر میں نہاں ہیں۔موجودہ اسکیم کی ایک بڑی خامی جو ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ یہ ہے کہ درکار بااستعداد اور تربیت یافتہ اساتذہ کا فقدان ہے یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ابتدائی مرحلات میں استاذ کی اہمیت مرکزی ہوتی ہے۔استاذ کا رویہ اور خیالات نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ اجتماعی شکل میں بھی بچوں کی ذہن سازی کو متأثر کرتی ہے۔یعنی اگر اساتذہ کے طریقۂ کار ناقص ہیں تو بچوں کی تحصیلی علم کا پورا سلسلہ ناقص ہو جاتا ہے۔

مشمولی تعلیم کے لیے درکار مہارتیں: انفرادی و اجتماعی بات چیت کے دوران یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ کیا اساتذہ ان معلومات، مہارتوں اور رویوں سے واقف ہیں جن کی مشمولی تعلیم کو عملی جامہ دینے کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔معلوم ہوا کہ یہ اساتذہ ان سے کم وبیش نابلد ہیں۔مثلاً طلباء کی کارکردگی کے بارے میں توقعات قائم کرنا، انہیں مناسب سہارا فراہم کرنا وغیرہ۔اساتذہ کے طلباء کے بارے

میں ایسے تصورات کا اثر انداز ہونا تعلیم میں اقدار کی شمولیت، اساتذہ میں آپسی تعاون اور طریقۂ کار میں یکجہتی، تعلیم کے ثقافتی اور معاشرتی پہلوؤں کی فہم، وغیرہ ایسی بنیادی چیزوں کی فہم کا فقدان پایا گیا۔ قابلِ ذکر امر یہ بھی ہے کہ اساتذہ بچوں کی صلاحیت، استعداد اور کارکردگی کو ان کی خاندان کے پسِ منظر سے ہٹ کر سوچنے کے لئے بمشکل راضی ہیں۔ پچاس میں سے محض سات ((14%اساتذہ نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ نہ صرف درکار مہارتوں سے مرصع ہیں بلکہ وہ ان پر عمل بھی کرتے ہیں۔ چند اساتذہ نے یہ بھی بتایا کہ انہیں طلبہ کی بڑی تعداد کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے اور وہ ان کے لئے جداگانہ طریقہ کار اپنانا نہایت دقت طلب عمل ہے۔ خیال ظاہر کیا گیا کہ ان بچوں کے ماحول کی زبان معیاری زبان سے اس حد تک مختلف ہے کہ اساتذہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں کہ بچے نے کیا پوچھا اور کیا بتایا۔ ایک استاذ کے خیال میں ان بچوں کی زبان مختلف ہونے کے باوجود انہیں اپنی بات ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے اور یہ ان کی جذباتی ضروریات کی تکمیل بھی کرتی ہے۔ زبان کے سلسلے میں قابلِ افسوس پہلوؤ یہ کہ اعلیٰ طبقے کے بچے پسماندہ طبقے کے بچوں کے اندازِ بیاں اور ان کی زبان تمسخرانہ انداز میں لیتے ہیں۔

دوسری دقت جو کم وبیش سبھی اساتذہ نے بیان کی وہ یہ ہے کہ یہ بچے تدریسی عمل میں متحرک ہونے کے بجائے شرکت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ انہیں انفرادی کام تفویض کئے جاتے ہیں مگر وہ انہیں پورا نہیں کرتے ساتھ ہی ایسے بچے بھی پائے گئے جو پہلی کلاس میں حاصل کی گئی کسی بھی مہارت سے محروم ہیں۔ وہ نہ صرف لکھنے سے بلکہ پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم پائے گئے دوسری طرف اساتذہ بھی نہ صرف انفرادی توجہ دینے سے قاصر ہیں بلکہ وہ اس طرح توجہ فراہم کرنے کی عمل کو تکلیف دہ اور غیر ضروری تصور کرتے ہیں۔

اساتذہ کا رول اور دورانِ کار پیش آنے والی دقتیں: اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ اساتذہ مشمولی تعلیم کی ضروریات، اس کے فلسفے اور طریقۂ کار کے بارے میں نسبتاً نابلد ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں اور رول کی مناسب فہم نہیں رکھتے اساتذہ کی تمام تر کوششوں کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی عمل نہ تو مشمولی ہے اور نہ مؤثر۔ اساتذہ کی یہ متفقہ رائے ہے کہ طلباء اور ان کے والدین ہی مسئلہ کی اصل وجہ ہیں اساتذہ کی بھاری اکثریت ((80% کی نظر میں یہ بچے نہ کھانے کے طریقے سے واقف ہیں اور نہ ہی اپنے جوتے و کپڑے صاف رکھ پاتے ہیں۔ ان اساتذہ کا مشاہدہ ہیکہ ابتدائی درجات میں ان کا کم وبیش آدھا وقت بیٹھنے کا طریقے، گفتگو کے سلیقے اور ساتھیوں سے برتاؤ کا اصول سکھانے میں

گذر جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ ان کا زیادہ وقت مجلس کی تہذیب سے واقف کرانے میں ضائع ہوجاتا ہے۔

اساتذہ کی رائے میں ان بچوں کو مناسب طریقہ سے پڑھایا تو جاسکتا ہے۔مگر انہیں اس قسم کا اور معیار کا سامان فراہم نہیں کیا جاسکتا جو خوش حال بچے استعمال کرتے ہیں۔اور جنہیں پسماندہ بچے بھی حاصل کرنے کی چاہ رکھتے ہیں مگر حاصل نہیں کر پاتے ہیں۔اساتذہ کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ان بچوں کی رویہ اور برتاؤ ان کے اپنے خاندان کے رویوں اور عمل کا آئینہ دار ہے۔بچوں کی مادری زبان کے محاورے اساتذہ کو نہایت ناگوار گذرتے ہیں۔ان کی نظر میں یہ بچے گفتگو کے دوران یہ تمیز نہیں کر پاتے کہ وہ کس سے محو گفتگو ہے اور انہیں کس طرح بات کرنی چاہیئے ان کی گفتگو میں اساتذہ عزت و احترام کا فقدان محسوس کرتے ہیں۔اپنے ساتھیوں سے گفتگو کا انداز بھی تکلیف دہ محسوس کیا گیا ہے۔اساتذہ کا مشاہدہ ہے کہ ایسے طلباء کا گھریلو ماحول اکتساب کے موزوں نہیں ہیں۔ ان کے والدین ناخواندہ ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے گھر پر تعلیمی مدد حاصل نہیں ہو پاتی۔کمپیوٹر کے استاذ کے مطابق خوشحال گھرانوں کے بچوں کے پاس گھر میں کمپیوٹر ہے مگر پسماندہ بچوں کو ایسی کوئی سہولت قطعاً حاصل نہیں ہیں۔اس لئے یہ استاد ان بچوں کو کمپیوٹر سے متعلق گھر پر کیا جانے والا کوئی کام تفویض نہیں کرتے۔ یہ امر تحقیق سے بھی ظاہر ہے کہ محروم طبقہ سے تعلق رکھنے والے طلباء کی تدریسی ضروریات ان بچوں سے مختلف ہوتی ہیں جن کا تعلق باحیثیت گھرانوں سے ہوتا ہے۔اور اس فرق میں ایک بڑا رول بچوں کا ثقافتی پسِ منظر ادا کرتا ہے۔

یہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ باحیثیت لوگ غریبوں سے ملنے جلنے سے گریز کرتے ہیں اور انہیں نظر انداز کرتے ہیں۔مگر یہ پہلو بھی تحقیق طلب ہے کہ محروم طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے باثروت بچوں سے مخلوط ہونے میں کن دقتوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اس پہلو کے نفسیاتی اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نامور ماہر تعلیم کرشن کمار کا خیال ہے کہ باحیثیت والدین اپنے بچوں کو اس ماحول میں پرورش دینا چاہتے ہیں جو غربت اور غریبی کے اثر سے آزاد ہو۔ ایک زمانہ تھا جب عام ماحول سے الگ رکھتے ہوئے بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا جاتا تھا۔اسی تصور نے جداگانہ نجی اسکولوں کے قیام کے عمل کو جلا بخشی وقت گذرا تو مخلوط ماحول کی اہمیت کو سمجھا گیا اور تعلیم مین حقیقی ماحول کی افادیت کو سراہا گیا۔ یورپ اور امریکا میں مخلوط اسکولوں کے قیام کی طرف پیش رفت ہوئی تحریکیں اور احتجاجات نے کم وبیش ایک صدی گذر جانے کے بعد مخلوط اسکولوں کے

قیام کے لئے سرکاروں کو مجبور کیا یہ ایک مشکل عمل تھا اور اسی عمل کو .RTE Act کے ذریعے ہندوستان میں بھی قائم کرنے کی ایک کاوش ہے۔

نجی تفویض کو اکثر اوقات تکلیف دہ عمل تصور کیا جاتا ہے۔ مگر تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے کہ گھر پر سیکھنے کا سلسلہ اسکول میں سیکھنے کے سلسلہ کو تقویت بخشتا ہے اور بہتر بناتا ہے ہوم ورک گھر اور اسکول کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے نتیجہ میں والدین بھی تعلیمی عمل میں متحرک کردار ادا کرتے ہیں۔ تحقیقات میں یہ بھی ثابت ہے کہ والدین کی بچوں کے تعلیمی عمل میں شمولیت اسکول میں کامیابی کی ضامن ہے۔ جو بچے ماں باپ کی شمولیت سے گھر پر مستفید ہوتے ہیں ان کی کارکردگی ان طلباء سے بہتر ہوتی ہے جو اس سے محروم ہے۔ اس لئے اس عمل میں استاد، بچہ اور والدین تینوں کو ہی اپنا فرض سمجھتے ہوئے ہوم ورک میں تعاون دینا ضروری ہے۔ زیر مطالعہ اسکولوں کے اساتذہ میں یہ پایا کہ پسماندہ طبقوں کے طلباء ہوم ورک مناسب طریقے سے نہیں کر پاتے وجہ ظاہر ہے کہ انہیں والدین کی ضروری مدد نہیں مل پاتی۔ کیونکہ وہ ناخواندہ ہیں یعنی پسماندہ طبقوں کی بچوں کی تعلیم میں والدین کا عدم اشتراک ایک ایسا منفی پہلو ہے جس کو اسکول بھی پورا نہیں کر پارہا ہے۔

ایک استاذ کا خیال ہے کہ ماہرِ تعلیم نفسیات کو پسماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے بچوں کی نفسیاتی کیفیت کو سمجھ کر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ان طلباء کی نفسیات کو یہ اسکیم کیسے متعین اور متاثر کرتی ہے۔ ایک دوسرے ماہرین فیاض بھٹ ((2012 کے مطابق اسکولی تعلیم کو سماجی پسِ منظر سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ پڑھنے اور پڑھانے والے طبقاتی انفرادیت کے حامل رویوں، عقیدوں، عادتوں اور رسم ورواج سے معمور ہوتے ہیں۔ نجی اسکولوں کی اپنی ایک ثقافت ہوتی ہے اور یہ ثقافت خوشحال گھرانوں کے بچوں کی ثقافت کے مطابق ہوتی ہے۔ غریب گھرانوں کے بچے اس ماحول میں انجان اور غیر محسوس کرتے ہیں۔ فیاض بھٹ کے مطابق یہ مخلوط کلاس روم کا تجربہ ہمت افزاں نہیں ہیں۔ یہاں جنس، برادری وغیرہ کی بنیاد پر تفریق برتی جاتی ہے۔ حالانکہ ہمارا آئین اس قسم کی تفریق کو ختم کرنے کے لئے قانون فراہم کر چکا ہے۔ مگر میدان عمل میں یہ آج بھی قائم ہے۔ ان حالات میں غریب اور محروم بچوں کے ساتھ تفریقی رویہ کو کیونکر اور کیسے یکسر ختم کیا جاسکتا ہے۔

اسکولوں میں .RTE Act کے تحت داخلہ پانے والے بچوں کا نام مشتہر کرنے کا رواج ہے اس سے باحیثیت طبقے سے تعلق رکھنے والے بچے بخوبی جان جاتے ہیں کہ یہ غریب و پسماندہ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور یہ ہی عمل بچوں کو تختۂ مشق بنا دیتا ہے۔ دوسرے انکے تئیں

اساتذہ کا رویہ بھی عام طور پر مثبت اور ہمدردانہ نہیں پایا گیا۔ مثلاً ایک استاذ نے درجے میں وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی چیزوں کی چوری کی وارداتوں کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے پسماندہ طبقوں کے پاس سے ان چیزوں کے برآمدگی کو خاص طور سے ذکر کیا۔

RTE Act. سماجی ہمہ آہنگی کے قیام کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔ کوٹھاری کمیشن کی کومن اسکول کے قیام کرنے کی تجویز پر عمل نہ ہوسکا نئے قانون نے ۲۵ ر فیصدی سیٹیں محفوظ کر کے اسی سمت میں پیش رفت کی ہے۔ مگر زمینی حقیقتوں کی نشاندہی سے یہ قدم بھی ہمت افزاں محسوس نہیں ہوتا۔ اسکول اور اساتذہ نے اس اسکیم کو بے دلی سے اپنایا ہے اور تا حال یہ شمولیت کے تصور سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں اس اسکیم کو زمین پر عملی جامہ پہنانے والے کردار مسئلہ سمجھ رہے ہیں اور پیدا ہونے والی دقتوں کو بڑھا چڑھا کر تصور کرتے ہیں اساتذہ کو اس اسکیم میں ڈھالنے کی ضرورت لازمی ہے۔ آج بھی درکار انسانی وسائل کا فقدان ہے طلباء کی نظر میں اسکیم لازمی اور فائدہ مند ہے۔ مگر اداروں کے لئے یہ آج بھی بوجھ ہے طلباء کے تئیں رویہ میں سدھار کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆

Makhmoor Saeedi:Jadid shairi ke tarjuman by Dr.Farkhanda Zameer
(Associate Professor,dept.of urdu.SPCGCA,Ajmer) cell-7891623509
ڈاکٹر فرخندہ ضمیر (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ پی۔جی۔کالج، اجمیر)(Banat)

مخمور سعیدی: جدید شاعری کے ترجمان

غزل نے ہر دور میں یہ ثبوت فراہم کیا ہے کہ وہ اردو کی سب سے مقبول، سب سے زیادہ جان دار، سب سے زیادہ توانا، سب سے زیادہ ہمہ گیر صنف سخن ہے۔ ہر زمانے میں اس نے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ خواہ کتنی ہی مخالفت کیوں نہ ہوئی ہو وہ پہلے سے زیادہ اب وتاب، شان وشوکت اور طاقت وتوانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے جڑوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے نئے موسموں میں نئے برگ وبار پیدا کئے۔ نئی ہواؤں کے لمس سے نئے گل کھلائے اور نئی خوشبوئیں بکھیری ہیں۔ قلی قطب شاہ سے لے کر اج تک غزل کی تاریخ گواہ ہے کہ بنیادی روایات اور عصری تغیرات کا حسین امتزاج غزل میں پایا جاتا ہے۔

جدید شاعری اس لیے جدید ہے کہ ظاہر و باطن، احساس واظہار، فکر وفن دونوں اعتبار سے اج کے زمانے کی چیز ہے۔ جدید غزل میں پرانے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں اور نئے مضامین بھی، جو چیز غزل کو جدید بتاتی ہے۔ وہ شعراء کے سوچنے کا ڈھنگ اور اظہار کا طریقہ ہے۔ ان کا طرز احساس بھی نیا ہے اور طرزِ اظہار بھی، نئے رجحانات غیر محسوس طریقہ پر ابھرتے ہیں اور نشوونما پاتے ہیں۔ تبدیلی ایک لازمی عمل ہے۔ ہر عہد کا ادبی مزاج ہوتا ہے۔

جدید شعراء کے یہاں بنیادی طور پر جدیدیت بت شکنی کا دوسرا نام تھا۔ اس دور کے شعراء سائنسی انداز فکر سے متاثر ذہن ادب میں نئے جزیرے تلاش کر رہے تھے۔ اس نئی شاعری کی بنیاد حالی کے ہاتھوں رکھی گئی اس پر اقبال نے بلند عمارت تعمیر کی۔ جگر، جوش، فراق، فیض، جذبی، مجاز، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اختر الایمان وغیرہ نے اس عمارت کو مضبوطی عطا کی اور اس میں ایک اور اہم نام کا اضافہ ہوا، جس نے دور جدید میں اپنی شاعری، اپنے اہنگ سے اردو شاعری کو تازگی اور توانائی بخشی۔ اس شاعر کا نام مخمور سعیدی تھا، جس نے پورے ہندوستان میں راجستھان کا نام روشن کیا۔ اختر شیرانی کے بعد اگر کسی راجستھانی شاعر کو مقبولیت ملی تو وہ مخمور سعیدی صاحب تھے۔

مخمور سعیدی صاحب نے جب اپنی شاعری کا اغاز کیا۔اس میں قدیم اور جدید کا ٹکراؤ تھا، لیکن مخمور سعیدی صاحب نے اس میں بھی اپنی راہ نکال لی اور قدیم وجدید دونوں روایتوں کی پاسداری کی۔اپ کے کلام میں ندرت فکر بھی ہے اور ندرت احساس بھی۔ان کے یہاں زندگی کے بدلتے ہوئے زاویوں کے ساتھ انداز فکر بھی بدلتا رہتا ہے، کیونکہ جدید دور کے شاعروں میں بے یقینی، مایوسی، شکستہ خوردگی، رجائیت، ایک موہوم سے نصب العین کی جستجو، شکست فریب، شکست عزائم، کرب لاسمتی، جیسے موضوع نمودار ہوئے۔جدید دور کے شعرا میں تنہائی کا کرب جا بجا جھلکتا ہے۔مخمور سعیدی صاحب کے یہاں بھی یہ کرب نمایاں طور پر نظر اتا ہے۔

اپنے اپنے دکھوں کی دنیا میں میں بھی تنہا ہوں وہ بھی تنہا ہے

ان کی شاعری میں حقیقت کی عکاسی، مادی زندگی کی حقیقتوں کا ادارک، عصری اگہی کے دائرے میں اتے ہیں۔مخمور سعیدی کی شاعری میں یہی عصری اگہی انھیں جدید رجانات کا پیامبر بناتی ہے۔وہ جدیدیت کے اہم سخن ور ہیں۔

پتھر کے سب مکاں ہیں ریشم کے سب مکیں اب تک یہ اجتماع تو دیکھا نہ تھا کہیں
چہروں پہ غم کی دھول سہی دل ہیں ائینہ اس پتھروں کے شہر کا حاصل ہیں ائینہ

مخمور سعیدی صاحب کے یہاں رومانویت، روایت، جدیدیت تک کے مختلف رجحانات کا عکس واثر دیکھنے کو ملتا ہے۔لیکن انھوں نے ایک مقام فکر پر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے وجود کے فطری احساس کو شعری اظہار واہنگ عطا کرتے رہے ہیں۔اس لیے وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ان کے اولین مجموعہ ''گفتنی'' میں رومانیت اور روایت کا رجحان غالب ہے۔لیکن بعد میں ان کی شاعری میں فکرو احساس کا عنصر نمایاں طور پر نظر اتا ہے۔

لے کے اس پار نہ جائے گی جدا راہ کوئی بھیڑ کے ساتھ ہی دلدل میں اترنا ہوگا
کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیاں

ان کے یہ اشعار معاشرے کی بحرانی اور انتشاری کیفیات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔شکست وریخت کا احساس نئے شعری پیکر میں ڈھل کر سامنے اجاتا ہے۔عشق غزل کا بنیادی موضوع رہا ہے۔جدید شعراء کے عشق کا تصور بھی جدا ہے۔اس میں وہ روحانیت و رومانویت نہیں جس کے سہارے کلاسیکی غزل قلب وروح کے تار جھنجھوڑ دیتی ہے۔جدید دور کے عشق کی پہچان اس کی ارضیت ،مادیت اور واقفیت ہے جو کہ حالات اور تہذیبی عوامل کی دین ہے۔

دورجدید کے عشق کی کیفیات میں تصنع امیز رسمی انداز نہیں، بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کے حقیقی جذبات واحساسات کی دلکش عکاسی ہے۔مخمور سعیدی صاحب کے یہاں اس نازک جذبے کی شدت زندگی کے بدلتے ہوئے زاویوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔

خود حسن سے بھی بچ کے گزرنا پڑا جہاں اٰئے وہ مرحلے بھی محبت کی راہ میں

مخمور سعیدی کے یہاں عشق کا جذبہ حسین لطافتوں کا ہی احساس نہیں دلاتا بلکہ حالات کی سنگینی کا بھی احساس دلاتا ہے۔اس جذبہ میں زمانے اور حالات پر ہلکا سا اشارہ کرتے ہیں۔

تھے سفینے تو بہت پار اترنے والے ناخداؤں نے مگر پار اتارے کم ہیں

کھیل سمجھا نہ تیرے پیار کو ہم نے ورنہ ہم کوئی کھیل جو کھیلے ہیں تو ہارے کم ہیں

مخمور سعیدی صاحب کی شخصیت اتنی قد اور ہے کہ ان کے کلام میں رومانویت سے لے کر جدیدیت، مابعد جدیدیت تک کے مختلف رجحانات کا عکس نظر اتا ہے۔اسی لیے وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھ سکے۔ان کے یہاں مابعد جدید غزل کے وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔مثلاً ان کے یہاں اعتبار عقیدے اور اقدار کی شکست کا رجحان نہیں ملتا ہے۔ بلکہ ان کے یہاں اقدار کے حوالے سے ماضی کی طرف واپسی اور روحانیت کا رجحان ملتا ہے۔انھوں نے نئے موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ان کے یہاں نئے شعری پیکر اور استعارے ایک علامتی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے ائینہ،خواب اور شکست خواب،شہر،جنگل،خزاں،صحرا،سمندر،دریا،زمین،کربلا وغیرہ۔

ہم دشت کربلا میں صدا تشنہ لب رہے بہتا تھا گرچہ پاس ہی دریا فرات کا

واقعہ کربلا کی اشاریت بطور استعارہ ان کے یہاں اس لیے استعمال ہوئی ہے کہ شاید اج کے انسان کی مجبوری ولاچاری سے رشتہ جوڑنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف اج کے رنج وغم کو غم امام حسین سے وابستہ کر کے قدرے راحت وتسلی کی تلاش۔مخمور سعیدی نے عالمی اور سیاسی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔اپ نے نظمیں اور غزلیں دونوں اصناف پر طبع ازمائی کی ہے۔ جہاں ان کو غزل کی تنگ دامانی سے شکایت ہوئی وہاں انھوں نے نظم کا دامن تھام کر اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔اپ کو دونوں اصناف پر قدرت حاصل ہے۔

☆☆☆

Constitutional status of urban local bodies and challenges by Dr. Syed Najiullah(Associate Prof. dept.of public administration school of arts and social sciences,MANUU,Hydrabad)cell-9705704939

ڈاکٹر سید نجی اللہ (اسوسیٹ پروفیسر، شعبہ نظم ونسق عامہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد)

شہری مقامی اداروں کی دستوری حیثیت اور مسائل

ہندوستان میں شہریانہ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان کی ایک تہائی آبادی اب شہروں میں بستی ہے۔ شہری آبادی سال 2001 میں کل آبادی کا 27.8 فیصد تھی۔ سال 2011 میں بڑھکر 31.2 فیصد ہوگئی ہے۔ تعلیم، بہتر روزگار کے مواقع اور دیگر وجوہات سے دیہاتوں سے شہروں کو نقل مکانی بڑھ رہی ہے۔ ابادی میں اضافے کی وجہ سے شہروں میں امکانہ، صفائی، آمد و رفت اور دیگر مسائلا بھر رہے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے اور بہتر شہری سہولیات فراہم کرنے کے لئے فعال شہری مقامی اداروں کی ضرورت ہے۔ اسمضمونمیں ہندوستان میں شہری مقامی حکومتیل ساخت اور فرائض واختیارات ا74ویں دستوریترمیم یتناظر میں جائزہلیا گیا ہےاوران اداروں ودرپیش مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ملک کی منصوبہ بند ترقی میں اور فیصلہ سازی میں عوامی شراکتداری کو یقینی بنانے کے لئےیاور لامرکوزیت کو فروغ دینے کے لئے نچلی سطح پر جمہوری اداروں کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی مقصد سے شہری مقامی حکومتوں کو قائم کیا گیا ہے تاکہ مقامی عوام اپنی ضرورتوں کے مطابق منصوبے بنائیں اورانکے نفاذ اور نگرانی میں بھی حصہ لے سکیں۔ اس کیعلاوہ سماج کے پچھڑے، کمزور اور پسماندہ طبقات کو اور آبادی میں نصف حصہ رکھنے والی خواتین کو جمہوری عمل میں شامل کرنا اور انکی قائدانہ صلاحیت کو فروغ دینے کے لئے بھی شہری مقامی اداروں کو مضبوط کرنا ضروری ہے۔ قدیم ہندوستانکی تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت شہریانہ اور شہروں کی منصوبہ بند ترقی ہے۔ برطانوی دور میں ایک منظم شہری مقامی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی۔ 1688ء میں مدراس میں پہلا میونسپل کارپوریشن قائم کیا گیا۔ 18 مئی 1882ء ہندوستان کی مقامی حکومت کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔ اس دن لارڈ رپن

نے ایک قرارداد جاری کیا جس کے ذریعہ ہندوستان میں حقیقی معنی میں خودمختار مقامی حکومت کی بنیاد پڑی۔اس قرارداد کو مقامی حکومت کا ماگنا کارٹا کہا جاتا ہے۔

شہری مقامی ادارے۔مابعد آزادی: آزادی کے بعد شہری مقامی اداروں کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔سال 1948ء میں لوکل فینانس انکویری کمیٹی نے مقامی اداروں کے کام اور انکے مالی وسائل کا جائزہ لیا اور کئی سفارشات پیش کئے۔اسکے علاوہ کئی کمیٹیاں مقامی حکومت کے مختلف امور کا جائزہ لینے کے لیے بنائے گئے اور انکی سفارشات کے مطابق مقامی حکومت میں اصلاحات کرتے گئے۔1950ء میں مرکزی حکومت نے سنٹرل کونسل آف لوکل سلف گورنمنٹ قائم کیا۔اس کمیٹی نے میونسپل اداروں کا نظم ونسق،فرائض واختیارات اور دیگر امور کا مطالعہ کیا۔اس کمیٹی کے سفارشات کے مطابق میونسپل اداروں کے انتظامیہ میں کئی اصلاحات پر عمل کیا گیا۔سال 1985ء میں مرکزی حکومت نے شہریانہ کے بڑھتے مسائل پر غور کرنے کے لئے نیشنل کمیشن آن اربنیزیشن کا قیام عمل میں لایا۔اس کمیشن نے 1988ء میں پیش کردہ اپنی رپورٹ میں شہریانہ کے مسائل کو حل کرنے کے لئے میونسپل اداروں کو موثر بنانے پر زور دیا اور شہری مقامی اداروں کو دستوری حیثیت دینے کی تجویز پیش کی۔

دستوری توضیحات۔74ویں دستوری ترمیم:

دستور ہند میں مقامی حکومتوں کو ریاستی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔چنانچہ دستور کی 7 ویں جدول کی فہرست II ریاستی فہرست میں نمبر 5 پر مقامی اداروں سے متعلق امور کو شامل کیا گیا ہے۔اسکے علاوہ دستور کی کسی بھی دفع میں شہری مقامی حکومتوں کا ذکر نہیں تھا۔اس کمی کو دور کرتے ہوئے 1992ء میں پارلیمنٹ نے میونسپل اداروں کے لئے 74ویں دستوری ترمیم کو منظور کیا جو سال 1993ء سے عمل میں آیا۔74ویں دستوری ترمیم 1993 کے ذریعہ میونسپل اداروں میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔اس ترمیم سے شہری مقامی اداروں کو دستوری حیثیت عطا کی گئی۔اس ترمیم کے ذریعہ دستور میں حصہ 9A کے تحت دفعات 243P تا 243ZG میں شہری مقامی اداروں سے متعلق تمام تفصیلات کو درج کیا گیا ہے۔اسی کے ساتھ دستور میں 12واں جدول بھی شامل کیا گیا جس میں میونسپل اداروں کے 18 اختیارات کی فہرست دی گئی ہے۔

شہری مقامی اداروں کی ساخت: 74ویں دستوری ترمیم کے ذریعہ پورے ہندوستان میں یکساں طور پر میونسپل ادارے قائم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔چنانچہ دفع 243Q کیمطابق تین قسم کے میونسپل

اداروں کو قائم کیا گیا ہے۔عبوری علاقی یعنی دیہی علاقے سے شہری علاقے میں تبدیل ہونے والے علاقوں کے لئینگر پنچایت، چھوٹے شہری علاقوں کے لئیمیونسپل کونسل اور بڑے شہری علاقوں کے لئیمیونسپل کارپوریشن تشکیل دئے گئے ہیں۔شہری آبادی میں اضافے کے ساتھ ہی ہندوستان میں شہروں کی تعداد میں اضافہ ہورہا ہے۔اسی کے ساتھ شہری مقامی اداروں میں بھی مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ نیتی آیوگ کے اعداد وشمار کے مطابق سال 2021ء میں ہندوستان میں قانونی طور پر کل 4041 شہری علاقے ہیں۔ان کے علاوہ 3892 ایسے شہری علاقے ہیں جنہیں مردم شماری کے مطابق شہری علاقے شمار کیا گیا ہے۔اس طرح کل 7933 شہری علاقے ہیں، جن میں میونسپل کارپوریشن، میونسپل کونسل یا بورڈ اور نگر پنچایت شامل ہیں۔

میونسپل کارپوریشن: پانچ لاکھ سے زیادہ آبادی والے بڑے شہروں کے لئے میونسپل کارپوریشن قائم کیا جاتا ہے۔ ہر شہر کو انکی آبادی کے مطابق میونسپل وارڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر وارڈ سے ایک میونسپل کارپوریٹر منتخب ہوتا ہے۔تمام منتخب کارپوریٹرس اپنے میں سے ایک کو میئر منتخب کرتے ہیں۔اسی طرح ڈپٹی میئر کا بھی انتخاب عمل میں آتا ہے۔اسکے علاوہ دو یا تین ارکان کو اقلیتی طبقات سے نامزد کیا جاتا ہے، جنھیں کوآپٹیڈ ممبر کہا جاتا ہے۔مقامی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ بھی با اعتبار عہدہ میونسپل کارپوریشن کے رکن ہوتے ہیں۔ریاستی حکومت میونسپل کمیشنر کا تقرر کرتی ہے جو کہ ایک IAS آفیسر ہوتا ہے۔

میونسپل کونسل: پچاس ہزار سے پانچ لاکھ آبادی والے شہروں کے لئے میونسپل کونسل یا میونسپل بورڈ قائم کیا جاتا ہے۔ ہر میونسپل کونسل کو اس کی آبادی کے مطابق 25 سے 50 تک میونسپل حلقے یعنی وارڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر میونسپل وارڈ سے ایک میونسپل کونسلر منتخب ہوتا ہے۔میونسپل کونسلرس اپنے میں سے ایک کو میونسپل چیئر پرسن یعنی صدرنشین کی حیثیت سے منتخب کرتے ہیں۔اسی طرح ایک میونسپل وائس چیئر پرسن یعنی نائب صدرنشین کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔اسکے علاوہ دو یا تین ارکان کو اقلیتی طبقات سے نامزد کیا جاتا ہے، جنھیں کوآپٹیڈ ممبر کہا جاتا ہے۔مقامی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ بھی با اعتبار عہدہ میونسپل کونسل کے رکن ہوتے ہیں۔ریاستی حکومت میونسپل کمیشنر کا تقرر کرتی ہے۔

نگر پنچایت: عبوری علاقیعنی دیہی علاقے سے شہری علاقے میں تبدیل ہونے والے علاقوں کے لئینگر پنچایت قائم کیا جاتا ہے۔اسے بعض ریاستوں میں ٹون پنچایت بھی کہتے ہیں۔ان کی آبادی 20 ہزار سے 50 ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ ہر نگر پنچایت کو اسکی آبادی کے مطابق 10 سے 20 تک حلقے

یعنی وارڈوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر وارڈ سے ایک وارڈ ممبر منتخب ہوتا ہے۔ وارڈ ممبر اپنے میں سے ایک کو نگر پنچایت کے صدر کی حیثیت سے منتخب کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک نائب صدر کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ مقامی رکن اسمبلی اور رکن پارلیمنٹ بھی با اعتبار عہدہ نگر پنچایت کے رکن ہوتے ہیں۔ ریاستی حکومت ایکزیکیٹیو آفسر کا تقرر کرتی ہے۔

دیگر شہری مقامی ادارے: اس کے علاوہ کنٹونمنٹ بورڈ، نوٹیفیڈ ٹون ایریا اور پورٹ ٹرسٹ ایریا کے نام سے بھی مختلف قسم کے شہری مقامی ادارے پائےجاتے ہیں۔ البتہ انکا ذکر دستور کی 74 ویں ترمیم میں نہیں کیا گیا ہے۔ کنٹونمنٹ بورڈ شہروں سے متصل فوج کی چھاؤنی کے انتظام کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اس کا سربراہ بریگیڈیر یا اسکے برابر رینک کا فوجی آفسر ہوتا۔ کنٹونمنٹ علاقے کو چند انتخابی حلقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر حلقے سے ایک وارڈ ممبر منتخب ہوتا ہے۔ ان ممبروں میں سے ایک کو نائب صدر نشین کی طور پر منتخب کیا جاتا ہے۔ میونسپالٹی کے مقابلے میں کنٹونمنٹ بورڈ کے منتخب نمائندوں کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ فوجی آفسر حقیقی اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔

اسی طرح کسی بھی بڑے صنعتی ادارے کے اطراف واکناف بسنے والی آبادی کے شہری مسائل کو حل کرنے کے لئے نوٹیفیڈ ٹون ایریا بورڈ قائم کیا جاتا ہے۔ اس بورڈ کے سربراہ کا تقرر صنعتی ادارے کے انتظامیہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ اسکو مشورہ دینے اور مدد کرنے کے لئے صنعتی بستی سے چند نمائندوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ بورڈ اس علاقے کی شہری ضروریات جیسے پینے کا پانی کی سربراہی، صفائی کا انتظام، سڑکیں اور تفریح کے لئے پارک وغیرہ کا انتظام کرتا ہے۔ کسی بڑے بندرگاہ سے متصل آبادی کو شہری سہولیات فراہم کرنے کے لئے پورٹ ٹرسٹ ایریا بورڈ قائم کیا جاتا ہے۔ اسکے سربراہ کا تقرر پورٹ ٹرسٹ کرتا ہے۔

درج فہرست ذات، قبائل اور خواتین کے لئے تحفظات: دستور کی دفع 243T کیمطابق ہر ایک میونسپالٹی میں درج فرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو انکی آبادی کے مطابق تمام وارڈ ممبر اور میئر یا صدر نشین کے عہدوں میں نشستیں محفوظ کی جائیں گی۔ ان میں سے نصف نشستیں درج فروست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی خواتین کے لئے مختص کی جائیں گی۔

اسی طرح ہر ایک میونسپالٹی میں وارڈ ممبر اور میئر یا صدر نشین کے عہدوں میں پچاس فیصد نشستیں خواتین کے لئے محفوظ کی گئی ہیں۔ اسکے علاوہ پسماندہ طبقات کو بھی تحفظات فراہم کرنے کے لئے ریاستی حکومتیں قانون بنا سکتی ہیں۔

میونسپل اداروں کی میعاد: دستور کی دفع 243U کیمطابق میونسپالٹی کی میعاد پانچ سال ہوگی۔ ہر میونسپالٹی کی پانچ سال کی میعاد ختم ہونے کے بعد نئی میونسپالٹی تشکیل دینے کے لئے انتخاب کرانا لازم قرار دیا گیا ہے۔انتخاب کرانے میں چھ مہینے سے زیادہ تاخیر نہیں کی جاسکتی۔

میونسپل اداروں کی رکنیت کے لئے اہلیت: دستور کی دفع 243V کیمطابق 21 سال کی عمر کا ہر فرد میونسپالٹی کے انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے۔البتہ میونسپالٹی کی رائید ہندوں کی فہرست میں اسکا نام درج ہونا ضروری ہے۔اسکے علاوہ ریاستی سطح پر قوانین کے ذریعے اہلیت کیمختلف اصول طے کئے گئے ہیں۔اکثر ریاستوں میں دو سے زیادہ اولاد رکھنے والے افراد میونسپل انتخابات میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔اسی طرح میونسپالٹی کے ٹیکس نہ ادا کرنے والا شخص بھی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ذہنی معذور افراد بھی اہل نہیں ہیں۔ ہریانہ اور راجستھان جیسے چند ریاستوں میں میونسپل انتخابات میں حصہ لینے کے لئے متعین کردہ تعلیمی قابلیت رکھنا ضروری ہے۔

میونسپل اداروں کے اختیارات ۔12واں جدول: میونسپل ادارے شہری علاقوں کی مجموئی ترقی کے لئے کام کرتے ہیں۔دستور کی دفع 243W کیمطابق معاشی ترقی اور سماجی انصاف کو حاصل کرنے کے لئے منصوبے بنانا اور انکی موثر عمل آوری ان اداروں کی ذمہ داری ہے۔74 ویں ترمیم کے ذریعہ میونسپل اداروں کے اختیارات کو دستوری حیثیت عطا کی گئی ہے۔اس کے لئے دستور میں 12 واں جدول شامل کیا گیا ہے جس میں 18 امور پر میونسپل اداروں کو اختیار دیا گیا ہے۔

میونسپل اداروں کے مالی اختیارات: دستور کی دفع 243X کیمطابق ہر میونسپلیٹی کو اپنے دائرے میں ٹیکس، محصول، راہداری اور فیس لگانے، وصول کرنے اور تصرف کرنیکا اختیار ہے۔ریاستی حکومت کے ذریعے لگائے اور اصول کئے ہوئے ٹیکس میونسپالٹی کے تصرف کے لئے تفویض کئے جاتے ہیں۔ ریاستی مجتمہ فنڈ سے بھی میوسپالٹیوں کو رقم مختص کی جاتی ہے۔ ریاستی مالیاتی کمیشن :دستور کی دفع 243Y کیمطابق ریاستی مالیاتی کمیشن میونسپالٹیوں کا بھی جائزہلیگا اور حسب ذیل فرائض انجام دے گا۔

1. ریاست کے ذریعہ اکٹھا کئے گئے ٹیکس، محصول، راہداریوں اور فیسوں کی خالص آمدانیوں کی ریاست اور میونسپالٹیوں کے درمیان تقسیم کریگا۔
2. ریاست کے جانب سے میونسپالٹیوں کے تصرف کے لئے تفویض کئے جانے والے ٹیکس، محصول، راہداریوں اور فیسوں کا تعین کرے گا۔

3. میونسپالٹیوں کی مالی حالت کوسدھارنے کے لئےضروری اقدامات کی سفارش کرے گا۔

4. میونسپالٹیوں کے مستحکم مالیات کے مفاد میں کمیشن کے حوالے کئے گئےکسی دوسرے معاملے کے بارے میں گورنر کوسفارش کرے گا۔

مالیاتی کمیشن اپنے سفارشات کی سالانہ رپورٹ گورنر کوپیش کرے گا۔اس رپورٹ کوگورنر اسکی سفارشات پر کی گئی کاروائی کی وضاحتی یادداشت سمیت ریاست کی قانون ساز اسمبلی میں پیش کروائیگا۔

میونسپالٹیوں کےحسابات کا آڈٹ: دستور کی دفع 243Z کے مطابق ہرمیونسپالٹی کیلئےضروری ہے کہ وہ اپنی آمدنی اورخرچ کا حساب رکھے اور اسکی تنقیح (Audit) کا اہتمام کرے۔اسکے لئے ریاست کی قانون ساز اسمبلی ضروری قانونی کاروائی کریگی۔اس کے ذریعہ میونسپالٹیوں میں شفافیت کوفروغ دینے اور بدعنوانیوں کوروکنے کےاقدامات کئے گئے ہیں۔

میونسپالٹیوں کے انتخابات: مقامی اداروں کے انتخابات کےعمل کو باقاعدہ بنانے اوراس میں بہتری لانے کے لئے دفع 243K کے تحت ہر ریاست میں ریاستی انتخابی کمیشن قائم کیا گیا ہے۔ دفع 243ZA کےتحت یہ کمیشن میونسپالٹیوں کے لئے کرائے جانے والےسبھی انتخابات کے لئےفہرست رائیدہندگان کی تیاری اورمیونسپالٹیوں کے سبھی انتخابی عمل کی نگرانی، ہدایت اورکنٹرول کے فرائض انجام دیگا۔ضلع پلاننگ کمیٹی: ہندوستان میں منصوبہ بندی کاعمل پلاننگ کمیشن کےتحت تھا۔74ویں دستوری ترمیم کےذریعہ پہلی مرتبہ منصوبہ بندی کےعمل کونچلی سطح کےانتظامی اکائی سے جوڑا گیا ہے۔ اس کے لئے دستور کی دفع 243ZD کےتحت ضلع پلاننگ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔اس ضلع منصوبہ بندی کمیٹی میں 4\5 ارکان ضلع پنچایت اورمیونسپالٹیوں سے لیے جائیں گے۔ان ارکان کی نمائندگی ضلع میں دیہی اورشہری علاقوں کی آبادی کےتناسب کےمطابق ہوگی۔

ضلع منصوبہ بندی کمیٹی ضلع سطح پر پنچایتوں اور میونسپالٹیوں کے ذریعہ تیار کئے گئے منصوبوں کومستحکم کرنے اور پورے ضلع کے لیےایک ترقیاتی منصوبہ تیارکرنے کی ذمہ دارہے۔اسکے علاوہ یہ کمیٹی پنچایتوں اورمیونسپالٹیوں کے درمیان مشترک مفاد کے معاملات،امکن، پانی اوردوسرے طبیعاتی اورقدرتی وسائل میں حصہ داری، بنیادی ڈھانچہ کی ترقی اور ماحول کے تحفظ جیسے امور پر دستیاب مالیاتی ودیگروسائل کےمطابق منصوبہ بندی کرے گی۔

میٹروپولیٹن پلاننگ کمیٹی: دستور کی دفع 243ZE کے مطابق ہر ایک میٹروپولیٹن علاقے کے لئے

ترقیاتی منصوبہ تیار کرنے کے لئے ایک میٹروپولیٹن پلاننگ کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ اس کمیٹی میں کم سے کم دو تہائی ارکان میٹروپولیٹن علاقے کے میونسپالٹیوں کے اور پنچایتوں کے منتخب ارکان سے لئے جائیں گے۔ میٹروپولیٹن منصوبہ بندی کمیٹی میٹروپولیٹن علاقے کے لئے منصوبہ تیار کریگی۔ اس منصوبہ میں میونسپالٹیاں اور پنچایتوں کے منصوبوں کے ساتھ ساتھ امکن پانی اور دوسرے طبیعاتی اور قدرتی وسائل، بنیادی ڈھانچہ کی ترقی اور ماحول کے تحفظ کے منصوبوں کو بھی شامل کریگی۔ ان منصوبوں کی تیاری کے لئے معاشی امور میں مہارت رکھنے والے دیگر اداروں کے ساتھ اشتراک کرے گی۔ میٹروپولیٹن علاقے کی ترقی کے لئے بنائے گئےتمام منصوبوں کو ریاستی حکومت کو پیش کرے گی۔

شہری مقامی اداروں کے مسائل: 74 ویں دستوری ترمیم کے بعد شہری مقامی اداروں کہ رتبہ اور کارکردگی میں بہتری آئی ہے۔ اسکے باوجوکئی ایک مسائل کی وجہ سے شہری مقامی ادارے عوام کو جوابدہ اور بہتر قدمات فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ شہری مقامی اداروں کا سب سے بڑا مسئلہ اختیارات کی عدم تفویض ہے۔ دستور کے 12 ویں جدول میں دئے گئے اختیارات کو ریاستی حکومتیں میونسپل اداروں کو پوری طرح سے منتقل نہیں کیا ہے۔ ریاستی حکومتوں کی بیجا مداخلت کی وجہ سے ان اداروں کی خوداختیاری متاثر ہوئی ہے۔ ریاستی حکومتیں کسی نہ کسی وجہ سے میونسپل اداروں کے انتخابات کو وقت پر منعقد کرنے میں ٹال مٹول کرتی ہیں۔ انتخابات میں سیاسی جماعتوں کی شرکت کی وجہ سے مقامی سطح پر سیاسی رقابت میں اضافہ ہوا ہے جس سےمیونسپل اداروں کی کارکردگی پر منفی اثر پڑھ رہا ہے۔ منتخب نمائندے خاص کر خواتین اور پچھڑے طبقات سے تعلق رکھنے والے نمائندے علم اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے پوری طرح سے اپنے اختیارات کا استعمال نہیں کر پا رہے ہیں۔

وسائل کی قلت میونسپل ادروں کا ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔ ان اداروں کی مقامی محصول سازی سے ہونے والی آمدنی بہت کم ہوتی ہے۔ گوڈس اینڈ سرویس ٹیکس لاگو کرنے سے مقامی حکومتوں کا محصول وصول کرنے کا دائرہ اور بھی محدود ہوگیا ہے۔ ان کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے ریاستی اور مرکزی حکومتوں کی مالی امداد پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ شہری مقامی اداروں کے حساب کتاب اور انکی تنقیح پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے شہری مقامی اداروں میں شفافیت کا فقدان ہوتا ہے اور رشوت خوری عام ہوتی ہے۔ ان تمام وجوہات سے شہری مقامی ادارے اپنے طئے شدہ مقاصد حاصل کرنے میں اور عوام کو بہتر شہری سہولیات فراہم کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں۔

شہری مقامی اداروں کو با اختیار بنا کر اور مالی طور پر مضبوط کر کے بہتر نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اسکے علاوہ عوام کی شرکت اور مسلسل چوکسی ان اداروں کو فعال اور موئثر بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خاص کر 74 ویں دستوری ترمیم میں بتائے گئے امور پر پوری طرح سے عمل کر کے شہری مقامی اداروں کو درپیش مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

:References

Municipal Administration in India, Lakshmi Narayan Agarwal ,(1972)Avasthi, A., Publishers.

Introduction to Constitution of India, Gurgaon, ,(2015) Basu, Durga Das, LexisNexis .

Management of Urban Local government in India, ,(1946)Bhattacharya, Mohit, New Delhi, Uppal Book Store.

Municipal Finances in India, New Delhi, IIPA.,(1984) Datta, Abhijit,

Urban Development and Management, ,(2002)and Dhaliwal, S.S.,Goyal, S.L., Kolkata, Deep and Deep Publication.

Indian Administration, New Delhi, Orient Black Swan.,(2013)Maheshwari, S.R.,

Theory of Local Government, New ,(1982)and Ali, Mohd. Akbar,Muttalib, M.A., Delhi, Sterling Publishers Pvt Ltd.

Bharat ka Aain, Ministry of Law ,(2013)National Council for Promotion of Urdu, and Justice, Govt. of India, New Delhi.

History and Problems of Municipal Administration in India,,(2003)Parasher, P.N., Sons.&Sarup

Urban Local Government and Administration in India,,(1993)Sachdeva, Pradeep, Allahabad, Kitab Mahal.

☆☆☆

شہرت (افسانچہ) Shohrat(Afsancha)

by Arif Naqvi,Berlin (Ex.Urdu Lecturer,First post War Urdu Lecturer Humboldt University,Berlin,Germany.Lecturer Urdu,Hindi Language Institute,Berlin.Chairman Urdu Anjuman Berlin.European Writers Assosiation.Patron-European Literary Circle,International Young Urdu Scholars Anjuman(AYUSA) cell-0049-176-394-23087

عارف نقوی (برلن، جرمنی)

شہرت

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جن نعمتوں سے مالا مال کیا ہے ان میں شہرت بھی ہے۔ انسان شہرت مختلف طرح سے حاصل کر سکتا ہے: اپنے علم اور ذہانت کے بل بوتے پر، کوئی نئی سائنسی ایجاد کر کے، اداکاری یا مصوری کے میدان میں کرشمہ دکھا کر، کھیل کے میدان میں سنچری بنا کر یا درجنوں گول کر کے، باپ دادا کے نام کا فائدہ اٹھا کر اور ان سے رشتہ جتا کر چاہے وہ اصلی رشتہ ہو یا نہیں، پیسے خرچ کر کے اور ایک اچھا منیجر رکھ کر، دیارِ غیر میں جا کر اور وہاں سے اپنی تشہیر کرا کر یا کتابیں چھپوا کر اور سرکاری اداروں میں اپنے مخلصوں کو خوش کر کے یا کسی شہنشاہ کی شان میں گستاخانہ الفاظ لکھ کر اور جیل جا کر۔ کون ہے جسے اپنی جائز یا ناجائز شہرت پر خوشی نہیں ہوتی۔ لیکن یہی شہرت بعض اوقات مصیبت بھی بن جاتی ہے۔ کل جب میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا، جو آسمان ادب پر جگمگا رہا ہے تو وہ اپنی شہرت کا ماتم کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا:

’’میں تو اپنی شہرت سے عاجز آ گیا ہوں!‘‘ میں نے از راہ ہمدردی پوچھا: ’’بھائی بات کیا ہے؟ تم تو بہت سجن آدمی ہو۔ آگ بگولا کیوں ہو رہے ہو؟‘‘

کہنے لگا: ’’یار اب ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں مشین ہو گیا ہوں۔ اس کی الٹی سیدھی تحریروں پر قلم تراشی کرتا رہوں گا۔ اب دیکھو

کل حاجی بفاتی خان آئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک ہزار صفحات کا سفر نامہ لکھنے والے ہیں میں اس پر کچھ لکھ دوں۔ میں نے کہا کہ حاجی صاحب مسودہ دکھائیے۔ تو کہنے لگے وہ تو میں ابھی لکھوا رہا ہوں۔ بس آپ کے مقدمے کی کمی رہ گئی ہے۔ ایک دوسرے صاحب ہیں۔ کہتے ہیں میں آپ کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بس میرے بیٹے کے نام سے ایک کتاب لکھ دیجئے۔ ایک تمہارے ہم نام نے اب بوڑھاپے میں شاعری شروع کی ہے۔ ایک مصرعہ موزوں نہیں کر سکتے ہیں۔ پیچھے پڑے ہیں کہ میں ان کے دیوان پر مقدمہ لکھ دوں۔''

میرے دوست نے اور بھی بہت سی داستانیں سنائیں اور مجھ سے ہمدردی چاہی لیکن میں اپنا منہ لٹکائے بیٹھا سنتا رہا۔ اداس، خیالات میں ڈوبا۔ اچانک میرے دوست کو خیال آیا کہ میری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

''خیر چھوڑو اس سب کو۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اپنی سناؤ آج دس برس کے بعد کیسے آنے کی زحمت کی؟ کوئی نئی کتاب؟''

'' کچھ نہیں بس یونہی!'' اب میں ان سے کیا کہتا کہ میری آنے کی غرض تو بس یہ تھی کہ تم سے اپنی نئی کتاب کا پیش لفظ لکھا لوں!'' پھر اس نے خود ہی پوچھا: ''کیا موضوع ہے؟

''سوچتا ہوں اس بار فلسفے کے موضوع پر لکھوں۔ نام ابھی طے نہیں کیا ہے۔ انتساب میں تمھارے نام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔''

میرا دوست مسکرایا: ''ٹھیک ہے سمجھ گیا۔ اپنے ڈرائیور سے کہو مقدمہ اگلے ہفتے آ کر لے جائے۔'' یہ لو یہ گزک جے پور سے ایک 'فین' نے بھیجی ہے۔

اگلے ہفتے میرے دوست نے واقعی میری کتاب پر دس صفحات کا پیش لفظ لکھ کر بھیج دیا تھا۔ اس کے سات صفحات پر فلسفے کی تاریخ ہے۔ دو صفحات پر میرے دوست کا علم اور ایک صفحے پر میری پیدائش، شادی، اولادوں کے نام اور میری خصلتیں ہیں اور مبارکباد کے الفاظ اور دعائیں ہیں۔۔۔۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ کتاب کا کیا نام رکھوں اور کسی ایسے سے لکھواؤں جو مجھے بھی شہرت یافتہ بنوادے۔

☆☆☆

افسانے Afsane

Pahchaan,Khudsari& Gumrahi by Vehshi Syed(Srinagar)cell-9419012800

وحشی سعید (سرینگر)

پہچان

وہ اپنی انا کے سامنے اپنے مزاج کی خودسری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ کشمکش اس کی ذات کے لیے بڑی تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ اب وقت کے ساتھ یہ احساس بھی حاوی ہونے لگا کہ اپنے سرمایۂ حیات کا سب سے حسین بت خود مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس لمحے اس نے اپنے دل کو نیزہ کی نوک پر محسوس کیا۔

وہ ٹوٹتا رہا۔

آہستہ آہستہ خود سپردگی کا عنصر اس پر قابو پانے لگا۔ وہ جب اپنے بت کو چھونے لگا، بت نے کہا:

''تم کون؟''

''میں یوسف!''

اس نے بہت آہستہ سے بت کے کان میں کہا۔

''تم یوسف نہیں ہو۔۔۔۔۔!''

اور یوسف بے بسی سے رات کی سیاہی میں اپنے وجود کی پہچان کو گمنامی کے اندھیروں میں کھوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

خودسری

وہ رات لمبی اور اذیت ناک تھی۔ کبر کے جھرمٹ میں زندگی کی ساعتوں کو جب اس نے دم توڑتے ہوئے دیکھا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ کہیں کسی حسین شاہکار کی تکمیل کے لیے بھیانک اندیشے بھی زندگی کے ساجھی دار بنتے ہیں۔ وہ دیر تک اپنے دل کو آنے والی دلفریب آشاؤں سے بہلاتا

رہا۔ پھر اچانک کسی نے اسے خوابِ شیریں سے جگایا۔ وہ سفید گون پہنے ہوئے قدآور شخص اپنی آہنی آواز میں کہنے لگا۔

’’کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری خودسری تمہارے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔

لیکن۔۔۔۔۔

قدآور شخص نے آگے کہا:

’’شاہکار کا بننا تو دور کی بات ہے اب تو معمار بھی ٹوٹ گیا۔‘‘

وہ اندیشے جواب تک حقیقت سے بعید تھے اس نے اپنی خودسری سے ان میں جان ڈال دی۔

گمراہی

جب اس نے اپنے پاؤں ریشمی دبیز قالینوں پر رکھے تو یوں محسوس ہوا کہ جنت کا پہلا نشان ملا۔

وہ سنگ مرمر کے عالیشان محل میں اپنے ماضی اور حال کی ان گنت الجھنوں کو یاد کرنے لگا، جن سے فرار حاصل کرنے کے لیے جتن کر رہا تھا۔

اطلس اور کمخواب کے سجے ہوئے فرنیچر، بلور کے فانوس، چاندی کے برتن۔۔۔۔۔ جب یہ سب اس کی نظروں میں آ گئے تو اسے اپنے مستقبل کے ہولناک اندھیرے اور بھی گہرے ہوتے ہوئے نظر آنے لگے۔ شہنشاہی کرسی پر براجمان اپنے درعان کے نکلس سے کھیلتے ہوئے کہنے لگا:

یہ سب حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اپنی۔۔۔۔۔ آنکھوں کو خود ہی بینائی سے محروم کرنا ہوگا۔

لیکن۔۔۔۔۔ وہ بے بس آواز میں بول پڑا۔

’’سوچ ترقی کے لیے مضر ہے۔‘‘

وہ شخص کھڑا ہوا۔ اور اپنی آہنی سیف میں اس کی بینائی کو محفوظ رکھ لیا۔ اب وہ اندھا آدمی اپنی گمراہی پر آنسو بھی نہیں بہا سکتا۔

☆☆☆

Aur phir yuon hua by Noor Shah(Srinagar) cell-9906771363

نور شاہ (سرینگر)

اور پھر یوں ہوا

اور جب رقیہ اور عارف کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد یہ احساس ہونے لگا کہ محبت کی فضاؤں کو ترتیب دینے اور اپنی محبت کی داستان کو دل کی راہوں سے ہم کنار کرنے کے لئے اپنی زبان اور ہونٹوں کا استعمال لازمی بنتا جا رہا ہے تو انہوں نے سوچ سوچ کر اپنی زندگی کے تعلق سے ایک اہم فیصلہ لینے کا ارادہ کیا........ اب تک یونیورسٹی کے ماحول میں اُن پر ایک دوسرے سے ملنے پر کوئی بندش نہ تھی اور فرصت کے ان گنت لمحات بھی میسر تھے لیکن اب وہ یونیورسٹی کے چناروں کی فرحت بخش فضاؤں سے باہر آ چکے تھے۔ عارف کو ایک نیشنل بنک میں ملازمت مل گئی تھی اور لیکچرار کی حیثیت سے رقیہ بھی ملازمت اختیار کر چکی تھی لیکن وہ اپنے رشتے کو توڑنا نہیں چاہتے تھے، ایک دوسرے سے دور نہیں رہنا چاہتے تھے، ایک دوسرے کی سوچوں میں پوشیدہ ہونا چاہتے تھے، بلکہ زندگی کے آخری سانس تک اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتے تھے........ اور اس سے پہلے کہ سوچیں گھبرا جائیں، چناروں کے رومان پرور راستے مسدور ہو کر رہ جائیں، اُنہوں نے ایک فیصلہ لیا........ اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ........؟!

اور اپنے اس فیصلے سے عارف نے اپنی ماں کو آگاہ کیا اور ٹھیک اسی طرح رقیہ نے اپنے باپ سے بات کی........ دراصل عارف کے والد چند برس قبل انتقال کر چکے تھے۔ لہٰذا اسکی زندگی کو سجانے سنوارنے میں اس کی ماں کا کردار بڑی اہمیت کا حامل رہا تھا۔ بدقسمتی سے رقیہ کی والدہ بھی انتقال کر چکی تھیں اور اس کی دیکھ بھال، رکھ رکھاؤ اور تعمیم و تربیت میں اس کے والد نے بے حد کاروباری مصروفیات کے باوجود کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ اسکی ماں نہیں ہے۔

شام اُتر چکی تھی۔ آسمان پر سجے سنورے تارے جگمگا رہے تھے........ عارف اپنی ماں اور رقیہ اپنے باپ کے ساتھ شان ریسٹوران کے ایک تنہا اور خاموش گوشے ایک تعارفی نشست میں مصروف تھے۔ اس نشت کا اہتمام عارف اور رقیہ نے مل کر کیا تھا۔ گفتگو ہوتی رہی دھیمے دھیمے لہجے میں باتیں ہوتی رہیں، تہہ در تہہ باتوں کی چادر کھلتی رہی اور داستانِ محبت کے مختلف رنگ بکھرتے رہے۔ رشتوں کی مضبوطی کا احساس ابھرتا رہا۔ عارف کی ماں اور رقیہ کے باپ کی رضامندی کے بعد

شادی کی تفصیلات طے ہوتی رہیں اور آخر پر شادی کی تاریخ بھی نہایت پر مسرت انداز میں مقرر کی گئی........!

اور پھر یوں ہوا........؟!

عارف اور رقیہ کی شادی کی طے شدہ تاریخ سے دو روز قبل دونوں کو ایک ان دیکھی ان سوچی اور ان جانی حقیقت کا سامنا کرنا پڑا........ رقیہ کا باپ اور عارف کی ماں ایک دوسرے سے شادی کر چکے تھے........!!!

☆☆☆

Doosra Shauhar by Dr. Nazir Mushtaq(Srinagar)cell-9149984865

ڈاکٹر نذیر مشتاق (سرینگر)cell-9419004094

دوسرا۔شوہر

ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔اس نے مجھ سے کہا اور میرے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔۔۔میں نے باہر کی طرف دیکھا میرے مطب کی کھڑکی کے بالکل قریب بوڑھا چنار اداس تھا ایک شاخ پر ایک اکیلی چڑیا پھدک رہی تھی۔جانے مجھے کیوں ایسا لگا کہ وہ بڑی دیر سے اپنے ہمسفر کو تلاش کر رہی ہے۔میں نے سامنے میز پر رکھے ہوئے مگ سے گرین ٹی کی ایک چسکی لی اور سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا جو میرے جواب کا بیصبری سے انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ابھی میرے لب وانہیں ہوئے تھے کہ اس نے پھر سے کہا۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔۔۔۔میں نے اسے غور سے دیکھا وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔۔اس نے ہلکے گلابی رنگ کا پھرن اور اسی رنگ کا شلوار پہنا تھا اور اسی رنگ کا دوپٹہ گلے میں لٹکایا تھا۔بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل لگانے سے اس کی آنکھیں اور بھی خوبصورت اور نشیلی ہوگئیں تھیں۔اس نے چہرے پر بڑی مہارت سے میک اپ کیا تھا اس کے گال دہک رہے تھے اور لبوں پر عجیب سی نمی تھی۔۔اس کی ناک بہت پیاری اور خوبصورت تھی اس نے داہیں ھاتھ میں رکھے رومال سے نتھنوں کی نمی کو صاف کیا اور میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔۔اب میں نے کچھ کہنا ضروری سمجھا۔۔۔۔۔

ہوں تم مجھ پر الزام لگا رہی ہو کہ میں نے تمہارے شوہر کو مار ڈالا۔۔۔مگر سچ تو یہ ہے کہ میں نے تو صرف تم کو گولیاں دیں۔۔۔۔۔۔اور ان ہی گولیوں سے وہ مر گیا۔۔۔اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔۔۔۔۔اور تم ہمیشہ کے لیے آزاد ہوگییں۔۔۔۔میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔مگر میں تو اس کے بغیر رات بھر تڑپتی رہتی ہوں۔۔۔وہ آتا تو میری رات حسین ہو جاتی اور میں۔اس کی باہوں میں سب کچھ بھول جاتی۔۔اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔۔۔۔اب میں بالکل اکیلی ہوگئی ہوں اب میں کیا کروں۔۔۔۔اس نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔میں نے اس کی کیس ہسٹری کھول کر پڑھنا شروع کیا۔۔۔۔دیکھو جو کچھ تم نے ایک مہینے پہلے مجھ سے کہا وہ سب

تفصیل سے اس فایل میں درج ہےتم نے جو کچھ کہا اسی حساب سے میں نے تمہارے لئے دوایاں تجویز کیں۔۔۔۔۔کیا لکھا ہے اس میں۔۔۔۔اس نے یوں کہا جیسے کسی معصوم بچے نے سوال کیا ہو۔۔۔۔۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔۔تم سننا چاہتی ہو۔۔۔۔۔۔۔اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گھٹنوں پر رکھے چھوٹے سے خوب صورت بیگ میں سے چیونگ گم نکال کر منہ میں ڈالا اور اسے چبانے لگی۔۔۔۔۔اس میں لکھا ہے۔۔۔۔۔میں نے اس کی ہسٹری پڑھنا شروع کی۔۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب میں ہر وقت بے قرار رہتی ہوں۔۔۔۔جی چاہتا ہے کہ چیخوں چلاؤں اور کہیں دور چلی جاوں مگر جب حسین رات کا خیال آتا ہے تو رک کر رات کا انتظار کرنے لگتی ہوں۔۔۔۔مجھے اپنی ماں سے سخت نفرت ہے وہ عورت نہیں بلکہ عورت زات کے نام پر بدنما دھبہ ہے۔۔۔وہ بچپن ہی سے مجھے گالیاں اور بد دعائیں دیتی رہی ہے۔۔۔۔جب میں کسی کام میں زرا دیر لگاتی تو وہ۔چلا کر کہتی۔۔۔۔تو دیکھ تیری شادی میں کسی جن سے کرواؤں گی وہ تیری ہڑیاں توڑا کرے گا اور۔۔۔۔۔میں اس کی بات کاٹ کر کہتی۔۔۔۔کیا جن مجھ سے شادی کرے گا۔۔۔۔۔تو وہ جواب دینے کی بجائے جھاڑو ہاتھ میں لیے میرے پیچھے دوڑتی۔۔میں تیزی سے بھاگ جاتی اور وہ تھوڑی دیر میرا تعاقب کر کے ہانپنے لگتی کیوں کہ وہ دمہ کی مریض تھی۔وہ۔بیٹھ جاتی اور گالیاں بکنے لگتی۔۔۔۔میرا باپ اس کے سامنے اف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آرمی والوں کے ساتھ کام کرتا تھا۔مختلف بینکروں میں جا جا کر پٹرول اور ڈیزل جمع کرتا اور ملاوٹ کر کے بیچتا تھا۔۔۔۔ایک دن وہ گھر سے نکلا پھر کبھی واپس نہیں آیا۔۔۔۔۔اس کے بعد میرے بڑے بھائی نے گھر کی بھاگ ڈور سنبھالی۔۔۔۔ماں بھی ایک پرائیویٹ اسپتال میں خاکروب کا کام کرنے لگی۔میرا بھائی کیا کام کرتا تھا یہ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا میں اس سے چھوٹی تھی اس لیے وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا میرے لیے میری پسند کے کپڑے اور چوڑیاں لاتا مجھے رنگ برنگی کپڑے بہت پسند تھے اور آج بھی ہیں مجھے سونے کے زیورات بہت پسند ہیں اور اسی لیے میں نے دیکھو کتنے زیورات پہنے ہیں۔۔مگر کسی سے کہنا نہیں یہ سب نقلی زیورات ہیں۔۔مگر مجھے دکھاوا بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔۔میرے بھائی کو میری شادی کی فکر ہر وقت لاحق رہتی تھی اس لیے اس نے کم عمری میں ہی میری شادی اپنے ایک دوست سے کروادی۔۔۔۔۔وہ کیا کام کرتا تھا مجھے کسی نے نہیں بتایا مگر میری ماں اکثر اس سے پوچھا کرتی۔۔۔۔بیٹا تم کیا کام کرتے ہو وہ مسکراتے ہوئے جواب دیا کرتا۔۔۔۔۔ماں جی میں ایک پرائیویٹ فرم می منیجر کے عہدے پر فائز ہوں۔۔۔۔میری ماں سر جھکا کر اسے دعائیں

دیتی۔۔۔۔

مجھے اس بات کی ذرہ بھی پرواہ نہیں تھی کہ وہ کیا کام کرتا تھا۔ میں خوش تھی کہ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتا تھا اور میری ہر فرمایش پوری کرتا۔۔۔۔۔ میں اپنی مرضی کی مالک تھی۔۔ میں ماں سے ملنے کبھی نہیں جاتی وہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے اتی۔۔ میں گھر میں اکیلی تھی کیونکہ میرے شوہر کے سبھی رشتہ دار ایک دور دراز گاؤں میں رہتے تھے اور میں کبھی ان سے ملنے نہیں جاتی تھی۔۔۔۔۔۔

ایک دن مجھ پر یہ خبر قہر بن کر ٹوٹ پڑی کہ میرا بھائی ایک انکاؤنٹر میں مارا گیا ہے۔۔۔ اسی دن مجھے معلوم پڑا کہ وہ ایک ملیٹنٹ تھا۔۔۔۔۔ میری کمر ٹوٹ گئی اور میری ماں بھی اکلوتا بیٹا کھونے کے غم میں ادھ مری ہوگئی۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا اور وہ خوشی خوشی آگیی۔۔۔۔۔۔ میرا شوہر کام پر جاتا۔ ماں گھر کا کام کرتی اور میں اپنی آرایش و زیبایش میں مصروف رہتی میں شام تک شوہر کا انتظار کرتی کہ کب آیے اور مجھے اپنی باہوں میں جکڑ کر ادھ موا کردے۔۔۔۔۔۔ میرے شوہر نے ایک چھوٹا سا مکان خرید لیا تھا۔۔۔۔ میرا بیڑ روم دوسری منزل پر سامنے کی طرف تھا۔ اس کا ایک دروازہ ورنڈا پر باہر کی طرف کھلتا تھا اور دروازے کے قریب ایک سیڑھی تھی جس کے ذریعے میں باغ میں اترتی اور واپس چڑھتی۔۔۔ ماں نچلی منزل کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔

میرا شوہر رات کو دیر سے آتا کھانا کھانے کے بعد سیدھا بیڑ روم میں چلا جاتا اور میں ماں کو چھوڑ کر دوڑتی ہوئی اس کے پاس جاتی اور اسے گلے لگاتی میرے اندر ایک عجیب سی آگ بھڑک اٹھتی اور میں فوری وہ آگ بجھانا چاہتی۔۔ وہ میری بیتابی سمجھ جاتا اور پلک جھپکتے ہی مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیتا میں آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کرتی۔۔۔۔۔۔ میرے لیے اب۔ اس کے ساتھ رات گزارنا ایک نشہ بن چکا تھا اور میرا دل چاہتا کہ اس نشے کی مقدار میں ہر رات اضافہ ہوتا رہے۔۔۔۔۔۔ میں خوشی خوشی زندگی کے شب و روز گزار رہی تھی۔۔۔۔۔۔ پھر ایک شام وہ گھر لوٹا ہی نہیں۔۔۔ میں اپنی ماں کی گود میں سر رکھے آنسو بہاتی رہی۔۔۔۔۔۔ دن رات گزرے مگر وہ نہیں آیا۔ میری ماں پولیس اسٹیشن بھی گیی مگر اس کا کوی پتہ نہیں چلا۔۔۔۔۔ اب میں اکیلی تھی ماں میرے پاس تھی مگر وہ میری ضرورت پوری کیسے کرتی۔۔۔۔ میں اپنے ہی بیڈ روم میں راتیں گزارتی مگر نیند مجھ سے روٹھ چکی تھی میں رات بھر صرف اپنے شوہر کے بارے میں سوچتی رہتی۔۔۔ میرا دل ایک لمحہ بھی اس کی یاد سے غافل نہیں رہتا۔۔۔ میں پوری رات اس کی جدائی کی آگ میں جلتی

رہتی۔۔۔۔۔۔ایک رات میں اس کی یادوں میں ۔کھوی ہوی تھی۔۔۔۔۔میں چاہتی تھی کہ وہ اے اور مجھے اپنی باہوں میں زور سے جکڑ لے۔۔۔۔۔۔۔۔اچانک بادل گرجنے لگے اور بجلی چمکی۔میں گھبرا گئی۔۔۔اچاں ک مجھے ایسا۔لگا جیسے کوئی سیڑھی کے پاے چڑھنے لگا۔۔۔دھیرے دھیرے۔ میں سہم گیی۔۔۔اچانک ورنڈا کی طرف کادروازہ کھلااوروہ اندر ایا۔سفید برف جیسے لباس میں ملبوس۔درازقدوقامت۔نورانی چہرہ۔۔۔۔۔۔اس نے میری طرف دیکھ کرکہا۔۔گھبراومت میں تمہاراشوہرہوں۔ہمارانکاح ہوچکاہےاب میں ہررات تمہارے پاس آیاکروں گا۔

یہ سن کرمیں سب کچھ بھول گئی اورمیں نے اپنے آپ کواس کےحوالےکیا۔۔۔۔۔۔اس نے مجھے اپنے گلے سے لگایااورپھراذان ہونےتک وہ میرے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اذان سنتے ہی وہ اٹھا۔۔۔باتھ روم گیااورنہادھوکر۔لباس زیب تن کرکے اسی دروازے سے باہرچلا گیاجہاں سے آیا تھا۔۔۔۔۔اب یہ معمول بن گیاوہ رات گزارنے میرے پاس اجاتا اور پو پھٹتے ہی چلا جاتا۔۔۔۔میری راتیں بہت حسین ہیں مگردن قیامت سے کم نہیں ہیں۔۔میری بھوک مرچکی ہے۔۔کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا ہروقت غصے کی آگ میں جلتی رہتی ہوں جس کا شکار بیچاری ماں ہوجاتی ہے۔

مجھے گھرسے باہرجانا بالکل اچھانہیں لگتا ہے۔جی چاہتا ہے روؤں چیخوں چلاؤں۔اپنے کپڑے پھاڑکرننگی ناچوں مگر دوسرے شوہرکی یاداتے ہی سب۔کچھ بھول جانے کی کوشش کرتی ہوں۔۔۔۔میری ماں نے میری حالت دیکھ کرمجھے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کا حکم دیااورمیں آپ کے پاس ای۔۔۔۔۔۔۔

میں نے پانی کاایک گلاس حلق سے اتارااوراس سے کہا۔۔۔یہ تمہاری ہسٹری ہے جو میں نے لکھ کے رکھی ہے۔۔۔۔میں نے تمہارے کچھ ٹیسٹ بھی کیے وہ سب نارمل ہیں۔۔تمہاری ہسٹری پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تم ایک نفسیاتی مریض ہو۔۔میں نے دوایاں تجویز کیں اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرا دوسرا شوہرمرگیا۔۔۔مگرکیوں۔وہی تو میری راتوں کا سہارا تھا۔۔دوایوں نے اسے مارڈالا۔۔۔مگراب مجھے لگتاہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کوی پرابلم نہیں ہے۔۔اس نے منہ سے چیونگم نکال کر دایں طرف رکھی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔۔۔اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر

کہا۔۔۔۔۔اپ نے میرا علاج کیا مگر میرے شوہر کو کیوں مار ڈالا۔۔۔۔۔

میں نے اسے سمجھایا۔۔۔۔دراصل تمہارا کوئی دوسرا شوہر تھا ہی نہی۔وہ تمہارا بھرم تھا۔۔تمہارے لاشعور میں ماں کی بات چھپی تھی کہ تمہاری شادی جن سے ہوگی۔۔۔۔۔۔تمہارے شوہر کے لاپتہ ہوجانے کے بعد تمہارے دماغ میں جن کے متعلق خیال آیا ہوگا۔یا تم نے خواب دیکھا ہوگا۔۔۔اور وہی خیال یا خواب تمہارے خیالوں میں رات کے وقت حقیقت بن گیا ہوگا ڈاکٹروں کی زبان میں اسے Hallucinations کہتے ہیں۔۔جو کچھ تم نے رات کو دیکھا یا کیا وہ سب سراب تھا۔۔۔۔اسی لیے دوایوں سے تمہارے دماغ کے بگڑے ہوئے کیمیائی پیام رسان اپنی اصلی حالت میں واپس آئے اور تمہارا دوسرا شوہر غایب ہو گیا۔۔۔۔۔۔دراصل تمہارا کوئی دوسرا شوہر تھا ہی نہیں۔۔۔۔تم محض لاشعوری احساسات سے کام لے کر دوسرے شوہر کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی تھیں۔۔۔تم کسی لیڈی ڈاکٹر سے اپنے مخصوص اعضاء※ کا معاینہ ضرور کروانا۔۔۔۔۔

میری باتیں سن کر وہ حیران و پریشاں ہوگئی۔۔۔۔۔۔وہ کرسی سے اٹھی۔ڈاکٹر اب میں تمہاری تجویز کی ہوی دوایاں استعمال نہیں کروں گی۔۔۔۔میرا دوسرا شوہر ضرور واپس آئے گا اور میری راتیں رنگین ہوں گی۔۔۔۔یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

Badi Family by Nigar Azeem(New Delhi)cell-9968097929(Banat)
نگار عظیم (نئی دہلی)

بڑی فیملی

ایک شخص کے انتالیس کالم پورے کرنے کے بعد بیوی سات بچوں، دو بہوؤں، ان کے تین بچوں اور دادی سمیت تمام تفصیلات درج کرتے کرتے تقریباً ایک گھنٹہ بیت چکا تھا۔ پچھلے پانچ گھنٹوں سے میں فیلڈ میں تھی اور اب بری طرح تھک چکی تھی۔ سامان سمیٹتے ہوئے باہر نکلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لہٰذا سیدھے گھر جانے کا ارادہ کر کے میں نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ لیکن، چند قدم کے بعد مجھے احساس ہوا کہ کوئی نسوانی آواز میرا پیچھا کر رہی ہے۔ مڑ کر دیکھا— کوئی نہیں۔ ادھر اُدھر دیکھا— کوئی بھی نہیں—

اِدھر اس طرف—اوپر دیکھیے نا۔

میں نے دیکھا بائیں جانب دومنزلہ فلیٹ کی بالکنی پر ایک خاتون جھکی ہوئی ہے۔

''کیا ہمارے یہاں نہیں آئیں گی؟ مردم شماری کے لیے۔''

''جی...جی ضرور آؤں گی۔'' میں رُک گئی۔ کلائی گھڑی پر نظر ڈالی... پھر دومنزلہ عمارت پر اور سوچا کئی خاندان آباد ہوں گے۔ بہت دیر لگے گی۔ بچوں کی تاکید تھی ''اماں جلدی آنا۔''

''آجایئے نا؟ اِدھر سے ہے دروازہ اوپر آنے کا'' اس نے جھکتے ہوئے اشارہ کیا۔ اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی میرے قدم اس فلیٹ کی جانب اٹھ گئے۔

سیڑھیاں طے کرتی ہوئی اوپر پہنچی تو وہ دروازے پر موجود تھی۔

''آیئے اندر آیئے۔ میں تو کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ اِدھر کوئی آیا ہی نہیں۔ آپ شاید کل بھی آئی تھیں۔ آپ کو اس گلی میں دیکھا تو میں سمجھ گئی۔ ابھی ہمارا نمبر نہیں آیا... آج میں نے سوچا خود ہی بلا لوں...''

''جی، دراصل بہت لمبی گلی ہے اور پھر ایک ایک گھر میں کافی دیر لگ جاتی ہے۔''

''وہ تو یہاں بھی لگے گی۔'' وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ ''بیٹھیے'' اس نے دیوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ ایک صاف ستھرا کشادہ کمرہ تھا۔ایک طرف دیوان پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا اور کنارے گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ دوسری جانب چار کرسیاں اور ایک میز۔فرش پر پلاسٹک کی رنگین چٹائی اور الماری میں کانچ کے برتن قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔کمرے کے ایک کونے میں چھوٹی سی سہارنپوری گول میز پر کانچ کا ایک گلدان جس میں پلاسٹک کے سرخ پھول لگے تھے۔

میں نے بیگ کھول کر تمام کاغذات نکالے۔

وہ ایک ٹرے میں پانی کا گلاس رکھے ہوئے داخل ہوئی تو میں نے پوچھا۔

''آپ کب سے ہیں اس مکان میں؟ کیا نام ہے آپ کے شوہر کا؟''

عبدالسلام... ہم سات برس سے یہاں رہتے ہیں۔مکان نمبر J-30/2۔

لیکن میری لسٹ میں اس نمبر کا نہ کوئی مکان تھا نہ اس نام کا کوئی شخص۔لہٰذا ابتدا سے کارروائی شروع کی۔

آپ پانی تو پی لیجیے۔ ہماری فیملی بہت بڑی ہے۔آپ کو بہت دیر لگے گی... ذرا آرام سے بیٹھ جایئے۔ بڑی فیملی کا نام سن کر میں اندر ہی اندر بڑبڑائی۔ اللہ خیر۔ جی کوئی بات نہیں... میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔اور پانی کا گلاس اٹھالیا۔

میں نے دیکھا معمولی شکل وصورت کے باوجود وہ بھرے بھرے جسم کی ایک پُرکشش خاتون ہے۔ شربتی آنکھوں پر گھنیری پلکوں سے گلابی سمندر کا احساس ہوتا تھا۔

''آپ سامنے جس گھر سے نکلی تھیں وہ بھی تو بہت بڑی فیملی ہے۔بہت دیر لگی ہوگی آپ کو'اس نے پوچھا۔

''جی ی ی''۔

جی پر زیادہ ہی زور دے کر مجھے احساس ہوا تو فوراً ہی بات برابر کرنی چاہی۔''یہ تو ہمارا کام ہے، ہماری ذمہ داری۔آپ قطعی فکر نہ کریں اور اپنی فیملی کے ہیڈ کا نام بتائیں۔ یہ عبدالسلام آپ کے شوہر ہیں نا؟ گھر میں سب سے بڑے ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

عبدالسلام کے والد کا نام؟؟

شمس السلام، وہ تو گزر گئے۔

آپ کے شوہر کی عمر؟

پچاس برس۔

کیا کرتے ہیں؟

کارپینٹر ہیں۔

ملازم ہیں یا اپنا کام ہے؟

اپنا۔

پڑھے لکھے ہیں؟

جی۔

کتنی تعلیم ہے؟

بی۔اے۔ چائے پئیں گی آپ؟

جی نہیں۔شکریہ!

عبدالسلام کی بیوی کا یعنی آپ کا نام؟

خدیجہ۔

عمر؟

چالیس برس۔

آپ کی تعلیم؟

دسویں تک۔شادی بہت جلدی ہوگئی تھی نا؟

شادی کس عمر میں ہوئی آپ کی؟

اٹھارہ برس کی عمر میں۔میں کالم بھرتی رہی اور وہ بتاتی رہی۔

شوہر کی عمر اس وقت کیا تھی؟ یعنی شادی کے وقت۔وہ خاموش رہی تو میں نے خود ہی حساب لگانا شروع کیا۔

اٹھائیں برس۔

آپ تھک گئی ہوں گی۔آدھا کپ چائے پی لیں۔

آپ لوگ کہاں کے ہیں؟ میرا مطلب آپ کے شوہر کہاں پیدا ہوئے؟

یو۔پی ضلع بلند شہر۔

اور آپ؟

ہم بھی وہیں کے ہیں۔

چائے کا پانی رکھ دوں ذرا۔ وہ اٹھنے لگی۔

اچھا تو آپ دونوں دہلی کب سے ہیں؟ پلیز بیٹھ جائیں۔

بہت برس سے۔ شادی کے بعد سے۔

دہلی آنے کی وجہ آپ کے میاں کا روزگار تھا یا کچھ اور؟

روزگار کے لیے ہی آئے تھے یہاں۔

اس محلہ میں کب سے ہیں آپ؟

سات برس سے۔ جب سے ہمارا مکان بنا ہے۔

تو یہ آپ کا ہے؟

جی۔ وہ خفیف سا مسکرائی۔

راشن کارڈ ہے آپ کے پاس؟

جی۔

آئی کارڈ جس میں تصویر لگی تھی بنوایا تھا؟

جی وہ بھی ہے۔

برائے مہربانی دکھائیں گی؟

وہ لینے اٹھی۔ آپ کہیں پڑھاتی ہیں کیا؟ یہ اس کا سوال تھا۔

ہوں..... میں نے جواب دیا۔

اب بچوں کے نام بتائیں۔ میں نے آئی کارڈ اور راشن کارڈ چیک کرتے ہوئے پوچھا۔ بڑے بچے کا نام؟

اسے خاموش پا کر میں نے پھر پوچھا۔

پہلی یعنی بڑی اولاد کا نام؟

جی، بتایا نہیں آپ نے۔ بڑا بچہ کتنا بڑا ہے؟ اس کا کیا نام ہے؟

کچھ بھی نہیں۔

جی... میں نے دل میں سوچا عجیب پُر مذاق خاتون ہے۔ مجھے جلدی ہو رہی ہے اور اسے باتیں اور مذاق سوجھ رہا ہے۔ میں اندر ہی اندر جھنجلا گئی لیکن لہجہ نرم کر کے میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

بڑے بچے کا نام بتایئے بیٹا ہے بیٹی؟ جو آپ کے ساتھ رہتے ہوں اس گھر میں۔
کوئی بھی نہیں...
کیا سب کی شادیاں ہو گئیں؟
نہیں تو... کیا سامنے والوں نے کچھ نہیں بتایا آپ کو؟
میں حیران تھی۔ دیکھیے میں سامنے والوں کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ آپ کی کر رہی ہوں۔ جو بچے شادی ہو کر چلے گئے ہیں ان کو چھوڑ کر جو آپ کے ساتھ ہیں بیٹا یا بیٹی شادی شدہ یا غیر شادی شدہ دونوں۔ ان کے نام لکھوایئے۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے بتایا اور اندر ہی اندر بڑبڑائی
''عجیب کھسکے ہوئے دماغ کی عورت ہے۔''
کوئی ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔ وہ بولی۔
جی... لیکن! آپ تو... کہہ رہی تھیں۔ دیر... لگے... گی... بہت... بڑی... فیملی... ہے۔ میں نے جملے کو چبا چبا کر بڑی مشکل سے پورا کیا۔
''یہ بڑی ہی تو ہے۔''
میرا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ قلم رکھ کر ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ میں گھبرا گئی۔ بڑی عجیب سچویشن تھی۔ کئی منٹ خاموشی میں گزر گئے۔ بہت ہمت جٹا کر میں نے اسے دلاسہ دیا۔ آپ مایوس نہ ہوئیے۔ کہیں علاج کرایا آپ نے؟ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھک آئے تھے۔ دوپٹہ سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے ناک پونچھی جو سرخ ہو چکی تھی۔ کسی کو گود لینے کا نہیں سوچا؟
سوچا تو تھا۔ لیکن، یہ کہتے ہیں اپنا اپنا ہی ہوتا ہے۔ جب اوپر والے نے ہی نہیں دیا تو... اس نے سسکتے ہوئے دھیمے دھیمے جواب دیا۔
نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ آپ انہیں سمجھایئے۔ کبھی کبھی اپنی اولادیں بھی بڑی ناکارہ نکل جاتی ہیں اور گود لی ہوئی بہت نیک اور خدمت گزار۔ میں نے تسلی دینے کی غرض سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت رہی ہوگی۔
وہ سامنے والے مجھے اچھا نہیں سمجھتے۔ کیونکہ میں... اپنے بچے بھی میرے یہاں آنے نہیں دیتے۔ وہ پھر سسکنے لگی۔ وہ خود اچھے نہیں ہوں گے۔ یہ تو اوپر والے کے اختیار میں ہے۔ آپ یہ سب سوچ کر خود کو دُکھی نہ کیجیے۔ ہمت سے کام لیجیے۔ میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس سے باتیں کرتی

رہی۔اس کی غیر ضروری باتوں کا مقصداب میں اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔
آپ خود کو کہیں مصروف رکھیے نا؟
بچوں کو قرآن پاک پڑھاتی ہوں،لیکن پہاڑ سادن کاٹے نہیں کٹتا۔
آپ کسی کو اپنا دوست بنایئے۔ چلیے مجھے بنا لیجیے۔آپ میرے گھر آیئے گا پھر بہت ساری باتیں کریں گے۔اپنا پتہ دے کر کاغذات سمیٹتے ہوئے دُکھی دل سے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔
اوپری منزل پر کوئی اور فیملی رہتی ہے کیا؟میں نے سینس کی غرض سے سوال کیا۔
کوئی نہیں۔ہمارا ہے خالی ہے۔
اور نیچے گراؤنڈ فلور پر؟
وہ بھی خالی ہے ہمارا ہی ہے۔
اچھا چلتی ہوں۔خدا حافظ۔
آپ کے کتنے بچے ہیں؟اس نے چلتے چلتے سوال کر ڈالا۔
جی اللہ کے کرم سے... اُف... لمحہ بھر کو میں رُکی۔آواز حلق میں کہیں گم ہوگئی تو میں نے نفی میں سر ہلایا۔
کوئی نہیں ہے؟اس نے دردمندی سے پوچھا تو میں نے پھر نفی میں سر ہلایا۔اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔
کیا آپ بھی؟جی،میں،بھی،آپ کی،طرح،....میں نے دیکھا لمحہ بھر میں ہی اس کے چہرے سے غم کے بادل چھٹنے لگے تھے۔
میں نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔مجھے محسوس ہوا میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں۔
میں نے خدا سے دعا کی اے خدا یہ کبھی میرے گھر نہ پہنچے۔

☆☆☆

Meri Maa by Dr. Humera Sayeed(Hyderabad)cell-9346377993
ڈاکٹر حمیرہ سعید (صدر شعبۂ اُردو این ٹی آر گورنمنٹ ڈگری کالج (اُناث) محبوب نگر)

میری ماں

اندھیرے جب اجالوں سے گلے ملتے ہیں تو اپنا رنگ اتنا حاوی کر لیتے ہیں کہ اجالا اپنا وجود ہی کھو بیٹھتا ہے۔آج مجھے بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے اپنے وجود کو کھو دیا۔سارے رشتے آج بکھر گئے تھے،احساس کی چنگاریوں کو بے بسی کی برسات نے بجھا دیا۔ممتا کا تقدس پامال ہو چکا تھا۔مجھے لگ رہا تھا کہ میری شخصیت کا شیرازہ بکھر گیا۔ڈائننگ ٹیبل کا سہارا لے کر میں نے اپنے کرچی ہوتے وجود کو سنبھالا۔ پانی کا گلاس غٹا غٹ چڑھا گیا۔ مجھے آج اندازہ ہوا تھا کہ کچھ حقیقتیں سامنے نہ آئے تو ہی بہتر ہے۔ میں نے آج تک سن رکھا تھا کہ سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن مجھے پتہ نہیں تھا کہ سچ اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ رشتوں کی مٹھاس کو ہی ختم کر دے۔ میں بے دم قدم اٹھاتا اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھا اور بیڈ پر اپنے وجود کو ایسے پٹکا جیسے پھل کے پکنے پر درخت اس سے ناطہ توڑ کر اسے ٹپکا دیتا ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے احساس کی کرچیاں کیسے سمیٹوں،جذبات کی آندھیوں پر کیسے قابو پاؤں۔ایک ایک کر کے کئی مناظر آنکھوں میں گھوما کیے۔

''بیٹا جمیل میں جا رہی ہوں یہ دودھ پی لینا۔زینب بی تمہاری نگرانی کو ہے۔کوئی چیز کی ضرورت ہو تو پوچھ لینا۔'' ماں نے تیزی سے آفس جانے کی تیاری کرتے ہوئے اسے ہدایت دی۔''ماں آج آپ مت جاؤ نا'' جمیل نے ضد کی۔صبح ہی سے اس کی طبیعت ناساز تھی وہ چاہتا تھا کہ اپنی ماں کے گود میں سر رکھ کر سوئے۔''نہیں بیٹا تمہیں پتہ ہے میں چھٹی نہیں کر سکتی''۔جمیل کی آنکھوں میں آتے آنسو دیکھ کر ماں نے کہا۔بیٹا یہ سب تمہارے لیے ہی ہے اور پھر زینت بی ہیں نا تمہارے پاس۔وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر چلی گئی اور میرے آنسو متواتر بہنے لگے۔میرے جلتے وجود کو ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں درکار تھی لیکن میں انھیں کیسے سمجھاتا۔میں اس دور میں تھا کہ کئی چیزیں خود ہی نہیں سمجھ پاتا تھا۔میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ان کا واحد چشم و چراغ ان کی آنکھوں کا مرکز بقول ان کے زندگی جینے کی وجہ میں ہی تھا اور شاید آج تک میں اس بات پر یقین کر کے ہی زندگی گذار رہا تھا۔لیکن آج تو کانوں میں ایسا سیسہ گھول دیا تھا گیا کہ.......میں سماعت سے محروم ہو گیا۔سماعت کیا مجھے تو

لگتا ہے کہ میری ساری حسیّات مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پتہ نہیں کیوں بچپن سے ہی ہر بار مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے والدین کا بھر پور پیار نہیں ملا۔ خاص کر ماں کا۔ جب بھی میں نے ان کی ضرورت محسوس کی وہ میرے پاس نہیں تھی۔ کسی نہ کسی کام میں مصروف۔ ماں اور بچے کے رشتوں کی بے ساختگیاں اور جذبوں کی بے تکلف کھلکھلاہٹوں کے لیے میں ہمیشہ ترستا رہا۔ جب بھی شکوہ کیا ایک پار بھرا لکچر سننے کو ملتا کہ یہ سب بھاگ دوڑ تمہارے لیے ہی تو ہے۔

ماں اور پاپا دونوں اپنی مصروفیات میں مگن تھے اور میں اپنے تشنہ کام مسرتوں اور ادھوری محبتوں کے ساتھ جینے کا سلیقہ سیکھ ہی چکا تھا لیکن آج اچانک زندگی کے معنٰی ہی بدل گئے۔ وہ پورے اقوال، باتیں یاد آنے لگی جو ماں کی عظمت کے بارے میں کہی گئیں۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہوتی ہے۔ ماں کا احسان کبھی چکایا نہیں جاتا۔ اسے یاد تھا ایک بار اس نے اپنی ٹیچر سے ماں کی عدم توجہی کی شکایت کی تو انہوں نے کتنے پیار سے سمجھایا تھا کہ بیٹے کبھی ایسا خیال بھی مت کرنا یہ وہی ماں ہے جس نے مہینوں تمہیں اپنے خون سے سینچا ہے۔ نو مہینے اپنی کوکھ میں رکھ کر جنم دیا۔ راتوں کی نیند تم پر قربان کیں ہر دن کا چین لٹایا۔ اس ماں کی محبت پر شک کیسا۔ بیٹا وہ تمہاری آنے والی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے مصروف ہے سمجھے۔ اور میں سمجھ بھی گیا تھا لیکن آج ماں اور شمیم آنٹی کی درمیان ہونے والی گفتگو نے مجھے چکرا دیا اور پوری طرح سمجھ میں آ گیا کہ اپنی ماں سے ہمیشہ ادھوری محبت کیوں ملی۔ ماں کہہ رہی تھی ''شمیم تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں چکا سکتی۔ اگر تم نہ ہوتی تو جمیل نہ ہوتا۔ تم نے مجھے ماں بنایا بناء کسی تکلیف کے۔ تم جانتی ہو کہ اس وقت کتنا مشکل تھا۔ چھٹی کا ملنا اور پھر نبیل کو بھی میرے فیگر کی کتنی پرواہ تھی۔ تم نے میرے بچے کو جنم دے کر دو سال تک اسے پال پوس کر میری کافی مشکلیں آسان کر دیں۔ تب شمیم آنٹی نے کہا تم نے بھی کافی مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔ شوہر کو کھونے کے بعد اتنے سارے قرضے میں کیسے ادا کر سکتی تھی۔ اکیلا وجود جمیل کی وجہ سے مجھے جینے کی ایک وجہ ملی۔ تین سال کتنی آسانی سے گذر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ پھر وہی تنہائی۔ جب بھی دل بے چین ہوتا ہے آ جاتی ہوں۔ پتہ نہیں وہ لوگ اور کیا کیا باتیں کر رہی تھیں لیکن میں کہاں سن پا رہا تھا۔ آئے دن اخبارات میں نیٹ پر میں نے سروگیٹ مدر (Surrogate Mother) کے بارے میں سنا تھا لیکن میرے گھر میں ہی ایسا ہوا، میرے ساتھ ہی۔ ساری رات اسی کشمکش میں گذری۔ اب مطلع صاف تھا صبح کی سپیدی جمیل کے ذہن کو بھی روشن کر رہی تھی۔ اب اسے سمجھ آ گیا تھا کہ اس کی ماں کی محبت اسے ہمیشہ ادھوری کیوں لگتی کیوں کہ وہ اس کی ادھوری ماں تھی۔ پہلی بار کِک (Kick) مار کر

اس نے اپنے وجود کا احساس جیسے دلا یا وہ شمیم آنٹی تھی۔اس کے تخلیق عمل کے ہر ارتقاء کو محسوس کرنے والی جمیل کو دنیا میں لانے کے لیے بے پناہ درد سہنے والی، دودھ پلا کر سینچنے والی۔پہلی مسکراہٹ، پہلا لمس، پہلا احساس، پہلا قدم، پہلی نظر، پہلی فکر عطاء کرنے والی، راتوں کو جاگ کر لوری سنانے والی، اس کی ماں نہیں بلکہ شمیم آنٹی تھی۔آنٹی نہیں دراصل وہی اس کی ماں تھی۔اپنی ماں سے اس کا کیا رشتہ تھا ، کیسا رشتہ۔رشتے تو وقت مانگتے ہیں۔رشتے تو جذبات واحساسات کو مرکز ہوتے ہیں لیکن ان کے رشتے میں تو یہ سب کہاں تھے۔سورج کی پہلی کرن نے جمیل کی زندگی کو روشن کر دیا اور پھر صبح شمیم آنٹی نہیں اپنی اصلی ماں کے بیگ کے ساتھ میں نے اپنا بیگ رکھا اور اپنی ماں اور شمیم آنٹی اوہ! نہیں میری ماں اپنی ماں کی حیران ہوتی نظروں کو نظر انداز کرتا مطمئن ہوکر ناشتہ کھانے میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

Hum Meethe ho gaye by Rafia Nausheen(Hyderabad) Banat

رفیعہ نوشین (حیدرآباد)cell-8099250982

ہم میٹھے ہو گئے

مٹھاس ہماری زندگی کا جزء لاینفک ہے۔ چاہے وہ ہماری زبان میں ہو، لہجہ میں ہو، تیور میں ہو، تاثرات میں ہو، سلوک میں ہو یا پھر لین دین میں۔ جہاں مٹھاس ہوتی ہے وہاں مسکراہٹیں ہوتی ہیں۔ جہاں مسکراہٹیں ہوتی ہیں وہاں کامیابی ہوتی ہے۔ جہاں کامیابی ہوتی ہے وہاں ترقی اور جہاں ترقی وہاں بے شمار خوشیاں۔لیکن یہی مٹھاس جب خون میں شامل ہوجاتی ہے تو اسے ایک بہترین خطاب دیا جاتا ہے جسے ہم ''ذیابطیس'' کہتے ہیں۔ یہ جس کسی کو نصیب ہوتا ہے سمجھ لیجیے کہ اب اس کی زندگی میں القاب کی آمد کا دور شروع ہوگیا ہے جو ایک کے بعد دیگر اسے ملنا شروع ہوجاتے ہیں۔ جیسے ''مرض بلند فشار خون'' ''مرض دل وجگر'' ''مرض بصارت'' وغیرہ وغیرہ۔

عوام الناس کو جیسے ہی یہ القاب عطا ہوتے ہیں ان کے تو تیور ہی بدل جاتے ہیں۔ بلکہ ان کا طرز زندگی یکسر تبدیل ہوجاتا ہے۔ جو لوگ کھانے کا وقت بھوک کے لحاظ سے طئے کرتے تھے۔ وہ اب اتنے بھوکے ہوجاتے ہیں کہ کھانا کھانے کے لیے وقت مقررہ کے منتظر ہوتے ہیں۔ جو لوگ بیماری میں بھی انجکشن سے گریز کرتے تھے اور لینا ضروری ہوتا تو آنکھ منہ بھینچ کر سانس روک کر انجکشن لیتے تھے۔ ان کا یہ عالم ہوتا ہے کہ خود ہی انسولین کا انجکشن دیدہ دلیری سے اپنے جسم میں ٹھوس لیتے ہیں۔ جو لوگ اپنے پیروں پر کبھی دھیان ہی نہیں دیتے تھے ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ توجہ پیروں کو دیتے ہیں۔ اس ڈر سے کہ تھوڑی بھی لاپرواہی کی تو کہیں پیروں سے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ جو لوگ ورزش کو صرف پہلوانوں کی ضرورت سمجھتے تھے وہ بھی علی الصبح سپورٹس شوز پہن کر مارننگ واک کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ جو گوشت خور تھے وہ سبزی کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں۔ غرض کہ زندگی میں بے شمار تبدیلیاں لانے کا سہرا جاتا ہے تو صرف ذیابطیس کو۔ ہماری پچاسیویں سالگرہ کو دو۔ چار دن باقی تھے جب ہم نے حسب معمول اپنی صحت کی جانچ کروائی تو پتہ چلا کہ ''ہم میٹھے ہوگئے''۔ یعنی کے ذیابطیس نے ہمیں بھی اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ یہ خبر سنانے کے لیے ہم اپنے شوہر نامدار کے پاس گئے۔ جو بڑے انہماک سے اخبار کا مطالعہ کررہے تھے۔

''اجی سنتے ہو۔۔۔۔ہم میٹھے ہو گئے''ہم نے دبے دبے سے لہجے میں کہا۔

''ارے بیگم صاحبہ آپ تو روز اول سے میٹھے ہو۔اور آپ کی اس مٹھاس پر تو فدا ہو کر ہم نے آپ سے بیاہ کیا تھا''انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا

''ہم ظاہری مٹھاس کی بات نہیں کر رہے ہیں،ہم تو اس مٹھاس کی بات کر رہے ہیں جو خون کے ساتھ ہماری رگوں میں دوڑ رہی ہے''ہم نے خلاصہ کیا۔

''اچھا میری شریک حیات۔اب میری شریک مرض بھی بن گئی''ان کی باچھیں کھل گئیں۔

''میرے ساتھ ساتھ میرے امراض کا ساتھ نبھانے کے لیے بے حد شکریہ'انہوں نے اخبار پھینک کر مجھے گلے سے لگا لیا۔وہ بہت خوش تھے اور پھر کہنے لگے

''جب زندگی میٹھی ہو جائے تو شکر ادا کرو اور خوشی مناؤ''

ذیابطیس جیسے مرض کو اتنی خوش اسلوبی سے قبول کرتے ہوئے اور پھر اسکی خوشیاں مناتے ہوئے ہم نے آج سے پہلے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ذیابطیس کو لے کر ان کا زاویہ نگاہ مجھے بہت بھایا۔جب جینا اسی کے ساتھ ہو تو کیوں نہ اس کو مثبت نظریہ سے دیکھیں۔؟اگر منفی نظریہ رکھیں گے تو زندگی بھر رونا پڑے گا۔تو چلو کیوں نہ ہم خوشیاں منائیں۔

ہمارے اسّی فیصد دوست احباب جو اس مرض میں مبتلاء تھے۔اکثر یہی طعنہ دیا کرتے کہ ''صحت مند کیا جانے ذیابطیس کے پینترے''انداز بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے کہہ رہے ہوں''بندر کیا جانے ادرک کا سواد''

آج ہمیں موقع ملا تو ہم نے سوچا چلو ہماری مٹھاس کو دوست احباب میں بانٹتے ہیں۔اور پھر ہم نے ٹیلیفون پر ہر ایک کو اطلاع دینی شروع کر دی۔

صائمہ نے جیسے ہی سنا کہنے لگی''تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ یہ بیماری ایک دوسرے کو ہنی۔سوئیٹ ہارٹ جا کو پائی'سویٹی وغیرہ بلانے سے ہوتی ہے۔کاش کے تمہارے شوہر اگر تمہیں ہری مرچ' کریلا'لیمو'ادرک وغیرہ بلاتے تو آج تم اس بیماری سے آزاد ہوتیں''''یہ سن کر ہم نے کہا''کس نے کہا کہ ہم بیمار ہیں''ہم بیمار نہیں ہیں۔وہ تو بس ہمارا البلبہ تھوڑا کاہل ہو گیا ہے۔کسی نے کہا''اچھا تو اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے''

کسی نے کہا''دیر آید درست آید''

کسی نے کہا''اب تم واٹس اپ کے شیریں گروپ کے ممبر بننے کی اہل ہو گئی ہو''

بہر کیف جتنی منہ اتنی باتیں۔۔۔۔۔

ایک ہفتہ بعد ہماری پچاسیویں سالگرہ کی تقریب تھی چونکہ ہمارے تقریباً رشتہ دار دوست احباب ذیابطیس کے مریض تھے اور اب تو ہم خود بھی اس کا شکار ہو گئے تھے لحاظہ ہم نے ''ڈائیٹ مینو'' ترتیب دیا۔جس میں ترکاری کا سوپ چپاتیاں' سلاڈ' براؤن' رائس کا کارن پلاؤ' دہی کا رائتہ' السی کی چٹنی' اور کچھ سٹرس فروٹس(Citrus Fruits) رکھے تھے۔ہم نے سوچا ہمارے اس مینو سے سبھی بہت خوش ہوں گے کیونکہ اس میں کوئی بھی چیز کھانے کے لیے ہاتھ روکنے کی ضرورت نہ تھی۔ سب کچھ حسب ذیابطیس ہی تھا۔مہمانوں نے جب کھانا شروع کیا تو ہم ہر ایک کے پاس جا کر کھانے کے بارے میں ان سے رائے لینے لگے۔

کسی نے کہا''دعوت کا ٹھیکہ کسی دواخانے کو دیا تھا کیا۔؟

کسی نے کہا''ذیابطیس نے تمہیں نکما کر دیا ورنہ تم بھی خاتون تھیں کام کی''

کسی نے کہا''اتنا پرہیزی کھانا تو ہم گھر پر بھی نہیں کھاتے'' دعوت میں آنے کا کیا فائدہ۔؟ نہ تو یہاں مرغ مسلم ہے نہ ہی بریانی''

کسی نے کہا''نئے فقیر کو بھیک کی جلدی تو نئے مریض کو پرہیز کی جلدی''

مہمانوں سے اس قسم کے جملے سن کر ہمیں نہ تو برا لگا نہ ہی دکھ ہوا۔کیونکہ ہمارے معاشرہ میں یہ چلن عام ہے کہ مہمان دعوتوں میں جاتے ہیں تو سب سے پہلے کھانے میں نقص تلاش کرتے ہیں وہ نہ ملا تو سربراہی میں۔ وہاں بھی نہ ملا تو شادی خانہ میں غرض کہ ہزار اچھائیاں ہوا سے نظر انداز کرنا اور برائی کو عام کرنا یہی ہمارا شیوہ بن کر رہ گیا ہے۔ہمیں یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ رمضان المبارک میں ہم نے روزداروں کے لیے دعوت کا اہتمام کیا تھا تو ایک صاحبہ نے ڈٹ کر کھانا تو کھایا اور جاتے جاتے ہم سے کہنے لگیں سب کچھ بہترین تھا مگر یہ اہتمام غرباء اور یتیموں کے لیے ہوتا تو تمہیں زیادہ ثواب حاصل ہوتا۔کاش یہ مشورہ محترمہ نے دعوت سے پہلے دیا ہوتا تو ہم سب سے پہلے انہی کا پتہ کاٹتے۔

ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ غرباء' یتیموں' پڑوسیوں کے ساتھ ساتھ رشتہ داروں کے بھی حقوق ہوتے ہیں۔اسی لیے زکوٰۃ کے مستحقین میں رشتہ داوروں کو اولین ترجیح دی گئی ہے۔دعوت کے بعد سلسلہ شروع ہوا تحائف کی اصولی کا۔جس کو ہم نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔کیونکہ اس سے آپس میں محبتیں بڑھتی ہیں۔ہم تحفے لیتے گئے اور ہماری مددگار زیبون سے کہا کہ وہ ان سارے تحفوں کو کھول کر ایک کمرے میں اچھے سے جمع دے۔ان سب کو وداع کر کے جب ہم تحفوں والے کمرے میں آئے

توہمیں لگا جیسے ہم کسی Surgical اسٹور میں آگئے ہوں۔ کمرے کے بیچوں بیچ سجی سجائی وھیل چیر رکھی تھی۔ اس کے ساتھ شوگر فری کا بڑا ڈبہ'' وزن دیکھنے کی مشین' B.P چیک کرنے کا آلہ' Mary Biscuits' دوائیاں رکھنے کا خوبصورت ڈبہ جس پر اتوار' پیر دنوں کے نام لکھے تھے۔ نرم تلے والی جوتیاں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ہمیں احساس دلا رہی تھیں کہ اب یہ سب چیزیں ہماری زندگی کی ضروریات بننے والی ہیں۔ جن کے بغیر جینا مشکل ہوجائے گا۔ اس لیے ہم نے ان سب کی حفاظت سے رکھ دیا اور بستر پر دراز ہوگئے۔ تکیہ پر سر رکھا نہیں کہ خیالات کا گھوڑا سرپٹ دوڑنے لگا اور ہم سوچنے لگے۔ ذیابطیس سے لوگ اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں۔ جب کہ اس سے مریض کو بے شمار فائدے بھی تو ہیں۔ مثال کے طور پر کہیں سے دعوت آجائے اور اگر آپ کی دلچسپی ہو تو چلے جائیں۔ نہ ہو تو کہہ دیں کہ شوگر زیادہ ہے۔ دعوتوں میں ویسے بھی ذیابطیس والے افراد کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ دیر تک بھوکے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے پہلے دسترخوان پر ان کا قبضہ لازمی ہے۔ اب نارمل افراد کھڑے ہاتھ ملتے ہوئے سوچتے رہتے ہیں کہ کاش مجھے بھی ذیابطیس ہوتی تو یوں انتظار نہ کرنا پڑتا۔

ایک اسکول کے ٹیچر کلاس میں ہمیشہ سوتے رہتے ہیں۔ اور بچے پڑھائی سے محروم ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے جب وجہ جاننی چاہی تو پتہ چلا کہ ان کے شکر کی سطح ہمیشہ زیادہ رہتی ہے اسے کم کرنے کے لیے جس دوا کا استعمال کرتے ہیں اس سے نیند زیادہ آتی ہے تو سونا لازمی ہے۔ لہذا وہ سوتے رہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ بچوں کا مستقبل بھی سو رہا ہے۔ دفتروں میں لوگ کبھی دیر سے آتے ہیں تو کبھی جلد نکل جاتے ہیں۔ وجہ ذیابطیس۔ پارک' ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹاپ پر انہیں بیٹھنے کے لیے جگہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ چکر کھا کر گر پڑنے کی دھمکی بھی مل جاتی ہے۔

ہمیں لگتا ہے وہ دن دور نہیں جب ذیابطیس کے مریض معذوروں کی طرح اپنے لیے تحفظات کی مانگ شروع کریں۔ اور نعرہ لگائیں۔

اہل ذیابطیس۔ زندہ باد زندہ باد

☆☆☆

Kashmiri Zaban:Lesani Shinakht ke masael-o-rah-e-hal by

Dr.Mudassir Rashid Rather(NRLC,Punjabi University Patiala)

cell-9796715300

ڈاکٹر مدثر رشید راتھر (این۔آر۔ایل۔سی۔پنجابی یونیورسٹی،پٹیالہ)

کشمیری زبان: لسانی شناخت کے مسائل وراہ حل

شناخت کسی فرد کا امتیازی کردار ہے، جو انسان کو یہ جاننے میں مدد دیتی ہے کہ وہ کون ہے اوراس کا بیرونی دنیا سے کیا تعلق ہے۔درحقیقت شناخت کی تلاش نوجوانی کی عمر سے شروع ہوتی ہے جب انسان اپنی شناخت اوراپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں خود سے سوال کرتا ہے تو اس مرحلے میں شناخت کا بحران پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو معاشرے میں مختلف شناختوں جیسے سماجی شناخت،قومی شناخت،نسلی شناخت، مذہبی شناخت،نسلی شناخت کے ذریعے پہچانا جاتا ہےاوران میں سے ایک اہم شناخت لسانی شناخت ہے۔لسانی شناخت ایک شخص کی وہ شناخت ہےجس میں وہ کوئی زبان یا زبانیں بولتا ہے۔لسانی شناخت کسی شخص کی سب سے اہم شناخت ہے، جیسے چین کے لوگ چینی بولتے ہیں اوراسی لیےان کی شناخت چینی کے نام سے کی جاتی ہے۔زبان نہ صرف رابطے کا ذریعہ ہے بلکہ یہ ایک فرد کوایک الگ شناخت دیتی ہےجس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شخص ایک مخصوص لسانی برادری سے تعلق رکھتا ہےاورایک الگ زبان بولتا ہے۔ زبان ایک پیچیدہ نظام ہےاور یہ ہماری زندگیوں میں نہ صرف رابطے کا کام کرتی ہے بلکہ یہ کسی کی ثقافت کے کیریئر کے طور پر بھی کام کرتی ہے۔ یہ کسی کو تاریخ، روایات، سیاست اورلوک داستانوں سے جوڑتی ہےاوران عناصر کوایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرتی ہے۔دوسرا یہ کہ کسی کی زبان کھونے کا مطلب ہے اپنی جڑیں کھودینا، شناخت کھودینااوراپنی ثقافت کوکھودینا۔ ایک اندازے کے مطابق 1950 سے اب تک 250 ہندوستانی زبانیں معدوم ہوچکی ہیں اور 40 سے زیادہ زبانیں خطرے سے دوچار ہیں۔مشہور ماہرلسانیات میں سے ایک، جوشوفشمین زبان کے کھوجانے پر تبصرہ کرتے ہیں، "جب ہم کسی ثقافت کی زبان چھین لیتے ہیں،تواس کی سلام دعا،اس کی لعنت، اس کے علاج، اس کی تعریف، اس کے قوانین، اس کا ادب، اس کے گانے، اس شاعری، اس کی کہاوتیں، اس کی حکمت اوراس کی

دعائیں چھین لیتے ہیں۔"

ایک مخصوص زبان بولنے والے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کے تحفظ اوراس کے ساتھ وفادار رہیں، تا کہ وہ اپنی ثقافتی جڑیں اور لسانی تشخص سے محروم نہ ہوں۔ ماہر تعلیم ہریسا گوورسین کے مطابق، ''جب کوئی شخص اپنی مادری زبان بولتا ہے تو دل، دماغ اور زبان کے درمیان براہ راست رابطہ قائم ہوجاتا ہے۔ ہماری شخصیت، کردار، شائستگی، شرم وحیا، عیب، ہنر اور دیگر تمام چھپی ہوئی خصوصیات مادری زبان کے ذریعے صحیح معنوں میں آشکار ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ مادری زبان کی آواز کانوں میں پڑتی ہے اور دل میں اس کے معنی ہمیں بھروسہ اور اعتماد دیتے ہیں۔''

جہاں تک کشمیری زبان کا تعلق ہے، کشمیری زبان جموں وکشمیر کے مرکز کے زیر انتظام علاقے میں کشمیری خطے کے لوگوں کی اکثریت کی مادری زبان ہے۔ کشمیری زبان ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول میں درج بائیس شیڈول زبانوں میں سے ایک ہے۔ کشمیری کو اس کے مقامی بولنے والے کاشُر یا کاشُر زبان کہتے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری کے مطابق سابقہ ریاست جموں و کشمیر میں کشمیری زبان بولنے والوں کی تعداد 70 لاکھ تھی۔ کشمیری ایک ہند آریائی زبان ہے اور گریسرن کے مطابق یہ ہند آریائی زبان کے خاندان کے دردی گروپ کے تحت آتی ہے۔ کشمیری زبان کا ثقافتی اور ادبی ورثہ بہت زیادہ ہے، لیکن بدقسمتی سے نئی نسل نے اس زبان کے بارے میں منفی رویہ اپنالیا ہے اور انگریزی اور اردو زبانوں کی طرف مائل ہورہی ہے۔ جموں وکشمیر کے لوگوں کے لیے اپنی مادری زبان کشمیری کو معدومیت کے خطرے سے بچانا انتہائی تشویشناک ہے کیونکہ اگر یہی صورتحال جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب کشمیری زبان زوال پزیر ہوجائے گی اور کشمیریوں کی اپنی لسانی شناخت کے ساتھ ساتھ اپنا بھرپور ثقافتی اور ادبی ورثہ بھی کھو جائے گا۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ کام بنیادی طور پر کشمیری زبان کو درپیش مسائل اور چیلنجز پر توجہ مرکوز کرتا ہے، جو اس کے تحفظ کے لیے بروقت اقدامات نہ کیے جانے کی صورت میں کشمیری عوام کے لیے اپنی لسانی شناخت کھودینے کا سبب بن سکتی ہے۔ اس سلسلے میں تین اہم پہلوؤں پر توجہ دینا ضروری ہے جنہیں کشمیری زبان کے لیے اہم چیلنج سمجھا جاسکتا ہے۔

- کشمیری زبان کی طرف نئی نسل کا رویہ
- کشمیری زبان کے حوالے سے انتظامی پالیسی
- کشمیری زبان کی تعلیم سے متعلق مسائل

کشمیری زبان کی طرف نئی نسل کا رویہ: ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے جہاں لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں جن کا تعلق مختلف زبانوں کے خاندانوں سے ہے۔تنوع میں اتحاد ہےلیکن بہت سے عناصر ہیں جو ہمارے معاشرے میں ظاہر ہیں اور جو ہماری ثقافتی اور لسانی تنوع کے لیے خطرناک ہیں۔ سب سے بڑے چیلنجوں میں سے ایک بڑی زبانوں کی عالمگیریت ہے۔ بلکہ یہ دنیا کی مقامی ثقافتوں اورزبانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گیا ہے۔ انگریزی جیسی عالمی زبان دنیا کی زبان بن چکی ہے جس میں لوگ مختلف زبانوں اور ثقافتوں کے لوگوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ درحقیقت اس زبان نے ہر میدان میں انقلاب برپا کیا ہےلیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم مادری زبان اور مقامی ثقافتوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرسکتے۔کشمیری کی کئی زبانوں سے رابطے کی ایک طویل تاریخ ہے۔فارسی،سنسکرت،اردو،عربی اورانگریزی زبان۔ان زبانوں نے وقتاً فوقتاً کشمیری زبان کو تقویت بخشی ہےلیکن اردواورانگریزی جیسی زبانوں نے رفتہ رفتہ کشمیری زبان سمیت مقامی زبانوں پرغلبہ حاصل کرنا شروع کردیا ہے۔کشمیر میں نئی نسل اردواورانگریزی زبانوں کی طرف بڑھ رہی ہے اوراپنی مادری زبان کشمیری زبان کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔اگر یہی صورتحال کچھ عرصہ جاری رہی تو وہ وقت دور نہیں جب کشمیری زبان معدوم ہونے کےقریب زبانوں کی فہرست میں شامل ہوجائے گی۔ کشمیریوں کی انگریزی کی طرف اس تبدیلی کی کئی وجوہات ہیں۔ان میں سےایک وہ والدین ہیں جو اپنے بچے اردو یا انگریزی میں نہیں بلکہ کشمیری میں بات کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے ہیں کیونکہ کشمیر میں انگریزی کوسماجی حیثیت،آمدنی،وقاراور ملازمت کا سب سے اہم وصف سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر کے کئی اسکول طلباء کوکشمیری میں بات کرنے سے منع کرتے ہیں اور انہیں صرف اردو اور انگریزی میں بات کرنے کی اجازت ہے۔کشمیری معاشرے میں اس طرح کےکئی وجوہات اس کی ذمہ دار ہیں کہ نئی نسل کشمیری زبان کے تئیں منفی رویہ اپنا چکی ہےاور بہت تیز رفتاری سے اردواور انگریزی سیکھ رہی ہے۔تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ نوجوان نسل زیادہ تر گھریلو حالات میں کشمیری زبان کا استعمال کرتی ہےاور گھر سے باہرصرف اردواورانگریزی زبانیں رابطے کے لیےاستعمال ہوتی ہیں۔ انگریزی نے مقامی ثقافتوں اور زبانوں کوپسماندہ کردیا ہےاورکشمیری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بہت سے مطالعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ نوجوان نسل نےکشمیری زبان کے بارے میں کس طرح منفی رویہ اپنایا ہے۔ایک تحقیق کےمطابق یہ پتا چلا ہے کہ زیادہ ترکشمیری کشمیری زبان میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ہیں۔ اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے ایک مشہور کشمیری مصنف نے تبصرہ کیا کہ ’’یہ

بات محفوظ طریقے سے اخذ کی جاسکتی ہے کہ 95% خواندہ کشمیری کشمیری نہیں لکھ سکتے اور 5% سے کم اسے روانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اور بہت ہی کم کشمیری لوگ سنسکرت یا فارسی آمیز کشمیری شاعری سے واقف ہیں۔ تحقیق میں یہ بھی پایا گیا کہ خواتین زیادہ تر کشمیری سے اردو اور انگریزی کی طرف منتقل ہو رہی ہیں۔ کشمیر کے نوجوانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انگریزی عالمی زبان اور مواقع کی زبان ہے۔ انتظامیہ، ہوٹل، کاروبار، یونیورسٹی وغیرہ ہر حوالے سے اردو اور انگریزی کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے لوگ اپنی مادری زبان کی تاریخی اور ثقافتی قدر کو فراموش کر رہے ہیں۔ اس چیز کی ازد ضرورت ہے کہ کشمیری عوام اپنے ثقافتی ورثے اور اپنی شناخت یعنی کشمیری زبان کو بچانے کے لیے سوچیں اور عمل کریں۔

کشمیری زبان کے حوالے سے انتظامی پالیسی: کسی بھی زبان کے تحفظ اور ترقی کے لیے انتظامی پالیسیاں بہت ضروری ہیں۔ یہ حکومت ہی ہے جو کسی زبان کو سرپرستی دیتی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ لیکن جب کشمیری زبان کی بات آتی ہے تو اسے سابقہ ریاست جموں و کشمیر کے حکمرانوں کی طرف سے ہمیشہ کم ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ سیاسی جماعتوں کی طرف سے اپنے منشور میں کشمیری زبان کی منصوبہ بندی اور ترقی کے حوالے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔ کشمیری خطہ کشمیر کے لوگوں کی اکثریت کی مادری زبان ہونے کے ناطے اسے 2020 تک سرکاری درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن دوسری زبانوں جیسے فارسی، اردو اور انگریزی کو سابقہ ریاست جموں و کشمیر میں وقتاً فوقتاً سرکاری زبانوں کا درجہ حاصل تھا۔ 1889 میں اس وقت کے ڈوگرہ حکمران سری پرتاب سنگھ نے فارسی کی جگہ اردو کو سابقہ ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان کے طور پر اپنایا۔ اردو کشمیری، ڈوگری، بلتی، دردی، پنجابی، پہاڑی، لداخی اور گوجری کے ساتھ جموں و کشمیر کے سابقہ آئین کی علاقائی زبانوں میں سے ایک تھی۔ آزادی کے فوراً بعد، کشمیری کو بنیادی سطح تک مطالعہ کے مضمون کے طور پر متعارف کرایا گیا، لیکن ہندوستانی انتظامیہ نے اسے 1955 میں بند کر دیا۔ اردو کو انتظامیہ میں خصوصی حیثیت حاصل رہی، اسکولی سطح پر یہ مطالعہ کا مضمون اور ساتھ ہی ساتھ تدریس کا ذریعہ بن گئی۔ لیکن کشمیری کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ مختلف اسکالرز، ماہرین تعلیم، ماہرین اور سماجی اور ثقافتی تنظیموں کے طویل مطالبات اور تحریک کے بعد کشمیری لینگویج یونین (KLU) کشمیری لینگویج کا شعبہ کشمیر یونیورسٹی میں قائم کیا گیا۔ بعد میں انڈر گریجویٹ سطح پر کشمیری کو اختیاری مضمون کے طور پر متعارف کرایا گیا اور پھر 2008 میں سابق ریاست جموں و کشمیر میں آٹھویں جماعت تک کشمیری کو لازمی

مضمون بنا دیا گیا۔ حال ہی میں 2020 میں، جموں وکشمیر کی سرکاری زبانوں کا بل پارلیمنٹ میں منظور کیا گیا، جس میں کشمیری، ڈوگری اور ہندی کو جموں وکشمیر کی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کیا گیا۔ لیکن کسی بھی زبان کو محض سرکاری درجہ دینے سے کام نہیں چلتا۔ حکومت کو کشمیری زبان کو اس کی منصوبہ بندی اور ترقی کے لیے مکمل تعاون اور سرپرستی فراہم کرنا ہوگی، تاکہ یہ زبان جموں وکشمیر کے لوگوں کے ساتھ زندہ رہے اور اپنی ثقافتی اور لسانی شناخت سے محروم نہ ہو جائے۔ اس کے لئے ایک کشمیری لینگویج کمیشن ہونا چاہیے، جسے اس زبان میں تحقیق کی ذمہ داری دی جائے اور جو جموں و کشمیر کی حکومت کو کشمیر کے لوگوں کی لسانی شناخت کے تحفظ کے لیے اقدامات تجویز کرے۔ حکومت کی طرف سے کشمیری زبان کے تحفظ کے حوالے سے حالیہ پیش رفت پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کشمیری زبان کو درمیانی سطح پر حکومت جموں وکشمیر کی طرف سے ایک لازمی مضمون کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا، لیکن اس کی ضرورت کے مطابق صرف تعارف ہی کافی نہیں ہے۔ نچلی سطح پر اسے نافذ کرنے کے لیے انتظامیہ کی طرف سے مکمل تعاون اور منصوبہ بندی ضروری ہے۔ کشمیری زبان کو سرکاری حیثیت دینے کی بات کرتے ہوئے حکومت کو مختلف تعلیمی، ثقافتی اور غیر سرکاری تنظیموں کی مکمل سرپرستی اور تعاون لازمی ہے جو کشمیری عوام کی لسانی شناخت کے تحفظ کے لیے بہترین طور پر کام کر سکتی ہیں۔

کشمیری زبان کی تعلیم سے متعلق مسائل: اگرچہ خطہ کشمیر کے لوگوں کی اکثریت کی مادری زبان کشمیری ہے لیکن 2020 تک اسے سرکاری حیثیت نہیں دی گئی اور پھر مختلف سماجی، ثقافتی اور سیاسی تنظیموں کے دیرینہ مطالبات کی وجہ سے اسے سرکاری فہرست میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ 2008 میں جموں وکشمیر حکومت نے آٹھویں جماعت تک کشمیری کو لازمی مضمون کے طور پر متعارف کرایا لیکن کشمیری زبان کی تعلیم، اساتذہ کی تربیت اور نصاب کے حوالے سے کسی مناسب تحقیق اور منصوبہ بندی سے کام نہیں لیا گیا۔ کشمیری مضمون اگرچہ اسکولوں مین متعارف کرایا گیا لیکن اس مضمون سے وابسطہ اساتذہ کی تقرری عمل میں نہیں لائی گئی، بلکہ سائنس، سوشل یہاں تک کہ کھیل کود کے اساتذہ کو معمولی سی ٹریننگ دے کر اسکولوں میں ان سے کشمیری مضمون پڑھایا گیا، جو کہ اس زبان کے ساتھ سراسر ناانصافی تھی اور یہ سرکاری عمل کشمیری زبان کی تعلیم اور یہ زبان سکھانے میں بڑی رکاوٹ بن گئی۔ اب یہ حکومت، والدین، اسکولوں اور ثقافتی تنظیموں کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوان نسل کے لیے ایسی سرگرمیاں اور پروگرام منعقد کریں جس سے کشمیری زبان کا ذوق پروان چڑھے۔ اور اس دوران

حکومت کو چاہیے کہ وہ نئی پالسی تیار کر کے کشمیری زبان پڑھانے اور سکھانے کے لیے خصوصی طور پر کشمیری اساتذہ کی بھرتی عمل میں لائے۔ اور وادی کے مختلف تربیتی اور تعلیمی اداروں کی طرف سے ان اساتذہ کی پیشہ ورانہ ترقی کے لیے ایک مسلسل عمل ہونا چاہیے۔ تا کہ وہ زبان کی تعلیم اور زبان سیکھانے کے نظریات میں جدید ترین پیش رفت سے لیس ہوں۔ ایسے اساتذہ کے لیے ورکشاپس کا انعقاد کیا جانا چاہیے تا کہ انھیں زبان کی تدریس کے حالیہ طریقہ کار سے آراستہ کیا جا سکے۔ والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان میں بات کرنے کی ترغیب دیں۔

حوالہ جات:

بھٹ، راکیش۔ لینگویج پلیننگ اینڈ لینگویج کنفلیٹ۔ انٹرنیشنل جرنل آف دی سوشیالوجی آف لینگویج، جلد۔ 75، 1989، صفحہ 73۔85۔

بھٹ، روپ کرشن۔ اے ڈسکرپٹیو سٹیڈی آف کشمیری۔ دہلی: امر پرکاشن دہلی، 1987۔

بائرم، مائیکل۔ روٹلیج انسائیکلوپیڈیا آف لینگویج ٹیچنگ اینڈ لرننگ۔ روٹلیج، 2004۔

کول، اومکار ناتھ۔ کشمیری لینگویج، لنگوسٹکس اینڈ کلچر۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، 2000۔

کول، اومکار ناتھ۔ سٹڈیز ان کشمیری لینگویج، دہلی: انڈین انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج اسٹڈیز، 2005۔

☆☆☆

Mehjoor:Kashmiri Adab ke Tanazur mein by Sabzar Ahmad Naikoo
(NRLC,Punjabi University,Patiala)cell-6005130283
سبزار احمد نائیکو (این-آر-ایل-سی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ)

مہجور: کشمیری ادب کے تناظر میں

بیسوی صدی پوری دُنیا میں سیاسی اور سماجی انقلاب آمیز نعرے لے کے آئی اور ادب نے بھی یہی طریقت اختیار کر لی۔ کشمیری میں اس کی سربراہی غلام احمد مہجور نے کی۔ جس نے شعری کو درباری ایوانوں اور عوامی حلقوں تک پہنچانے میں ہر ایک ممکن کوشش کی۔ جس میں وہ صفل بھی رہے۔ مہجور نے کشمیری شاعری کو تصوف اور مابعد الطبعیات کے دایرے سے آزاد کیا اور پھر اس کو زندگی کے بنیادی اور ٹھوس حقایق سے روبرو کرایا۔ مہجور کی ولادت پلوامہ ضلع کے متری گاوٗں میں ہویی لیکن اُن کی پیدایش کے تاریخ کے بارے میں مختلف نقادوں اور مورخوں کی مختلف رایے ہیں۔ آزاد نے اُن کی تاریخِ پیدایش کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"بابا حضور کی نواسی سعیدہ بیگم کے ساتھ عبداللہ شاہ نوبوگ کی شادی ہویی۔ اسی خاتون کی بطن سے موضع متری گاوٗں میں بارہ شوال ۱۳۰۵ھ میں جمعرات کی رات کو گیارہ بجے مہجور پیدا ہویے"۔

(عبدالاحد آزاد، کشمیری زبان اور شاعری، جلد ۳، کلچرل اکادمی سری نگر ص، ۲۶۵)

ابن مہجور محمد امین اور محمد یوسف ٹینگ صاحب نے یہ تاریخ 21 ذی قعدہ ۱۳۰۶ھ جمعرات بمطابق 11 / اگست ۱۸۸۸ عیسوی درج کیا ہیں۔ (محمد یوسف ٹینگ، مہجور شناسی، ص ۱۱)

امین کامل نے مہجور کی پیدایش ۲۲ ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ بمطابق ۳ ستمبر ۱۸۸۵ عیسوی رات کے دس بجے کا بتایا ہے۔ (امین کامل، مہجور نین بونین تل، ص ۱۶)

خیر اُن کی پیدایش پہ جو مختلف نقادوں میں تضاد رہا وہ ایک بحث کا معاملہ ہے لیکن سچایی یہ ہے کہ مہجور انیسوی صدی میں پیدا ہویے اور کشمیریوں کی غلامی اور محکومی کو بڑے پیمانے پہ اُجاگر کیا۔ مہجور کی شاعرانہ شخصیت کا قد اُن کے ہم عصر سخن وروں اور عالموں سے گہری وابستگی اور قُربت کا نتیجہ ہیں۔ مہجور ادب کے ہر گوشے سے آشنا تھے۔ ادب اور تواریخ میں اُن کی باریک بینی کے سب قایل تھے جس کی وجہ سے عالمی ادب اور ہندستانی ادب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مہجور کی

شاعرانہ شخصیت پہ ایک گہرا اثر پڑا۔ علاوہ ازیں مہجور کو روایتی صوفی اور رومانی شاعری کے سرچشمے دستیاب تھے جن میں انھونے حبہ خاتون، مقبول شاہ کرالہ واری اور رسُل میر کے طرز پہ بحریں سجایں۔ غلام احمد مہجور اس بات کا اعتراف کرتے ہوے کہتے ہیں:

مہجور لا گتھ آو بیہ دوبا راتی روز　　　اتھ درد صورژ پرٛدٕتھ گوسہ رسُل میر

تی کٔنٛن ترٛو ے خانن منز　　　میر سُند پرون مس لودنین بانن

جاے تمی رٹ پرستانن منز　　　مہجور باگراو پھرٛژ پیانن

مہجور طالبِ علمی کے دِنوں سے ہی اُن شاعروں اور قلمکاروں سے ملتے رہے جن کی رہبری اور مشوروں سے اُن کی شاعری نے ایک خاص اثر اختیار کرلیا۔ مہجور کا باپ، عبداللہ شاہ فارسی زبان کے بڑے عالم تھے۔ انھوں نے پہلے اپنے باپ ہی سے سعدی کی گلستانِ بوستان جیسی کتابیں پڑھیں۔ اُن کے والدین اچھے خوشنویس تھے اور باپ پیر مریدی سے جُڑے ہوے انسان تھے جس کی وجہ سے مہجور کو گھر میں ہی علمی ماحول میسر ہوا ہوگا۔ انھونے گھر میں ہی قرآن شریف کی نو پارہ حفظ کی تھی۔ اُس کے بعد اُن کو ترال بھیجا گیا جہاں اوخن صاحب عبدالغنی گنائی کا ایک مکتبہ تھا۔ جہاں سے مہجور نے "پنج گنج نظامی" کی ڈگری حاصل کی۔ عبدالغنی گنایی کاملِ اُستاد ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور خود کا تخلص "عاشق" رکھا تھا۔ عاشق ترالی نے کشمیری ادب کو دو کتابوں سے اضافہ کیا ہے۔ "گلزارِ حسن" جو ایک سوانح کتاب ہے اور "زہرا و بہرام" جو فارسی پیدائشی ایک عشقیہ داستان ہے۔ عاشق ترالی کے صحبت تلے مہجور نے خوبصورت شاعرانہ وزن پکڑا جس کا احساس عاشق ترالی کے اِس شعر کے واقعے سے پتہ چلتا ہے:

زہر تمسے جانِ جانانس دِتھ

عاشق ترالی نے اس شعر کا دوسرا مصرہ مکمل کرنے کے لیے مہجور کو کہا اور مہجور نے شعر کو یوں مکمل کیا:

سِم قاتل شکرستانس دِتھ

۱۹۰۵ عیسوی میں مہجور کی ملاقات ایک بڑے فارسی شاعر بسمل کے ساتھ امرتسر میں ہویی۔ بسمل کے گھر میں شاعری محفلوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا جن مین بڑے بڑے عالم شرکت فرما کرتے تھے۔ اس شاعرانہ فضا کا اثر بالواسطہ مہجور پہ پڑا اور انھونے فارسی میں قلم آزمایی شروع کی۔ بسمل کے گھر میں مہجور کی ملاقات اردو کے مایا ناز عالم اور شاعر مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ ہویی۔ مولانا شبلی نے مہجور کا شعری ذوق تبھی پہچانا تھا جب انھوں نے مہجور کو مہجور تخلص رکھنے کا سبب پوچھا تھا۔ انھوں نے

پوچھا تھا کہ آپ کس سے مہجور (دور) ہو؟ مہجور نے جواب میں کہا تھا "اپنے وطن سے"۔شبلی نے پھر پوچھا تھا کہ وطن واپس پہنچنے کی بعد کس سے دور ہونگے۔مہجورؔ نے جواب میں کہا تھا۔

" حضرت آپ سے"۔ اُن کا جواب سُن کے شبلیؔ صاحب بہت خوش ہوے اور مہجورؔ کو شاندار شاعرانہ عظمت اور واہ واہی دی۔امرتسر میں رہ کے مہجور نے مشہور کاتب غلام علی سے چھے ماہ کی کتابت سیکھی۔اسی دوران بسملؔ تعلیم السلام ہایی سکول قادیانی میں بحیثیت فارسی اُستاد مقرر ہوے اور انھوں نے مہجور کو وہی بلایا۔مہجور نے قادیانی کے اخبار "البدر" کے لیے ایک سال تک کتابت کی۔مہجور کو قادیان میں اخبار اور ادبی کتابیں پڑھنے کا خوب موقعہ ملا۔ان ہی دِنوں منشی محمد الدین فوقؔ نے "کشمیری میگزین" کے نام کا ایک ماہانہ رسالہ نکالا۔جب مہجورؔ کی نظر اس رسالے پہ پڑی اور فوقؔ کو اپنا ہم خیال مانا۔پھر اُن ہی کے ساتھ لاہور میں کچھ وقت صرف کیا۔اِن شخصیات کے ساتھ رہ کے مہجور کے شعری کردار نے ایک الگ رنگ پکڑا۔جس کے نتیجے میں شعری میں الگ طرح کے آہنگ اور انہار رونما ہوے۔مہجور کی شخصیات کے محرکات وہ ادبی محفلیں اور مُشاعرے بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۱۲ عیسوی میں اسی طرح کے ایک مشاعرے میں مہجورؔ نے شرکت کی جو لدھیانہ کی انجمن "بزمِ ادب" ہر پندراہ دن کی بعد آفت لدھیانوی کی سرپرستی میں پنجاب میں منعقد کراتی تھی۔ مہجور نے اس انجمن کے ایک مشاعرے میں اپنی ایک غزل پیش کی۔جس کے شعر اس مشاعرے کے طرحی مصرے کے ردیف قافیہ پے بنے تھے۔

اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھُپکر دل مفطر ہی میں دلبر کا قیام اچھا ہیں

اِس شعر پر مہجورؔ کو کھڑے اٹھ کے واہ واہی اور شاباشی دی گئی۔

سرینگر کے نمایش گاہ میں ۱۹۳۴ عیسوی میں ایسا ہی ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔چودھری خوشی محمد ناظرؔ کے کہنے پہ مشاعرے میں فارسی، اردو اور پنجابی زبان کے ادیب جن میں حفیظ جالندھریؔ اور روشن صدیقی بھی شامل تھے۔چونکہ مہجورؔ تب تک فارسی اور اردو شاعری کرتا تھا اس لیے اُن کو بھی دعوت دی گئی تھی۔مہجور نے طرحی اردو غزل کے ساتھ ساتھ کشمیری نظم پڑھنے کا بھی اصرار کیا۔اور مہجور نے "باغِ نشاط کے گلو نازکران کران ولو" پڑھا۔اس کے علاوہ وہ طرحی غزل بھی جس کا مصرع یوں تھا:

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مہجور کی شاعرانہ شخصیت کے محرکات میں فارسی شاعری کے ناماور شاعر سعدیؔ، حافظؔ، اور رومیؔ اور اردو زبان کے غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ اور ٹیگورؔ جیسے مشہور شاعروں کے کلام کے مطالعے کا اثر

واضع ہے۔علاوہ ازیں مہجوراس دور کے سیاست دانوں جن میں شیخ محمد عبداللہ،محمد افضل بیگ،غلام محمد صادق اور پریم ناتھ بزاز کے ساتھ بھی قُربت حاصل تھی۔جن کے خیالات سے مہجور کا سیاسی نظریہ بہت حد تک متاثر ہوا تھا۔جس کا ثبوت ہمیں اُن کی سیاسی شاعری پڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔

"ہمدرد" اخبار جو شیخ محمد عبداللہ اور پریم ناتھ بزاز نے یکم اگست ۱۹۳۵ عیسوی میں کشمیریوں کے سیاسی،قومی اور تمدنی خواہش کا علمبردار تھا اسی میں مہجورؔ کی کشمیری نظم " گریس کور" اور قومی ترانہ "ولو ہو باغبانو نو بہارُک شان پیدا کر" شایع ہوئے۔یہ اُن محرکات کی نشاندہی تھی جن کی وجہ سے مہجورؔ کی شاعرانہ شخصیت کا تعمیر ہوا۔لیکن مہجور نے کب شاعری لکھنے کا آغاز کیا اُس کے بارے میں عبدلاحد آزاد لکھتے ہیں کہ ۱۹۰۵ عیسوی کی شروعات میں مہجور کو اپنے ایک دوست کو خط لکھنے کی ضروت پڑی۔اُن کے دوست کو بھی اپنی علمی قابلیت پہ ناز تھا۔مہجور کو اِس دوست سے کچھ گلے شکوے تھے۔اس لیے انھونے بڑے جوش میں پچیس (۲۵) شعروں کا،خاص انداز میں ایک منظوم خط لکھا۔تب تک اُن کا کوئی تخلص نہیں تھا اس لئے انھوں نے اس شعر میں اُن کا نام ہی درج کیا:

شنو نام من جمع کُن یادارو یک اندر دو چارو چہل باچہار

یہ منظوم خط بہت چرچے میں آیا جس کی وجہ سے مہجورؔ فارسی میں ساتھ سال تک لگاتار لکھتے رہے۔

☆☆☆

Saadi Shirazi ki Shairi mein Payam-e-aman by Dr. Safi Mohd. Naik
(dept.of Persian,Delhi University,Dehli)cell-9868326552
Dr. Shazia Bano(dept.of Persian,Jamia Millia Islamia University)
ڈاکٹر صفی محمد نایک (شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی)
ڈاکٹر شازیہ بانو (شعبہ فارسی، دانشگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

سعدی شیرازی کی شاعری میں پیام امن

لفظ امن کے معنی لغوی اعتبار سے بے خوف ہونا اور اطمینان وسکون کے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر "بدامنی سے آزادی"۔ لفظ امن چند حروف کا جوڑ ہی نہیں بلکہ اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ بندہ ناچیز کا تعلق ریاست جموں کشمیر سے ہے جہاں عرصہ دراز سے لوگ ایک دوسرے کو امن و آشتی و رواداری کا درس دیتے ہیں۔ ہمارے اس خطے کے علاوہ آج تمام دنیا کے لوگ بمشکل ہی لفظ امن سے آگہی رکھتے ہیں۔ اگر کوئی آشنائی رکھتا بھی ہے لیکن اس پر عمل پیرا نہیں۔ درحقیقت روی زمین کا ہر ایک انسان امن کی جستجو میں ہے۔ اگر فارسی زبان و ادبیات کا مطالعہ کیا جائے تو بخوبی معلوم ہوگا کہ پروردگار نے اس زبان وادب پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر فارسی زبان و ادبیات نے ایسے نامور فنکار پیدا کیے جن کی تخلیقات سے نہ صرف فارسی ادب ہی فیضیاب ہوا بلکہ تمام دنیای ادب کے لئے وہ تخلیقات مشعل راہ بن گئیں۔

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی   ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا۔

ایسے ہی تخلیق کاروں میں ایک نام مصلح الدین سعدی شیرازی کا بھی ہے جن کا نام اور شخصیت صرف علما ہی کے لیے نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی تعریف کا محتاج نہیں۔ بہر حال اس کی تعریف میں چند کلمات آپ کے سامنے رکھوں۔ مغلوں کے فتنہ سے جب سرزمین ایران بے گناہوں کے خون سے لالہ زار تھی، گھر ویران اور مسجدیں تباہ ہوئی، کتاب خانے جلایے گئے، بڑے بڑے عالموں کو بے دردی سے شہید کیا گیا، اسی زمانے میں ایک نادر روزگار ہستی وجود میں آئی جس کے ادبی کارناموں نے اہل ایران کے مجروح دلوں پر مرہم کا کام کیا۔ میری مراد بزرگوار ہستی شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔

آپ کا اسم گرامی مشرف الدین ہے اور سعدی تخلص، آپ شیراز میں پیدا ہوئے۔ شیخ

سعدی کی سوانح لکھنے والوں نے کہا ہے کہ شیخ نے اپنی زندگی میں چار کام انجام دیے ہیں: تقریباً تیس سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے، تیس سال سیر و سیاحت کا کام انجام دیا، تیس سال تصانیف کا کام انجام دیا اور بقیہ زندگی گوشہ نشینی میں گزاری۔ مجموعی طور شیخ سعدی نے اپنی زندگی اچھے کاموں میں صرف کی ہے۔ شیخ سعدی کا مجموعہ کلام تین کتابوں پر مشتمل ہے۔ جس میں گلستان و بوستان اور غزلیات شامل ہیں۔ گلستان میں نثر کے ساتھ اشعار بھی ہیں جسے ہم فارسی زبان میں نثر آمیختہ بہ نظم کہتے ہیں۔ بوستان سعدی منظومات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کتابوں میں اخلاق و دانش اور پند و نصائح کے عناصر جابجا پائے جاتے ہیں۔ غزلیات میں عشقیہ مضامین کے علاوہ کچھ ذاتی واقعات بھی شامل ہیں۔ سعدی شیرازی کے کلام کے مختلف پہلو ہیں جس میں اخلاق و دین، عرفان، امن و آشتی، رواداری، انسان دوستی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے کلام کو سات سو سال گزر جانے کے بعد کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ گلستان سعدی کے وہ اشعار جن کی گونج اقوام متحدہ کی عمارتوں تک پہنچیں یعنی ان کے کلام کی شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ذیل کے اشعار نیو یارک میں اقوام متحدہ کی عمارت پر کندہ ہیں:

بنی آدم اعضای یکدیگرند　　　　که در آفرینش ز یک گوہرند

چو عضوی بدرد آورَد روزگار　　　　دگر عضوہارا نماند قرار

ترجمہ: تمام انسان ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہیں، جن کی تخلیق ایک ہی روح سے ہوئی۔ جب وقت کی آفات سے ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرے اعضاء قرار سے کیسے رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ سعدی کا رجحان مولانا رومی، حافظ اور دوسرے عارف شعراء کی نسبت عرفانی اور صوفی شاعری کی طرف کم ہے لیکن وہ آدمیت کو ایک ہی ریشہ اور ایک ہی گوہر سے تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے بہت ہی خوبصورت انداز میں اہل جہان کو رواداری، انسان دوستی اور امن و آشتی کا درس دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ دنیا کے مختلف انسان انسانی جسم کے اعضاء کی مانند ہیں اور جن کی تخلیق ایک ہی جوہر یا ذات سے ہوئی ہے اور اگر جسم کا کوئی ایک حصہ یا عضو تکلیف میں ہو تو دوسرے عضو میں کیسے آرام ہو سکتا ہے جسم کے دوسرے حصوں میں قطعاً امن و سکون نہیں ہوگا. سعدی انفرادیت اور ذات کی نسبت پر پورے سماج اور معاشرے کی بات کرتے ہیں وہ کسی ایک قوم یا ملک کے بارے میں نہیں بلکہ پوری دنیا کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے ہر طبقے کو امن، رواداری اور بھائی چارگی کا پیغام دیتے ہیں۔ ایک بہتر سماج کی تعمیر کے لیے عدل و انصاف اور اخوت و محبت کو بنیادی لوازمات قرار دیتے ہیں جن کا ثبوت ان کی لطیف حکایتوں اور پر مغز اشعار میں ملتا ہے۔ سعدی شیرازی نے زندگی کے تلخ حقائق کو

خندہ پیشانی سے برداشت کیا ہے اور کبھی شکوہ وشکایت سے زبان وقلم کو آلودہ نہیں کیا، کبھی ذکر بھی کیا تو اس انداز سے کہ پڑھنے والوں کو اس سے سبق حاصل ہو۔ ایک حکایت میں لکھتے ہیں کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے پاؤں میں جوتا بھی نہ رہا، پیسے پاس نہیں تھے کہ جوتا خرید لیتا اسی حالت میں جب میں کوفہ آیا تو وہاں ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ہی نہیں تھے اللہ کا شکر ادا کیا کہ جوتا نہ سہی پاؤں تو ہیں۔سعدی اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کو ہمیشہ جنگ کے بجائے امن وآشتی کو ترجیح دینی چاہیے اور دوسرے عوامل کو ذریعہ بنا کر کسی خاص یا عام مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے۔اور اس وقت جنگ کو آخری چارہ سمجھنا چاہیے جب امن وآشتی کی ساری کوششیں بے ثمر ثابت ہوں۔فرماتے ہیں کہ:

من امروز کردم در صلح باز ... تو فردا مکن در بہ رویم فراز

ہنوز از سر صلح داری چہ بیم؟ ... درعذر خواہان نبندد کریم

ترجمہ: میں نے صلح کا دروازہ آج کھول دیا اس لیے آپ بھی میری طرف بڑھیں اس کام کو کل پر مت چھوڑیں۔کیا تمہیں ابھی بھی جنگ کے بجائے صلح کرنے میں کوئی ڈر لگتا ہے بڑے لوگ بہانہ بازی نہیں کرتے اور صلح کے دروازے بند نہیں کرتے۔سعدی شیرازی اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ کسی قوم کے درمیان جنگ بھی چھڑ جائے تو جنگ کے دوران بھی صلح کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے اور کسی بھی قیمت پر صلح اور آشتی کو ہاتھ کو جانے نہیں دینا چاہیے۔منجملہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ امن وآشتی، رواداری، بھائی چارگی اور اسی قبیل کے دوسرے عناصر سمجھنے کے بعد ہمیں بالکل یہ گوارا نہیں کرنا چاہیے کہ دنیا بیک وقت بدل جائے بلکہ ہم سب فرداً فرداً خود ان معنی خیز اصطلاحات پر عمل پیرا ہوں۔اگر ہم ذاتی طور پر ناامید، فخر اور خشم آلودگی کا شکار ہوں تو پھر کیسے ایک مثالی معاشرے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

منابع: 1۔گلستان سعدی، مرتبہ، غلام عباس ماہو، اعتقاد پبلشنگ ھاؤس، نئید ھلی۔2004ء۔
2۔بوستان سعدی، مرتبہ، غلام عباس ماہو، اعتقاد پبلشنگ ھاؤس، نئی دھلی۔2004ء 3۔تاریخ ادبیات در ایران، ذبیح اللہ صفا، خیابان مجاھدین اسلام، تھران 1369ش۔4۔نگاہی بہ تاریخ ادب فارسی در ہند، دکتر توفیق سبحانی،، انتشارات دبیر خانہ شورای گسترش زبان وادبیات فارسی، چاپ اول .51377۔لغتنامہ دہخدا، علی اکبر، سازمان مدیریت وبرنامہ ریزی کشور ومرکز تحقیقات رایان ہای قائمیہ اصفہان، تہران، ۱۳۴۲ ھ ش.6۔نعمانی، شبلی: شعر العجم، جلد: ۳، ۴، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، اوترا پرادیش، ہند، ۲۰۰۷م.☆☆☆

Makhdoom ki Ishqiya Shairi by Dr. Zahoor Din(Asst. Prof. Urdu
Govt. Degree College Thathri,Doda)cell-8493093623
ڈاکٹر ظہور دین (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، ٹھاٹھری، ڈوڈہ)

مخدومؔ کی عشقیہ شاعری

یاد کے چاند دل میں اُترتے رہے　　　چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا　　　کوئی آواز آتی رہی رات بھر

مخدومؔ کی غزل کے یہ اشعار اُس کیفیت کو بیان کرتے ہیں جو عشق کے ہاتھوں میں پروان چڑھتی ہے حالانکہ مخدوم ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور پھر جدیدیت سے متاثر ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں عشقیہ شاعری کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ دراصل مخدوم کے تصورِ عشق میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ عشق کی دوامیت ہے۔ عشق لافانی ہے، عشق ہی وجہ تخلیق کائنات ہے۔ یہ روز و شب کا ہنگامہ بھی عشق کی دین ہے اور ازل سے ابد تک عشق کی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عشق کی آگ میں جل کر فنا ہونا ہی انسان کی زندگی کا مقصد ہے تاکہ وہ زندگی اور موت کے ساتھ ساتھ کائنات کی ہر شے سے چھٹکارا حاصل کر سکے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کے یہاں عشق کے حوالے سے ''مکتی'' کا تصور ملتا ہے۔

دو بدن　　　پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرفِ وفا　　　پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا　　　(چارہ گر)

مخدومؔ اپنی شاعری میں عشق کی اُس کیفیت کا بیان کرتے ہیں جو انسان کو ہر چیز سے بیگانہ کر دیتی ہے پھر انسان کفر و ایمان کی بحث سے آگے نکل جاتا ہے۔

مسجدوں کے میناروں نے دیکھا اُنہیں　　　مندروں کے کواڑوں نے دیکھا اُنہیں
میکدوں کی دراڑوں نے دیکھا اُنہیں　　　(چارہ گری)

مخدومؔ کے یہاں عشق دراصل ایک ایسی صدا ہے جو صورِ اسرافیل پھونکنے جانے تک اور شاید اس کے بعد بھی فنا نہیں ہو سکتی۔ عاشق صادق منصور کو صلیب پر لٹکا یا گیا لیکن اس کے دل میں

موجود عشق کی صدا فرش سے بلند ہو کر عرش تک جا پہنچی۔ عشق کی یہی آواز آج تک انسانوں کی رہنمائی کرتی رہی ہے اور اسی نے آج تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ عشق کی یہ آواز ہر دم انسان کا پیچھا کرتی ہے۔

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ گہرے کنویں میں مگر ایک آواز پیچھا کرے گی
وہ آواز ناخواستہ طفلکِ بے پدر
ایک دن سولیوں کے سہارے
بنی نوعِ انسان بادی بنی پھر خُدا بن گئی (لختِ جگر)

لیکن مخدومؔ کہتے ہیں کہ عشق کی منازل کو طے کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ آگ کی وادیوں کا سفر ہے۔ ہر دور کی دوا دنیا میں موجود ہے لیکن عشق ایسا درد ہے جس کی کوئی دوا کوئی علاج نہیں۔ یہ درد جس قدر شدت اختیار کر جائے اسی قدر اسرار انسان پر کھلتے جاتے ہیں بقول مخدومؔ

اس گل اندام کی چاہت میں بھی کیا کیا نہ ہوا درد پیدا ہوا، درماں کوئی پیدا نہیں ہوا

عشق دراصل ایک ایسا لاعلاج درد ہے جس میں بقول مخدومؔ ابدیت کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اس کا کوئی چارہ گر نہ آج تک پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا جو اس کی دوا لا سکے۔

ازازل تاابد یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے (چارہ گر)

مخدومؔ کا خیال ہے کہ عشق کے درد و غم کو بڑھتے ہی رہنا چاہئے اس لئے کہ محبت وہ کیمیا ہے جو روح کو تمام آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک کر کے پاکیزگی عطا کرتی ہے۔

کوہ غم اور گراں، اور گراں اور گراں غمزدہ شیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

دراصل عشق کی اقدار عالم انسانیت کی اعلا ترین اقدار ہیں۔ عشق انسان کو قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان اور انسانی زندگی کی عظمت دراصل عشق کی عظمت میں پوشیدہ ہے۔ عشق دل کی سختی کو ختم کر کے انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتا ہے۔

صدیوں سے صدف بند، گہر بند، نظر بند وہ جان صدف جان گہر آ تو رہا ہے

عشق کی دوامیت کے علاوہ مخدومؔ کے تصورِ عشق کا ایک اور اہم پہلو عشق کی افادیت ہے۔ ہر شخص اپنی ایک الگ انفرادیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے اندر عشق کا جذبہ کسی نہ کسی صورت

ضرور موجود ہوتا ہے۔

وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا میرا ہی نہ تھا　　وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے　　لاکھ دل ہوتے تھے
لیکن جب دھڑکتے تھے تو اک دل کی طرح　　جب مچلتے تھے تو ایک دل کی طرح
جب مہک اُٹھتا تھا دل

سارے انسانوں کو آپس میں جوڑے رکھنے والا جذبہ عشق ہی ہے۔ ساری کائنات کا رنگ و نور عشق کے دم سے قائم ہے۔ عشق سے ہی اس کائنات میں حرکت و حرارت موجود ہے۔ اگر

عشق نہ ہو تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے　　بے صحبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی مے وہی مے خانہ وہی ہے　　ہے اسی کے جمالِ نظر کا اثر
زندگی زندگی ہے　　سفر ہے سفر سایۂ شاخِ گل بن گیا
بن گیا ابرارِ رواں　　دوستو!

مخدوم کی غزل کے یہ اشعار بھی اسی جذبے کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایک پری چہرہ کہ جس چہرے سے آئینہ بنا　　دل کہ آئینہ در آئینہ پری خانہ بنا
ہے چراغاں ہی چراغاں سرِ عارضِ سرِ جام　　رنگ صد جلوۂ جانانہ صنم خانہ بنا

عشق کی کہانی نئی نہیں ہے۔ یہ کہانی روز ازل سے جاری ہے۔ اب زندگی چاہے لاکھ بدلتی جائے۔ زمانہ چاہے ہزاروں رنگ بدلے یہ حسن و عشق کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا اور نئی نئی کہانیاں وجود میں آتی رہیں گی۔

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں　　روز نکلے گی بات پھولوں کی
دلوں کی تشنگی جتنی دلوں کا غم جتنا　　اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات

مخدوم کی عشقیہ شاعری کی تیسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے عشق میں ارضیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں عشق دو روحوں کے ہم کلام ہونے کا نام ہے یعنی مخدوم کی شاعری کا محبوب واضح طور پر اپنی نسوانی خصوصیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔

یاد آئیں وہ چاندنی راتیں　　وہ ہنسی، چھیڑ، دل لگی، باتیں
چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی　　آئی آواز اس کی باتوں کی　(سجدہ)

مخدوم کی نظم ''لمحۂ رخصت'' ملاحظہ کریں جس میں محبوب کا نسوانی وجود اپنی معشوقانہ

نفسیات کے ساتھ سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو　　　　کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا بانہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کی حیا سے جُھک جانا
اک شوق ہم آغوشی پنہاں　　　　ان نیچی بھیگی پلکوں میں
شانوں پہ پریشاں ہونے کو　بے چین سیاہ کاکل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

مخدومؔ کی ایک نظم ''طور'' ہے جس میں کھیتوں کا پس منظر ہے۔ یہ کھیت اور پانی وصال کا پس منظر بھی ہیں اور مقام کا تعین بھی کرتے ہیں۔ اس میں عاشق و معشوق کے میل جول کا بیان ہے جو کہ اب ماضی بن چکا ہے۔

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی　　　　مگر اس عیش رفتہ کا ہے ایک دھندلا نشاں باقی

مخدوم کا تصور عشق مقدس ہے۔ یہاں صرف عشق حقیقی کی ہی کارفرمائی نظر آتی بلکہ جسم اور جسمانیت رکھنے والا عشق بھی نظر آتا ہے۔ مخدوم کی شاعری میں دو روحوں کا ہی نہیں بلکہ دو بدنوں کا اتصال اور اختلاط بھی نظر آتا ہے۔ عشق کی یہ کہانی ہر دل کو اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال عشق کی عظمت اور تقدس سے منکر ہونے والا انسانی صفات سے عاری کہا جا سکتا ہے۔ عشق کے دم سے زندگی کی رنگا رنگی کے حوالے سے مخدومؔ کے یہ اشعار دیکھیں:

زندگی لطف بھی ہے، زندگی آزاد بھی ہے　　　　ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرت دیدار بھی ہے　　　　زہر بھی، آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے، زندگی دلدار بھی ہے (آج کی رات نہ جا)

انسانی زندگی دراصل تضادات کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ تصادم کی صورتِ حال عشق میں بھی نظر آتی ہے جس میں زندگی کے مظاہر باہم متصادم رہتے ہیں۔ مخدوم کے الفاظ ہیں۔

وصل ہے ان کی ادا ہجر ہے ان کا انداز　　　　کون سا رنگ بھروں عشق کے افسانوں میں

ہجر اور وصل عشق کے دو پہلو ہیں۔ ان دونوں کا کردار عشق کی کہانی میں عاشق و معشوق کی طرح ناگزیر ہے لیکن مخدوم ایک ایسے شاعر ہیں جن کی عشقیہ شاعری میں وصل کا رنگ زیادہ گہرا اور تابناک نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں اُن کی عشقیہ شاعری میں ہجر کی اذیت اور کرب والم کا اظہار بھی ملتا ہے

لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔ مخدومؔ کی وصل سے معمور عشقیہ شاعری قاری کو گردشِ لیل ونہار سے نکال کر ماورائی جہانوں کی سیر کراتی ہے۔ عشق کی یہ صورتِ حال ملاحظہ کریں:

کب چھلک جائے تری لبریز وفا آنکھوں سے مہر کی مے
کب نکل آئے ترے پیار کا چاند توڑ دے حلقۂ زنجیر شب وروز
کہ یہ سلسلۂ کرب والم ختم تو ہو اور ہو جائے جنوں آوارہ
تو مرے حلقۂ آغوش میں آ (جز تری آنکھوں کے)

مخدومؔ کبھی کبھی ملاقات کا ایک ایسا منظر تعمیر کرتے ہیں کہ وصل وہجر ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور عشق کی دوامیت کے ساتھ یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ منظر اور یہ سفر کبھی ختم نہ ہو۔

ستارہ ہم نشیں ہے ماہ ہم نفس ہے
سازِ جاں نواز ساتھ گریز کا سفر ہے
ایک ایک پل ہے جاوداں الٰہی یہ سفر کبھی ختم نہ ہو (ملاقات)

بہر حال مخدوم کی عشقیہ شاعری میں ہمیں عشق کی دوامیت، افاقیت اور ارضیت کے پہلو نظر آتے ہیں اور یہ تمام پہلو مل کر اُن کی شعری کائنات کو دھنک رنگ بنا دیتے ہیں۔

☆☆☆

Asri talim ke hawale se Ibn-e-Sina ke talimi falsafa ki ahmiyat by
1.Dr. Imran Ansari 2.Dr.Ameen Ansari(Asst.Professors MANUU
College of education,Asansol)cell-8882424421

1. ڈاکٹر عمران انصاری* 2. ڈاکٹر امین انصاری*
(اسسٹنٹ پروفیسرز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن– آسنسول)

عصری تعلیم کے حوالے سے ابن سینا کے تعلیمی فلسفہ کی اہمیت

تعارف:

اسلامی تعلیمی نظام کیا ہے اس سے متعلق حالیہ دہائیوں میں کچھ اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں جس میں تعلیم کا مقصد، اس کا بنیادی فلسفہ ومفروضات اور اس کا نظام قدر شامل ہیں۔ مثال کے طور پر انسانوں کے ساتھ معاشرے کی جدید ضروریات کے لحاظ سے کس طرح کا اسلامی نظام تعلیم درکار ہے؟ ایک معاصر ممتاز عالم، سید حسین نصر (1985) کے مطابق تعلیم کے اسلامی تصور کو اسلامی فلسفیوں کے نقطہ نظر سے واقفیت حاصل کیے بغیر پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا جو تعلیم کے تمام پہلوؤں جیسے کہ مقصد، مواد، نصاب، طریقہ کار وغیرہ پر محیط ہے۔ اسلامی فلسفہ درحقیقت تحقیقات پر مشتمل غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں علم کا بھرپور تحریری ذخیرہ موجود ہے۔ اپنے علم اور اقدار کے سبب ہی قدیم دور میں اسلامی فلسفیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسلامی فلسفے نے قدیم اسلامی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم کو بھی متاثر کیا لیکن جدید دور میں ہم نے اسلامی فلسفہ کو نظر انداز کر کے مغربی فلسفے کو ہی اہم، ضروری اور تمام مسائل کا درماں سمجھ رکھا ہے جس سے نظام تعلیم میں بالخصوص اقدار کے پیش نظر ایک سنگین مسئلہ پیدا ہوا ہے اور نتیجتاً ہم اسلامی نظام تعلیم کو زوال پذیر حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ لہٰذا اس مطالعہ میں عصری تعلیم کے حوالے سے ابن سینا کے تعلیمی فلسفہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تعلیم کا تصور: عام الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم ہدایت کا عمل ہے جو تربیت فراہم کرتا ہے، فرد کو زندگی گزارنے کے قابل بناتا ہے، سلیقہ سکھاتا ہے اور ترقی کو یقینی بناتا ہے۔ تعلیم کا تصور متحرک ہے اس لیے وقت اور حالات کی ضرورت کے مطابق اس کے معنی و مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ مختلف فلسفیوں اور تعلیمی مفکرین نے تعلیم کے معنی کو اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے لیکن اس سے قبل اس کے

اشتقاقی معنی کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے۔

تعلیم لاطینی الفاظ educere،educare یا educatum سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے شاگردوں کی رہنمائی کرنا یا موجود صلاحیتوں کو نکالنا ہے، جہاں "educere" کا مطلب ہے باہر لانا اور "educatum" کا مطلب مشق کرنا ہے۔ تعلیم کا عالمی طور پر قبول شدہ معنی ترقی ہے یعنی کسی کی صلاحیتوں کا مسلسل انکشاف ساتھ ہی یہ زندگی بھر جاری رہنے والا عمل ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مختلف ماہرین نے تعلیم کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔

سقراط کے مطابق، ''تعلیم وہ ذریعہ ہے جو سچ کی تلاش میں مدد کرتا ہے۔''

ارسطو کے مطابق، ''تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو صحت مند جسم میں دماغ کی تخلیق کے لیے ضروری ہے۔''

جان ڈیوی کے مطابق، ''تعلیم اپنے وسیع تر معنوں میں سماجی تسلسل کا ذریعہ ہے۔''

ڈاکٹر ذاکر حسین کے مطابق، ''تعلیم ساری زندگی جاری رہنے والا کام ہے۔ یہ پیدائش کے وقت سے شروع ہوتا ہے اور موت کے آخری لمحے تک جاری رہتا ہے۔''

امام غزالی نے بیان کیا کہ، ''تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو انسان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ سچے اور جھوٹے، اچھے اور برے اور صحیح اخلاق اور برے کاموں میں تمیز کر سکے۔''

تعلیم کا اسلامی فلسفہ "نیک سوچ اور عمل" کا تصور پیش کرتا ہے تاکہ فرد کو اس کی تخلیق کے مقصد کے بارے میں آگاہ کیا جا سکے اور اسے اپنی ذات کی شناخت اور اللہ کی معرفت حاصل ہو۔

اس طرح تعلیم کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے جو تا عمر جاری رہتا ہے، اس کی بدولت انسان صحیح اور غلط میں تمیز کر سکتا ہے، یہ انسان کو زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتی ہے، اس کے ساتھ ہی یہ سچ کی تلاش میں مدد کرتی ہے۔ وسیع پیرائے میں دیکھا جائے تو در اصل تعلیم کے تصور کو کسی تعریف کے ذریعہ مکمل طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے تصور، معنی و مفہوم سے لے کر اس کا دائرہ کار اتنا وسیع ہے کہ اسے چند الفاظ میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ تاہم جو چند تعریفات اوپر پیش کی گئی ہیں ان سے کافی حد تک تعلیم کے معنی کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ابن سینا کا فلسفہ تعلیم: ابن سینا نے اپنی تخلیق تدبیر المنازل میں خاص طور پر تعلیم کے بارے میں بات کی ہے جب کہ اسی موضوع پر شفاء کی منطق، رسالت السیاسہ، اور القانون کے متعدد اقتباسات میں بھی ذکر کیا ہے (نصر، 1985)۔ قبل اس کے کہ ہم ابن سینا کے تعلیمی نقطہ نظر پر بحث کریں ایک اہم سوال "انسان فطرتاً اچھا ہے یا برا؟" کے بارے میں ابن سینا کے نظریے کا اندازہ لگانا زیادہ ضروری

ہے جس سے متعلق ابن سینا کا خیال ہے کہ انسان "فطری مزاج پر" پیدا ہوا ہے اور فطرت کے اعتبار سے نہ تو اچھا ہے اور نہ برا۔ اس معاملے میں وہ یہ کہتا ہے کہ "تمام اخلاقی خصوصیات: اچھی اور بری، حاصل کی جاتی ہیں'۔ دوسرے لفظوں میں انسان ماحول اور اس کے تعلیمی نظام کے اثرات کے مطابق بدلتا اور ڈھالتا ہے۔ لہٰذا "اگر وہ برائی کا عادی ہے تو وہ بُرا ہو جائے گا اور اگر اچھائی کا عادی ہو جائے تو وہ اچھا ہو جاتا ہے (النقیب، 1993)۔ اس لیے انسان کے مخصوص اخلاقی کردار کی تشکیل کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے۔

علم کی درجہ بندی: ابن سینا کے مطابق علم کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم کو نظریاتی علم کہا جاتا ہے جب کہ دوسری قسم کو عملی علم کہا جاتا ہے۔ سابقہ زمرے کا مقصد روح کو "چیزوں کے مثبت عقیدے کی موجودگی" کے طور پر جان کر کاملیت عطا کرنا ہے جب کہ دوسرے زمرے کا مقصد نہ صرف روح کو علم کے ساتھ مکمل کرنا ہے بلکہ "اس علم کے تقاضوں کے مطابق عمل کرنا" بھی ہے۔ (حسن لنگولنگ، 1989)۔ بالفاظ دیگر نظریاتی فلسفہ کا مقصد سچائی ہے جبکہ عملی فلسفہ کا مقصد نیکی یا اچھائی ہے۔

نظریاتی فلسفہ تین قسم کے علوم پر مشتمل ہے جو ارسطو کے نظریات سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ ہیں فطری سائنس (علم طبیعی)، ریاضیاتی سائنس (علم ریاضی) اور الٰہیاتی یا مابعد الطبیعاتی علوم (علم الٰہی)۔ اس زمرے میں اس نے مطلق سائنس (علم کلی) کا اضافہ کیا ہے۔ دوسری طرف عملی علم کی تین شاخوں کا احاطہ کرتا ہے جیسا کہ ارسطو نے تجویز کیا تھا۔ جو اخلاقیات (اخلاق)، گھریلو انتظام ('علم تدبیر المنز ل) اور عوامی انتظام ('علم تدبیر المدینہ) ہیں۔ اس نے اس زمرے میں پیشین گوئی سائنس' کا اضافہ کیا (حسن لنگولنگ، 1989)۔ اس معاملے میں ابن سینا نے یونانی فلسفے کے تمام نظریات کی نقل نہیں کی بلکہ ایک حقیقی اسلامی فلسفی کے طور پر اس نے اس فلسفے کو کامیابی کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور عالمی نقطہ نظر سے ہم آہنگ کیا۔

تعلیم کے مقاصد: روزنانی (1996) کے مطابق تعلیم کے مقاصد کے بارے میں ابن سینا کا نظریہ دوسرے مسلم فلسفیوں بالخصوص الفارابی سے ملتا جلتا ہے۔ ان کی نظر میں تعلیم کے دو اہم مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد ''عقل کی آبیاری'' ہے اور دوسرا اہم مقصد ''بچوں کو اپنی زندگی کے لیے تیار کرنا'' ہے۔ دوسری مخلوقات سے انسان کس طرح منفرد اور مخصوص عقل وشعور کا حامل ہے اس کے بارے میں ابن سینا کا نظریہ پہلے مقصد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے جب کہ دوسرا مقصد پیشہ ورانہ اور عملی اس معنی

میں ہے کہ طلباء کو مناسب ملازمتوں اور معاش زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔ النقیب (1993) نے کہا ہے کہ ابن سینا تعلیم کے مقصد کو "فرد کی مجموعی ترقی کے طور پر دیکھتا ہے جس میں جسمانی، ذہنی اور اخلاقی ترقی شامل ہے۔ اس کے بعد اس فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق منتخب پیشے کے ذریعے معاشرے میں رہنے کے لیے تیار کرنا ہے۔" لہٰذا دوسرے فلسفیوں کے افکار کے برعکس ابن سینا تعلیم کے مقاصد کو صرف فلسفیوں یا اشراف کی تربیت تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ اسے معاشرے میں سماجی اور معاشی شراکت کے طور پر ایک مخصوص پیشہ اور پیشے کے لیے فرد کی تیاری کے طور پر دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کی تعلیم جسم، دماغ اور کردار میں صلاحیت کے ساتھ ایک مضبوط اور مربوط شخصیت کی تشکیل میں معاون ہے۔

دوسری طرف ابن سینا نے اپنے دلائل کے ساتھ ارسطو کے تصورات کو اسلامی فریم ورک کے اندر وضع کیا جیسا کہ موفراد (1965) کا دعویٰ ہے کہ "ابن سینا نے یونانی فلسفیوں سے اتفاق کیا کہ عقل کی ترقی ہی انسان کا اصل مقصد ہے۔ ارسطو کا یہ بھی ماننا تھا کہ عملی حکمت یا عام فہم عمل کے لیے ہماری بہترین رہنمائی ہے۔ عادت سے نیکی اختیار کی جانی چاہیے اور نظریاتی تعلیم کو پختہ اخلاقی عزم کے ساتھ انجام دیا جانا چاہیے۔ علم حاصل کرنا دراصل چیزوں کے حقیقی، آفاقی اور ضروری جوہر کو سمجھنا ہے۔"

تعلیمی طریقہ کار: ابن سینا نے اپنے تعلیمی افکار کو اپنی مختلف تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ ان میں اس کے تعلیم کے طریقہ کار سے متعلق تجویز کردہ نکات بھی شامل ہیں جنھیں نوروزی آرائے وغیرہ (2013) نے ابن سینا کے حوالے سے 12 تعلیمی طریقوں کے طور پر پیش کیا ہے جو یہ ہیں:

- پہلا، اجتماعی طریقے سے پڑھانا جس میں طلباء کچھ مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے چھوٹے گروہ کے طور پر شرکت کرتے ہیں۔ ابن سینا کے مطابق یہ طریقہ سیکھنے والوں میں کچھ اخلاقی، سماجی، ذہنی، علمی و خود اطمینانی تبدیلیوں کا سبب بنتا ہے۔
- دوسرا طریقہ مشاہدہ، تجربہ اور امتحان کا ہے جس کے ذریعے براہ راست تجرباتی اور عملی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ طلباء کو اپنے تعلیمی مقاصد کے حصول میں مدد مل سکے۔ مزید وہ عمل کو سمجھنے کے ساتھ تجربہ کرنے کے طریقوں کے بارے میں بھی سیکھتے ہیں۔
- تیسرا طریقہ سیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور سزا دینے کا ہے۔ یہ طریقہ سب سے زیادہ کارآمد طریقہ ہے جسے اس کے اصول وضوابط پر توجہ دے کر لاگو کیا جاسکتا ہے۔

• چوتھا طریقہ ایک مناسب ماڈل فراہم کرنے کے لیے ہے۔اس طریقہ سے سیکھنے والے کے لیے ایک ٹھوس، قابل تعمیل نمونہ فراہم کیا جاتا ہے اور سیکھنے والا ہر ممکن طریقے سے ماڈل جیسا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔

• پانچواں طریقہ تکرار اور مشق کا ہے جس میں سیکھنے والے اپنے اندر قابل تعریف خوبی پیدا کر سکتے ہیں یا پھر کسی ناخوشگوار صفت کو دور کر سکتے ہیں۔

• چھٹا طریقہ کلاس روم میں بحث ومباحثہ کا ماحول پیدا کرنا ہے۔اس سے طلباء واحد اور جامد سامع کے مزاج سے باہر نکلیں گے اور زیادہ فعال سیکھنے والے بنیں گے۔

• ساتواں طریقہ تدریس کے عمل میں سوال وجواب کے طریقہ کار سے اکتسابی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ یہ طریقہ تمام تعلیمی سرگرمیوں اور تدریسی طریقوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔اس طریقہ کو استعمال کرنے سے طلباء کی تعلیمی سرگرمیوں میں شرکت بڑھ جاتی ہے۔

• آٹھواں طریقہ تعلیمی مواد کو حفظ کرنا ہے جسے تدریس کے قدیم ترین طریقوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔اس طریقہ میں اساتذہ تصورات کو زبانی اور تحریری طور پر طلبا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور طلبا کی مشق وتکرار کے ذریعہ تدریسی عمل انجام پاتا ہے۔

• نواں طریقہ سیکھنے والوں کو نصیحت اور رہنمائی کا طریقہ ہے۔ابن سینا نے کچھ شرائط تجویز کی ہیں تاکہ سیکھنے والوں کے ذریعہ سیکھنے کے عمل کو بہترین طریقے سے انجام دیا جا سکے۔جیسے نرم آواز سے مشورہ دینا،مشورہ دیتے وقت اور مشورہ دینے کے دوران نرمی اختیار کرنا اور اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے۔

• دسواں طریقہ کھیل کھیل میں سیکھنا ہے اور ابن سینا کو کھیل کے ذریعے سکھانے میں بہت دلچسپی تھی۔اس نے اس طریقہ کار کو بہت چھوٹے بچوں کے لیے تجویز کیا ہے۔

• گیارہواں طریقہ خود سے نظم وضبط اور بہتری لانے کا طریقہ ہے جس کی سفارش ابن سینا نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں کی تھی۔اس طریقہ کار میں کچھ صوفیانہ رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ یوں تو ذہانت کی اہمیت پر ابن سینا نے کافی زور دیا ہے تاہم اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اس نے نظریاتی ذہانت کو حقائق کی تفہیم میں کمزور پایا اور یہ تجویز پیش کی کہ بصیرت تک رسائی خود سے نظم و ضبط اور بہتری لا کر حاصل کی جاسکتی ہے۔

• آخر میں، سیکھنے والوں یعنی طلباء کے لیے محبت اور مہربانی کا اظہار تعلیم کے بارہویں طریقہ کے

طور پر پیش کیا گیا ہے جو استاد اور شاگرد کے درمیان گہرا رشتہ قائم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس سے شاگرد اپنے استاد کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں اور اپنے ہوم ورک کے لیے ایک قسم کی ذمہ داری خود سے محسوس کرتے ہیں۔ آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ چند کو چھوڑ کر یہاں تجویز کردہ زیادہ تر طریقے ابن سینا کے کاموں سے راست طور پر لیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جانچ، مشاہدہ اور تجربہ ان کے کاموں میں براہ راست متعارف نہیں ہوئے بلکہ اس کا اندازہ ان کی تحریروں اور ذاتی زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس طرح کے مطالعے کے نتائج پر توجہ دی جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے کیونکہ یہ ان دانشوروں کے غور وفکر اور تجربات کا نتیجہ ہیں جو انسانی فطرت کا جامع علم رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سائنسی تحقیق میں صرف کیا۔

ابن سینا کے تعلیمی فلسفے کی اہمیت: فلسفے کی دنیا میں ابن سینا کو ایک جامع اور متوازن فلسفی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ابن سینا دنیا بھر میں فلسفیانہ فکر کی ایک معروف شخصیت ہے جس نے مختلف شعبوں میں اسلامی اور مغربی فکر سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔ اسلامی اور مغربی دنیا میں ان کی فکر کا اثر واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ارسطو کی طرح ابن سینا کا دعویٰ ہے کہ "علم اس وقت بہترین ہوتا ہے جب اس کے مواد آفاقی اور ضروری ہوں .... عام علمی دعووں کی آفاقیت اور ضرورت کو برقرار رکھا جانا چاہیے اگر ہمارے پاس ایسا علم ہو جو محض حقائق کا مجموعہ ہونے کے بجائے وضاحت اور پیشین گوئی کی اجازت دے" (شمس الدین عارف، 2000)

یہ الگ بات ہے کہ ابن سینا نے ارسطو کے نظریات کو اپنی فلسفیانہ فکر میں شامل کیا بلکہ یوں کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ "ارسطو پرستی میں اتنا گہرا ہے کہ صدیوں تک پوری دنیا کے لیے ارسطو بن گیا۔" (زبیری، 1992)۔ الغزالی اسے اور فارابی کو ارسطو کے دو صحیح ترجمان تسلیم کرتے ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ اس کے بنیادی تصورات ارسطو کے ڈی انیما' پر مبنی تھے لیکن دوران اطلاق اس میں ترمیم کی گئی۔ مثال کے طور پر اس نے ارسطو کی روح کی تعریف کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی اسے غیر حقیقی مادہ کے طور پر پیش کیا۔ اگرچہ اس نے ارسطو کے کچھ نظریات کو اپنایا ہے لیکن اسے ایک اصل اسلامی فلسفی تصور کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس نے ان نظریات کو توحید کے دائرے میں تبدیل کرنے کے ساتھ ہی اپنے مخصوص تعلیمی نظریات کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے مثال کے طور پر علم کی درجہ بندی جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ اس عظیم فلسفی کی اصلیت میں کوئی شک نہیں کیونکہ سید حسین النصر (1983) جیسے ہم عصر علماء بھی یہ مانتے ہیں کہ اسلامی فلسفہ جو کہ صدیوں کی فکر کا نتیجہ ہے "بطور کردار اسلامی ہے

اور اسلامی فکری روایات کا ایک لازمی جزو ہے۔"

ابن سینا کو 'تعلیم کا فلسفی' یا فلسفیانہ ماہر تعلیم' دونوں قرار دیا جا سکتا ہے۔ النقیب کا موقف ہے کہ ابن سینا فلسفہ اور تعلیم کے درمیان ملاپ کی ایک زندہ مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں کو ہی یکساں مسائل کا حل مطلوب ہے جیسے کہ سچائی، اچھائی، علم کے معنی، انسانی فطرت اور کچھ دیگر متعلقہ تصورات۔ ہم اسے دو وجوہات کی بنا پر ایک عملی مفکر بھی سمجھ سکتے ہیں: اول، اس کے فلسفیانہ خیالات کو ایک تعلیمی نقطہ نظر میں تشکیل دیا گیا جس میں اس کی خود اپنی فکری کوشش، با مشقت عمل اور تجربہ شامل ہیں۔ دوم، ان کا تعلیمی نظریہ جو مستقبل مرکوز طلباء کی تیاری کے لیے مہارت اور پیشے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ابن سینا اوپن تعلیم کی تجویز پیش کرتے ہیں جو تا حیات جاری رہتی ہے اور زندگی بھر سیکھنے کی نشاندہی کرتی ہے۔ الفارابی کی طرح خود ابن سینا نے بھی صرف اسکولی نظام تک محدود نہ رہ کر زندگی بھر سیکھنے کی کوشش کی۔

تعلیم کے بارے میں ابن سینا کا رویہ لبرل ہے، س نے یونانی نظریات کو ٹھوس مطالعہ کا حصہ بنایا اور سائنسی طور پر فکر و تحقیق کے دائرے میں لانے کی کوشش بھی کی۔ اس کا نظریہ اور عمل کا انضمام جو کہ اس کے تعلیمی خیالات میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے، سب سے اہم امریکی فلسفی جان ڈیوی سے ملتا جلتا ہے۔ ویسٹ بروک (1993) کے مطابق: ڈیوی کی "تھیوری اور پریکٹس کے انضمام سے وابستگی ایک تعلیمی مصلح کے طور پر ان کے کیریئر میں سب سے زیادہ واضح تھی۔" اس طرح ابن سینا اپنے نظریہ تعلیم میں بہت ترقی یافتہ ہے اور تعلیمی نظام کے لیے اس کے تعاون کو جدید قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ان کو گزرے ہوئے ایک ہزار سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن مختلف شعبوں میں ان کے خیالات آج بھی موزوں ہیں اور موجودہ دور کی تعلیم پر لاگو ہوتے ہیں۔

جیسا کہ سید حسین النصر (1983) کا استدلال ہے کہ موجودہ دور کے مسلمانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تعلیم کے مواد، ہدف، طریقوں اور مفہوم کے بارے میں ماضی کے فلسفیوں کے خیالات پر غور کیے بغیر ایک مستند اسلامی نظام تعلیم کو از سر نو تشکیل دے سکیں۔ اپنے الفاظ میں وہ زور دے کر کہتا ہے، "تعلیم کے بارے میں اسلامی فلسفیوں کا نظریہ نہ صرف اپنی فطری قدر کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہ فلسفیوں سے جڑے ہوئے اس نظریہ سے وابستہ ہے جو اکتساب و سائنس کے میدان میں عرصوں بعد عظیم شخصیات کو جنم دیتا ہے۔" النصر کے مطابق اس دور میں ایک ایسا تعلیمی نظام تھا جو بیک وقت اسلامی فلسفیوں اور سائنسدانوں کو تربیت فراہم کرتا تھا۔ یہ

واحد تعلیمی نظام تھا جس نے مسلم فلسفی سائنس داں پیدا کیے جس کی نظیر صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ سابقہ عظیم اسلامی شخصیات واحد تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں اور انھوں نے زندگی بھر خود سے سیکھنے کی مشق بھی کی ہے، جس کے لیے اپنے اندر سے جوش اور استقلال درکار ہوتا ہے۔

اختتامیہ: ابن سینا کے تعلیمی افکار کے ساتھ اسلامی تعلیمی نظام پر غور کریں تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ تعلیم کے سلسلے میں سابقہ اسلامی فلسفیوں کے خیالات، خاص طور پر ایک واحد اسلامی تعلیمی نظام کے لیے نہایت اہم ہیں جو طلبا میں ایک مضبوط اخلاقی اور فکری کردار کے ساتھ ایک مربوط اور جامع شخصیت کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ماضی میں اسلامی تعلیمی نظام کی بدولت ہی تمام شعبوں اور علوم میں عظیم اسلامی دانشور پیدا ہوئے اس لیے ماضی کے تعلیمی نظریات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے مزید اطلاقی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں ڈھالنا چاہیے۔اس طرح ممکن ہے کہ اسلامی تعلیمی نظام سے مستقبل میں ابن سینا جیسی کئی شخصیات ابھر کر سامنے آئیں۔تاہم سابق اسلامی فلسفیوں جیسے ابن سینا، الغزالی اور الفارابی وغیرہ کے تعلیمی نظریات پر تحقیق ونتائج سے استفادہ کرتے ہوئے اس دور کے نظام کو آج کے معاشرے کی جدید ضروریات کے مطابق ڈھالنا اور اختیار کرنا ایک اہم وکارآمد قدم ثابت ہوسکتا ہے۔

حوالہ جات:

Al-Naqib, abd al-Rahman. (1993). "Avicenna". The Quarterly Review of Comparative Education. XXIII: 53-69.

Arif, Syamsuddin. (2000). "Intuition and Its role in Ibn Sina's Epistemology." Al- Shajarah: 95-126.

Hashim, Rosnani. (1996). Educational Dualism in Malaysia. Kuala Lumpur: Oxford University Press.

Jules Janssens (2016). Ibn Sina. A Philosophical Mysticism or a Philosophy of Mysticism? Mediterranea International Journal on the Transfer of Knowledge. Reterieve from Researchgate.

https://www.researchgate.net/publication/301902979.

Langgulung, Hassan. (1989). Ibnu Sina as an Educationist. Muslim Education Quarterly. 57-73.

Nasr, Seyyed Hossein. (1985). The Islamic Philosophers' Views on Education. Muslim Education Quarterly 2:5-14.

Nowrozi, R. A., Nasrabadi, H. B., Heshi, K. N., & Mansoori, H. (2013). An Introduction to Avicenna's thoughts on Educational Methods. Journal of Education and Practice, 4(9), 169-176.

Salleh, S., & Embong, R. (2017). Educational views of Ibnu Sina. Al-Irsyad: Journal of Islamic and Contemporary Issues, 2(1), 13-24.

The Holy Prophet of Islam, Quoted from Pathway to Paradise, 1st Ed, 1999, P.29

Westbrook, Robert B. (1993). John Dewey. The Quarterly Review of Comparative Education. XXIII: 277-91.

Zuberi, Massarat Hussein. (1992). Aristotle 384-322 B.C. and Al-Ghazali 1058-1111 A.D. Delhi: Noor Publishing House.

☆☆☆

Umrao Jan "Ada"-Lucknavi Ma-ashreka ek Muraqqa by Dr.Altaf Hussain Dar(Asst.Prof Urdu,Govt. Degree College Kulgam)cell-9797196540

ڈاکٹر الطاف حسین ڈار (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج کولگام)

امراؤ جان ادا۔ لکھنوی معاشرے کا ایک مرقع

اُردو ناول کی تاریخ میں عبدالحلیم شررؔ سے تاریخی ناولوں کی شروعات ہوتی ہے ایسے تاریخی ناول جن میں اسلامی تاریخی کو موضوع بنایا گیا لیکن اگر اُردو ناول کے فروغ کی بات کی جائے تو عبدالحلیم شررؔ ہی کیا اُردو ناول کی تاریخ میں مرزا ہادی رسوا نے ناول کو اسکے صحیح قالب میں ڈھالنے کا تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ رسواؔ سے قبل اُردو ناول تشکیلی دور سے گزر رہا تھا۔ رسواؔ نے یوں تو بے شمار ناول تحریر کیے لیکن ''امراؤ جان اداؔ'' ان کا معرکتہ الآرا ناول قرار پایا۔ ناول کے اجزائے ترکیبی اور ان کا اُردو کے ابتدائی ناولوں پر اطلاق کرنے پر ہمیں جو مایوسی ہاتھ آتی تھی، رسواؔ نے اسے ختم کیا۔ رسواؔ نے '' امراؤ جان ادا'' لکھ کر اُردو ناول کو مضبوط و مستحکم بنیاد فراہم کی ۔ یہی سبب ہے کہ ''مراۃ العروس'' کے تقریباً ۳۰ سال بعد شائع ہونے والا ناول '' امراؤ جان ادا'' اُردو کا پہلا باضابطہ اور مکمل ناول کہلایا ایسا نہیں ہے کہ ان ۳۰ برسوں میں جو ناول شائع ہوئے وہ ناول نہیں تھے ۔ ہاں وہ تجرباتی اور تشکیلی دور سے گزر رہے تھے ۔ لہٰذا ان میں کوئی ایک کمی یا کسی ایک یا دو اجزائے ترکیبی کا فقدان، انھیں فن ناول نگاری پر کچھ کم نمبر دیتا تھا۔ جہاں تک موضوعات، دلچسپی، تحیر، تجسس وغیرہ جیسے عناصر یا پھر منظر نگاری کا سوال ہے تو یہ ناول ان معاملات میں خاصے آگے تھے ۔ ڈپٹی نذیر احمد سے جو اصلاحی ناول کا دور شروع ہوا تو وہ کسی نہ کسی طور مستحکم روایت کی شکل میں قائم رہا بلکہ اسی نے کبھی سرشارؔ کے معاشرتی اور کبھی شررؔ کے تاریخی اور کبھی حالیؔ کے اصلاحی ناول کی شکل اختیار کی حالی، شاد عظیم آبادی، نواب فضل الدین وغیرہ کے ناول ''مجالس النسا''، ''صورت الخیال''، '' فسانۂ خورشیدی'' میں موضوعات کی سطح پر گفتگو کی جائے تو یہ سارے ناول مسلم سماج اور ثقافت کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے نہ صرف کردار مسلم ہیں بلکہ ان کی فضا بھی اسلامی ہے۔ یہی نہیں ان میں سے کئی تو اسلامی معاشرہ اور ثقافت میں در آنے والی برائیوں اور کردار کی پامالی کو دور کرنے کے لیے ہی لکھے گئے تھے۔

مرزا ہادی رسواؔ نے حقیقتاً اُردو ناول نگاری کو نئی وسعت اور نئی زمین عطا کی۔ انھوں نے ''افشائے

راز''،''اختری بیگم''،''ذات شریف''،''شریف زادہ''اور امراؤ جان اَدا''ناول تحریر کیے۔رسوا کے یہ سارے ناول لکھنؤ کے مسلم معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح انگریزوں کے ظلم وستم شروع ہوئے،نوابین اور امراء انگریزی حکومت میں بے دست و پا ہوتے چلے گئے۔اس سلسلے میں شہروں میں جس طرح تہذیبی شکست وریخت کا عمل تیز ہوا۔لکھنؤ میں خاص کر تہذیب واخلاق کی جس طرح پامالی ہوئی،وہ لکھنؤ جو تہذیب واقدار کا نمونہ اور گہوارہ ہوتا تھا۔ جہاں شہزادوں اور نواب زادوں کو تہذیب اور طور طریقے کے لیے طوائفوں کے یہاں بھیجا جاتا تھا۔ اسطرح رُسوا نے لکھنؤ کی معاشرت اور ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ امراو جان معاشرہ میں خصوصاً مسلم معاشرہ کی تصویر کے حقیقی رنگ اور خدوخال ابھرے ہیں۔امراو جان میں مسلم گھرانوں کی تہذیب وثقافت ہے۔نماز،روزے ہیں،مولویوں کا آنا جانا ہے۔مدارس کے مناظر ہیں۔لکھنؤ کے مسلم معاشرے کی تہذیب کی بات ہو اور امام باڑوں اور مجالس عزا کا ذکر نہ ہو،ممکن نہیں ہے۔رسوا کے یہاں یہ سب معاملات بھی نظر آتے ہیں:

''مرزا صاحب روز صبح کو چار بجے گرمی برسات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔اسوقت سے باغ میں نکل جاتے ہیں،وہیں نماز پڑھتے ہیں''۔''اگر چہ ہر بچے کی تعلیم کا جداگانہ اہتمام ہے۔لڑکیوں پر تو نوکر ہے۔لڑکے جو مدرسے میں جانے کے قابل نہیں وہ گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتے ہیں۔مگر مرزا ہر روز بلا ناغہ ہر ایک لڑکی یا لڑکے کا سبق سن کے خود چھٹی دیتے ہیں''۔(۱)

مرزا ہادی رسوا کے زیادہ تر ناولوں میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب،اعلیٰ طبقے کی عیاشیوں اور مذہبی آزادی یا مذہب کا گرتا ہوا گراف خصوصاً مسلم معاشرے کی ایسی تصویر کشی ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل کا پورا عہد نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔مرزا کے زیادہ تر کردار امراؤ جان،گوہر مرزا ،خانم،اختری بیگم،''شریف زادہ'' کا مرزا عابد حسین اسلامی معاشرت اور لکھنوی تہذیب وثقافت کی زندہ جاوید تصویریں ہیں جنھیں مرزا نے ضرور اپنے تصور سے تراشا ہے لیکن ان میں زندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔مرزا کی کردار نگاری انھیں اپنے ہم عصر ناول نگاروں میں ممتاز کرتی ہے۔مرزا رسوا کی ناول نگاری کو اختصار کے ساتھ علی عباس حسینی نے بڑی عمدگی سے قلم بند کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مرزا رسوا کے مختلف ناول ہماری معاشرت کے مختلف طبقوں اور پہلوؤں کا نقشہ ہیں۔''افشائے راز'' ،روحانی طرز کا ناول تھا جو نا تمام رہا۔اس میں ذکی کی سیرت بیان کرنے کا جو انداز مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ بالکل ہی نرالا ہے۔''امراؤ جان ادا''میں طوائف کی زندگی اور اس طبقے کے پرستاروں

کے حالات ہیں۔اسے بغور پڑھنے سے اس اضطرار اور بے اطمینانی کا بھی پتہ چلتا ہے جو غدر کے کچھ ہی پہلے اور بعد لکھنؤ کی خصوصیت ہوگئی تھی۔''ذات شریف'' میں بیان کیا ہے کہ ایک بھولے بھالے نواب کو سحر و جادو، طلسم و پری میں پھنسا کے کیوں کر لوٹا گیا ہے۔یہ گویا اعلیٰ طبقے کی مرقع کشی ہے۔ طبقہ اوسط کی حالت ''نصرتی بیگم'' میں موجود ہے۔''شریف زادہ'' ایک ایسے خوددار اور با اصول آدمی کی زندگی ہے جس نے افلاس و تنگ دستی کا استقلال سے مقابلہ کیا اور محض ذاتی کوشش سے کامیابی حاصل کر کے اس طرح کا آدمی بن گیا جس میں بہت کچھ حکیمانہ جھلک موجود ہے۔یہ ناول سوانحی ہے اور بڑی حد تک مرزا رسوآ کی آپ بیتی کہانی''۔(۲)

مرزا ہادی رُسوا کے سبھی ناولوں میں امراو جان کو اگر شاہکار مانا جاتا ہے تو اسکی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اس ناول میں مرزا رُسوا نے اُنیسویں صدی کے معاشرتی اور ثقافتی زوال کی عکاسی کی ہے۔ بلکہ پروفیسر خورشید الاسلام کے مطابق امراو جان کا موضوع نہ تو طوائف کی زندگی ہے اور نہ امراو جان کی آپ بیتی بلکہ اس ناول کا موضوع لکھنؤ کی ''ثقافت'' ہے لکھنؤ کی ثقافت ترجمانی اور عکاسی ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے بڑی کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔خورشید الاسلام نے لکھا ہے کہ اس ناول میں:''ہر ایک (کردار) ایک فرد بھی ہے اور ایک جماعت کا نمائندہ بھی ہے وہ ایک ذات بھی ہے اور جماعت کو کسی خاص پہلو سے آب و تاب کے ساتھ پیش بھی کرتا ہے وہ ایک شخص بھی ہے اور ایک وسیلہ بھی۔نواب سلطان آ ایک پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں ان میں مصلحت اندیشی ہے نواب چھبن آ ایک دوسرے پہلو کی۔ان میں جرات ہے۔راشد ایک اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو مصنوعی پندار میں مبتلا ہے فیض علی اپنے گروہ کا نمائندہ ہے جس کی قوتیں مناسب راہ نہیں پاتیں۔ مختار آ کے ذریعے ہم ادنیٰ متوسط درجے کا تماشہ کرتے ہیں جو تقدیر پرست ہے ''بی آبادی'' کے ذریعہ ہماری رسائی مرغیاں ہنکانے والیوں تک ہوئی ہے جس کا اخلاق فوری ضرورتوں کا پابند ہے۔کانپور کے مولوی صاحب ہمیں ایک خاص طبقہ تک پہنچاتے ہیں''۔(۳)

مرزا ہادی رُسوآ کے ناول امراو جان میں ثقافت کی عکاسی، نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناول سے کہیں زیادہ گہرائی سے کی گئی ہے۔اس ناول میں اودھ یا لکھنؤ کے نوابان ثقافت کے زوال آمادہ رجحانات، معاشرہ میں پھیلتی ہوئی بدامنی اور نراجیت میں نوابین کی عیش پرستی، اور طوائفوں کی اٹ کھیلیوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے مسائل کی ترجمانی بھی کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ طور پر کی گئی ہے چونکہ اس ناول میں مرکزی کردار امراو جان ایک طوائف ہے جس کے

اِردگرد طوائف کلچر کے سارے لوازمات موجود ہیں۔ اس لیے ان لوازمات کے حوالے سے مرزا رُسوا نے اودھ کی، اس عہد کی ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ امراو جان میں میلوں ٹھیلوں، مشاعروں اور مجروں منچلے عاشوں اور پیشہ ور عیاشوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کو مختلف کرداروں اور ان سے وابستہ واقعات کے حوالے سے جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ ثقافتی عکاسی کی بہترین مثال ہے اور اس بنیاد پر ناول امراو جان کو ایک ثقافتی بیانیہ Cultural Narrative بھی کہا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ (اودھ) میں مشاعرہ آج بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مشاعرہ کی ثقافتی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مشاعروں کا اہتمام جس جوش وخروش کے ساتھ کیا جاتا تھا اس سے اس دور کے لوگوں کے ادبی ذوق اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امراو جان میں ایک مشاعرے کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''۔۔۔۔۔گرمیوں کے دن تھے مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاو ہوا تھا۔ تاکہ شام تک زمین سرد رہے۔ اس پر دری بچھا کر اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا تھا۔ کوری صراحیاں بھر کے کیوڑہ ڈال کر منڈیر پر چن دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آب خورے ڈھکے ہوئے تھے برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں ڈھکینوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمبا کو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ خمیر حقوں کے فیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دئے تھے۔ چاندنی رات تھی اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول دروازے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ اجلی چاندنی بانو کے آب خورے سفید کنول یہ سب چیزیں کیسی خوشگوار معلوم ہوتی ہیں''(۴)

امراو جان سے اس طرح کے اور بھی اقتباسات پیش جا سکتے ہیں جن سے اس ناول میں ثقافتی حقائق اور مسائل، عروج وزوال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض ''امراؤ جان ادا'' مرزا ہادی رسوا کا ایک شاہکار ناول ہے جس میں زوال آمادہ لکھنوی معاشرت یا تہذیب رقص کرتی ہوئی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے

حواشی: ۱۔ امراؤ جان ادا مرزا ہادی رسوا ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ ۲۰۰۲

۲۔ اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ ۱۹۹۴

۳۔ تنقیدیں، پروفیسر خورشید الاسلام، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، علیگڑھ ۱۹۵۷

۴۔ امراؤ جان ادا، مرزا ہادی رسوا، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ ۲۰۰۲

☆☆☆

Maulana Altaf Hussain Hali ki Urdu Nasr par Arabi zaban-o-Adab ka Asar by Dr. Asghar Ali Beag (Doda)cell-8825068599,9906727433

ڈاکٹراصغرعلی بیگ(ڈوڈہ)

مولانا الطاف حسین حالی کی اردو نثر پر عربی زبان وادب کا اثر

مولانا الطاف حسین حالی کا شمار ہندوستان کی ان بلند پایہ مایہ ناز علمی شخصیتوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی علمی و ادبی کاوشوں سے اردو زبان و ادب کی افزائش اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا، مولانا الطاف حسین حالی اردو ادب وسخن میں ایک ایسا نام ہے جس کے احسانات کی بدولت جدید اردو عالمی معیار کے سفر پر گامزن ہوئی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے ادب وسخن دونوں میں بھر پور خامہ فرسائی کی اور اہلِ دنیا سے داد وتحسین وصول کی۔ انہی کی کاوشوں کی بدولت برصغیر ہند و پاک میں علم و عمل کے چراغ روشن ہوئے اور بصیرتوں کی زندگی کا سراغ ملا۔ اردو علم و ادب کا ہر شعبہ ان کا ممنوع احسان ہے۔ شاعری ہو یا نثر، تنقید ہو یا تحقیق ہر پہلوں میں مولانا الطاف حسین حالی ہی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی دورِ جدید اور دورِ متوسطین کے درمیان ایک مضبوط کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب، شیفتہ اور مومن جیسے بلند پایہ شاعروں سے جتنی بھی قربت آپ کو حاصل تھی اس نے آپ کی فنکارانہ صلاحیتوں کو بہت زیادہ جلا بخشی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے میں دورِ قدیم کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی کے زمانے میں غیر ملکی اقتدار نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ معاشرہ انحطاط کا شکار تھا اور کسی بھی راہ کے تعین کرنے کا قطعی فیصلہ مشکل تھا۔ ایسے دور میں پروان چڑھنے والے مولانا الطاف حسین حالی دنیائے ادب میں اس طرح روشن ہوئے کہ ان اصلاحی کارنامے آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بنے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی علمی وادبی سرگرمیاں: مولانا الطاف حسین حالی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ تاریخ کا ایک پر آشوب دور تھا۔ اس دور کو غالب کے الفاظ میں زمین سے آسمان تک سو ختن کا باب کہا جاسکتا ہے۔ ایک طرف انگریزوں کا اقتدار بہ تدریج بڑھتا جارہا تھا تو دوسری طرف مغلیہ سلطنت کے اقبال کا آفتاب نہایت سرعت کے ساتھ غروب ہوتا جارہا تھا۔ مشرقی تہذیب کا ایوان متزلزل ہو رہا تھا۔ مغرب کا نیا نظامِ زندگی مستقبل کے لیے نئے امکانات لیے آگے بڑھ رہا تھا

۔قدیم وجدید میں کشمکش کا سلسلہ جاری تھا۔

1857ء میں ملک نے ایک قیامت خیز کروٹ لی جس نے سیاسی وسماجی نظام کے ساتھ شعر وادب کو بھی بے حد متاثر کیا۔ 1857ء کا سانحہ دراصل کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی ۔اس کی بہت بڑی قیمت مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی ۔اس واقعے سے جو غلط فہمیوں کا غبار تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹ گیا۔ پورے ملک پر افسردگی کی گھٹا چھا گئی ۔مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی اپنے شباب پر تھی۔ان حالات میں سرسید نے ملک کی فلاح وبہبود کے لیے ایک اصلاحی تحریک کی بنیاد رکھی جسے دنیا علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک کے نام سے جانتی ہے۔ یہ تحریک زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں پر محیط تھی۔سرسید کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے اور اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کرنے میں مولانا الطاف حسین حالی کا اہم حصہ ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی سرسید احمد خان کے ساتھیوں میں سے تھے اور وہ سرسید احمد خان کے جدید مشن سے بہت متاثر تھے ۔اور ان کی پہلی تصنیف "مولود شریف" جو کہ 98 صفحات پر مشتمل ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، اور یہ 1864ء عیسوی کے درمیان لکھا گیا تھا۔مولانا الطاف حسین حالی نے اس کا آغاز اللہ تعالی کی حمد وثنا کے ساتھ شروع کیا، پھر اس میں رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و معجزات اور اسوہ حسنہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خالق کائنات نے خاتم المرسلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو سب انبیاء کرام سے افضل و برتر قرار دیا ہے۔حضرت محمد ﷺ ساری انسانیت کے لئے بہترین نمونہ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔لہذا لوگوں کی کامیابی آپ ﷺ کی اتباع میں ہے۔مولانا الطاف حسین حالی کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ ان کے خیالات سرسید کی آواز یا بازگشت ہیں اور اس نسبت سے ان کا اسلوب بھی سرسید سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ بلاشبہ مولانا الطاف حسین حالی کے اسلوب میں سرسید کی بعض باتیں ملتی ہیں۔جیسے سادگی، منطق اور اظہار بیان میں بے تکلفی۔ لیکن ان کی نثر میں سرسید کے مقابلے میں جہاں تنوع کم ہے وہاں سادگی زیادہ ہے۔آل احمد سرور ان کے متعلق کہتے ہیں :"مولانا الطاف حسین حالی کے یہاں سرسید سے بھی زیادہ جچے تلے انداز میں فطرت پرستی نظر آتی ہے۔"4۔(فکر ونظر۔ص 137۔آل احمد سرور)

مولانا الطاف حسین حالی کی تمام نثری کاوشوں میں مقصدیت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ان کی مقالہ نگاری کی ابتدا ان کا پہلا مقالہ سرسید احمد خان اور ان کا کام سے ہوئی جس میں انہوں نے خاتمہ پر لکھا ہے کہ:"میں نے جو کچھ لکھا اس سے مجھے سرسید احمد خان کو خوش کرنا منظور نہیں۔ نہ ان

کے مخالفین سے بحث مقصود ہے بلکہ اس کا منشاء وہ ضرورت اور مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے" ۔5ے

(مقالات مولانا الطاف حسین حالی ۔حصہ اول ۔ص 316)

اردو میں مقالہ نگاری کی ابتداء سر سید کے رسالے تہذیب الاخلاق سے ہوئی اور اسی کی بدولت مولانا الطاف حسین حالی کے جو ہر بھی دیکھنے کو ملے ۔مولانا الطاف حسین حالی کے مقالات کو بہ لحاظ موضوع کئی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔مگر اس کا پہلا اور بنیادی مقصد سر سید اور ان کے مقاصد کی تبلیغ اور جدید نظریہ کی ترجمانی ہے جس میں مسلمانوں کے سیاسی ،سماجی ،صنعتی اور تعلیمی شعور کو بیدار کرنا اور نئی تعلیم کو فروغ دینا شامل ہے ۔جب کہ ان مقالات کا دوسرا حصہ تبصروں ،خطابات ،کانفرنسوں اور جلسوں کے لیکچروں پر مشتمل ہے ۔مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت کی طرح ان کے موضوعات میں بھی بہت تنوع ہے ۔وہ اپنے اسلوب کو اپنی تصنیفی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں ۔وہ پہلے مصنف ہیں جو ادبی ،سائنسی ،تنقیدی موضوعات متانت اور روانی سے لکھتے چلے جاتے ہیں ۔لیکن قدیم مزاجوں کو مولانا الطاف حسین حالی کا یہ انداز روکھا اور پھیکا نظر آتا تھا اور وہ ان کی تحریروں کو غیر معیاری قرار دیتے تھے لیکن یہی انداز و اسلوب تو مولانا الطاف حسین حالی کا سرمایہ ہے ۔

مولانا الطاف حسین حالی کو اردو نثر پر بڑی دسترس ،فضلیت اور بلند مقام حاصل تھا ،اور وہ ایسی اردو نثر لکھا کرتے تھے کہ گو یا وہ عربی نثر ہو ،اور وہ اردو میں عربی الفاظ بیان کرنے میں سب سے مختلف نظر آتے ہیں ،وہ مشکل الفاظ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری انہیں آسانی کے ساتھ سمجھ سکے ،وہ عربی اور فارسی اسلوب و تراکیب کا ایسا استعمال کرتے ہیں کہ گو یا اردو نثر کو ایک خاص نوعیت اور آزاد قسم کی نثر بنا دیتے ہیں ۔ان کی تحریروں میں جذبہ ،جوش ،ولولہ ،حمیت ،غیرت اور خودداری کی جھلک صاف نظر آتی ہے جو کہ عربوں کی خصوصیات میں سے ہے ۔عربی الفاظ کی کثیر تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اردو میں عربی لکھتے ہیں یا عربی میں اردو لکھتے ہیں ۔میں یہاں ان کی نثر سے کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں مثلاً حیات جاوید میں لکھتے ہیں :"الٰھی کیا مجال اور کیا تاب و طاقت جو تیری نعمتوں کا شکر ادا کر سکیں تو قدیم ہم حادث تو خالق ہم مخلوق ،تیری نعمتیں بے انتہا ،اور بے انتہا نعمتوں کا شکر بھی بے انتہا ہماری ابتدا بھی فنا اور انتہا بھی فنا"6ے

(حالی کی نثر نگاری ،ص 7 ۔ڈاکٹر عبدالقیوم)

اور اردو نثر لکھنے کے دوران وہ کثرت سے اور بڑی مہارت سے عربی اشعار استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں میں یہاں ان کی نثر کے دوران استعمال کیے گئے کچھ اشعار مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں مثلاً حیات جاوید میں سرسید کے تعلق سے لکھتے ہیں: "سرسید کی آئندہ ترقیات کی گویا یہ پہلی سیڑھی تھی اور انکی یہ حالت بلکل ابوتمام کے اس شعر کی مصداق تھی: 7

(حیات جاوید۔ص 357۔مولانا الطاف حسین حالی)

ویصعد حتی یظن الجھول بأن لہٗ حاجۃ فی السماء

تشریح: وہ ایک ایسا شخص ہے جو ترقی اور کامیابی کے منازل کو اس طرح طے کرتے ہوئے گزر جاتا ہے کہ کم علم اور جاہل شخص کو اس کے متعلق یوں گمان ہونے لگتا ہے کہ اسے آسمانوں میں کسی چیز کی تلاش ہے اور ایسے حالات میں وہ آسمان پر چڑھ کر ہی دم لے گا۔ اور آگے مزید سرسید کے متعلق کہتے ہوئے لکھتے ہیں: "الغرض یہ شخص دوستی وصحبت کے بارے میں اس عربی شعر کا حقیقی مصداق تھا"۔8۔(حیات جاوید۔ ص 398۔مولانا الطاف حسین حالی)

واذا رأیت صدیقہ وشقیقہ لم تدر أیھما ذوی الارحام

تشریح: حسن اخلاق اور اعلی ظرفی میں یہ شخص ایسے کمال کو پہنچا ہوا ہے کہ جب کبھی آپ اس شخص کے دوست اور بھائی کو ایک ساتھ اس کے ساتھ دیکھو گے تو اس شخص کے حسن اخلاق اور اعلی ظرفی کے سبب آپ یہ فرق ہی نہیں کر پاو گے کہ آیا ان دونوں میں سے اس شخص کا قریبی رشتے دار کون سا ہے۔ آگے مزید سرسید کے درد دل اور مقاصد تبلیغ اور جدید نظریہ جس میں مسلمانوں کے سیاسی، سماجی صنعتی اور تعلیمی شعور کو بیدار کرنا اور نئی تعلیم کو فروغ دینا مقصود تھا کے تعلق سے لکھتے ہیں: "اور قوم کے بہت سے افراد میں وہ اپنا درد مرض متعدی کی طرح پھیلتا چلا گیا:"9۔(حیالات جاوید۔ ص 210۔مولانا الطاف حسین حالی)

فتی عیش فی معروفہ بعد موتہ کما کان بعد السیل مجراہ مرتعا

تشریح: یہ ایک ایسا نوجوان شخص ہے جس نے دنیا میں رہ کر اس قدر نیکیاں کی ہیں کہ موت کے بعد آج بھی وہ اپنی نیکیوں کی شکل میں اس طرح زندہ ہے جس طرح برسات کا سیلاب اپنی گزرگاہوں سے گزر جانے کے بعد ان جگھوں کو ہرا بھرا کر دیتا ہے، یعنی جہاں جہاں سے وہ سیلاب گزرتا چلا جاتا ہے تو اس کی بدولت ان جگھوں پر ہری بھری گھاس اگ کر لہلانے لگتی ہے۔

بعض جگہ مولانا الطاف حسین حالی عربی شعر اور عربی الفاظ کے مفردات ومرکبات کا ایسا

انتخاب کرتے ہیں جوان کی نثر میں فصاحت و بلاغت کے چار چاند لگا دیتے ہیں، وہ حیرت انگیز عربی تشبیہات اور استعارے بھی لے کر آتے ہیں جو ان کے الفاظ کو حسن اور خوبصورتی میں دوگنا کر دیتے ہیں۔مثال کے طور پر حیات جاوید میں فرماتے ہیں: "بات یہ ہے کہ مذہبی تقدس اور مشائخ و علماء کی زی میں اپنا اور زھاد و عباد کی سی زندگی بسر کرنا جب واعظین جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں یا مشائخ و اٰھل اللہ جو تزکیہ نفس و تصفیہ باطن کی تعلیم و تلقین کرتے ہیں" ۔10۔

(حیات جاوید۔ص385۔مولانا الطاف حسین حالی)

اور اکثر جگہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ اپنے مقالوں میں بری مہارت سے عربی ضرب المثل پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثالکے طور پر "صاحب البیت ادری بما فیہ "11۔(حیات جاوید۔ص 174) یعنی گھر والا اپنے گھر کے حالات کو دوسروں کی بنسبت زیادہ بہتر جانتا ہے "وانظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال "12 (حیات جاوید۔ص 186) یعنی جو کچھ کہا جائے غور اور تحمل سے سنو اور اگر وہ حقیقت پر مبنی ہو تو اس پر عمل کرو یہ مت سوچو کہ کہنے والا کون ہے اور کیسا ہے)" الاعتراف یہدم الاقتراف" (یعنی گناہ کا اعتراف کر لینا گناہوں کو کم کرتا ہے اور ختم کر دیتا ہے) اس کے علاوہ ان کی بہت سارے عربی ضرب المثل ہیں جن کا انہوں نے مختلف جگہوں پر ذکر کیا ہے مثال کے طور پر حیات جاوید میں لکھتے ہیں: "عربی میں یہ مثل مشہور ہے "الھموم بقدر الھم" (یعنی اللہ اپنے بندوں پر اسی بقدر غم اور مصیبتیں ڈالتا ہے جتنی ان کے اندر سہنے اور برداشت کرنے کی طاقت اور سکت ہو) سرسید نے کالج کے مشن میں اتنے کام اپنے سر لیے تھے کہ ایک آدمی کا ان سے عہدہ براہ ہونا سخت دشوار تھا12 (حیات جاوید ۔ص 195) اس مشہور قول کے موافق کہ "الحزم سوء الظن "13۔(حیات جاوید۔ص 196) یعنی بدگمانی عقلمندی کی بات ہے یعنی اگر انسان کسی شخص سے بدگمانی رکھے گا تو ظاہر میں وہ اس شخص کے شر و رفتن سے محفوظ رہے گا) اس لیے ضروری ہے کہ کبھی کبھی اپنے ماتحتوں کے کام کو جانچ لیا جائی۔

اور جب سرسید کے بہی خواہ اور شاگرد سرسید کے مشن و مقاصد اور ان کے آرٹیکلس کو انگریزی اور اردو میں ترجمہ کر کے جگہ جگہ پھیلانے میں مصروف تھے ان کے لیے حیات جاوید میں لکھتے ہیں: "انہوں نے متعدد بار سرسید کے آرٹیکلوں کا انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں جواب لکھ کر مشتہر کیا مگر اس عربی مثل کے موافق "وقد سبق السیف العدل "14۔(حیات جاوید۔ص 292) یعنی تلوار انصاف کرنے میں سبقت لے گئی) یعنی جب کسی کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر جلد

بازی میں کوئی فیصلہ کرلیا جاتا ہے تب یہ ضرب المثل استعمال کی جاتی ہے کہ تلوار انصاف کرنے میں سبقت لے گئی ۔مطلب یہ کہ سر سید کے بہی خواہوں اور شاگردوں نے سر سید کے مشن اور ان کے آرٹیکلس کو انگریزی اور اردو میں ترجمہ کر کے جگہ جگہ پھیلایا تو ضرور لیکن چونکہ سر سید وہ سب اردو اور دیگر زبانوں میں پہلے ہی کر چکے تھے۔

مولانا الطاف حسین حالی عربی الفاظ کی ساخت اور محاورے کا اایسا انتخاب کرتے ہیں جو ان کی اردو نثر میں فصاحت و بلاغت کے چار چاند لگا دیتے ہیں ،وہ حیرت انگیز عربی تشبیہات اور استعارے بھی لے کر آتے ہیں جو ان کے الفاظ حسن اور خوبصورتی میں دوگنا کر دیتے ہیں مندرجہ ذیل سطور میں ان کی چند مثالیں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تا کہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے اپنی نثر میں قرآنی آیات ،حدیث اور محاورے کس حد تک استعمال کیے تھے ۔مثلاً علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خان کے حالات زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کے تعلق سے آگے مزید لکھتے ہیں:" مناظرہ کرنا پسندیدہ طریقہ کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی جس کی قرآن نے ہدایت کی تھی وجادلھم بالتي ھي أحسن" ۔15۔(حیات جاوید۔ص 262)

اور جب سر سید احمد خان نے ۷۰۔۱۸۶۹ء کو انگلینڈ میں رائج طرز تعلیم اور اصول تدریس اور جدید سائنسی علوم کا جائزہ لینے کے لئے لندن روانہ ہوئے تا کہ وہ ہندوستانی مسلمان بچوں کو انگریزی زبان اور جدید تعلیم اور سائنسی علوم اور انگلینڈ میں رائج طرز تعلیم اصول تدریس سے اور طرز معاشرت اور ان کی درس گاہوں کے طریقہ تعلیم سے آگاہ اور متعارف کرا سکیں۔ "اور تاریخ معین پر "بسم اللہ مجریھا و مرساھا کہہ کر جہاز میں سوار لندن روانہ ہو گئے"16۔

(حیات جاوید۔ ص318)

مولانا الطاف حسین حالی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ تاریخ کا ایک پر آشوب اور ظالم حکمرانوں کا دور تھا ایسے حالات میں وہ بڑی مہارت سے لوگوں کی دلجوئی اور اصلاح کرنے کے لیے ان کے سیاسی ،سماجی، صنعتی اور تعلیمی شعور کو بیدار کرتے اور ان کے اندر ایک نئی امنگ جگاتے ۔" ہم کو اپنے نبی کا یہ ارشاد یاد رکھنا چاہیے کہ "اعمالکم عمالکم "17۔(حیات جاوید۔ص308)

اس حدیث کا ہم معنی کلام امام طبرانی کے ہاں حضرت عمر ،کعب أحبار اور حسن بصری رحمہم اللہ تعالیٰ کی سند سے ملتا ہے اور حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ تب کہا تھا جب آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ حجاج کو بددعا دے رہا ہے،تو آپ نے فرمایا: ایسا مت کرو یہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ

ہے،ہمیں ڈر ہے اگر حجاج معزول ہو گیا یا مر گیا تو تم پر بندر اور خنزیروں کو مسلط کر دیا جائے، کیوں کہ مروی ہے کہ" أعمالكم عمالكم ،وكما تكونون يولى عليكم "، مطلب جیسے لوگوں کے اعمال ویسے ان کے امراء" ۔اور جب سر سید اپنے مشن و مقاصد کو جگہ جگہ پھیلانے اور اپنی ذات سے متعلق لوگوں کے شبہات کو آرٹیکس اور تحریروں کے ذریعے دور کرنے میں مصروف تھے اس تعلق سے مولانا حالی حیات جاوید میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:" مگر جو طریقہ سر سید نے اپنے شبہات رفع کرنے کا اختیار کیا ہے وہ بالکل شارع کے اس اصول کے موافق ہے" کہ کلموا الناس علی قدر عقولھم "18۔

(حیات جاوید۔ص 370)یعنی

لوگ مختلف فرقوں مختلف گروہوں مختلف ثقافتوں مختلف ذہنیتوں اور بہت سی رسوم و روایات سے تعلق رکھتے ہیں،اس لیے اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ لوگوں سے ان کے ذہین کے مطابق خطاب کیا جائے۔درحقیقت مولانا الطاف حسین حالی کا شمار ہندوستان کے ان نامور علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی علمی وادبی کاوشوں سے قوم وملت کو روشناس کیا ان کے اندر حب الوطنی ،قومی غیرت اور مذہبی جوش کے جذبہ کو پیدا کیا۔" مولانا الطاف حسین حالی نے ہمیشہ مقصدیت کو اولین ترجیح دی اور اپنی تحریروں سے اصلاح معاشرہ کی کاوشیں کیں۔آپ نے ادب وسخن کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنا ڈالا کیوں کہ آپ کے نظریہ کے مطابق ایسا ادب بے ادبی ہے جو ترجمانِ حیات نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہ رقم طراز ہیں: میں نے جو کچھ لکھا اس کا منشاء وہ ضرورت و مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے"۔

(اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ ص 237۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

غرض مولانا الطاف حسین حالی جو تعلیمات اور جو نقوش ہمارے درمیان چھوڑ گئے ہیں ان پر ہندوستانی عوام آج بھی عمل پیرا ہو کر قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دے سکتے ہیں۔آج مولانا الطاف حسین حالی ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تصانیف و تالیفات ،تحریریں خواہ سیاسی میدان کی ہوں یا کی فلاح و بہبود کے لیے اصلاحی تحریکوں کی بنیادیں ہوں، ہندوستان کے مسلمانوں کو پوری شعوری کیفیت کے ساتھ جاگتے رہنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔مولانا الطاف حسین حالی ایک تاریخ ساز شخصیت ہی نہیں بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے مشعلِ راہ بھی ہیں۔انہوں نے جدوجہد آزادی اور ملک کی آزادی کے بعد شاندار کارناموں کی میراث چھوڑنے کے ساتھ ایک اہم نظریہ ساز کے طور پر اپنا لوہا منوایا ہے۔ایسی شخصیت کو صرف خراج تحسین پیش کرنا کافی نہیں ہے

بلکہ ہمیں ان سے تحریک حاصل کرنی چاہیے۔ان کی تصنیف کردہ کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔مولانا الطاف حسین حالی شرافت اور نیک نفسی کا مجسمہ تھے۔مزاج میں ضبط واعتدال، رواداری اور بلندنظری ان کی ایسی خوبیاں تھیں جن کی جھلک ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔اردوادب کی جووسیع وعریض ،خوبصورت اوردلفریب عمارت آج نظر آتی ہےاس کی بنیاد کے پتھر حالی نے ہی بچھائے تھے۔انہیں 1904ء میں ،شمس العلماء، کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔مولانا اپنی رحلت سے چندروز قبل شدید علیل ہوئے اور مختصرسی علالت کے بعد 31 دسمبر 1914ء کو پانی پت میں نصف شب ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔اس ہمہ گیر شخصیت کی خدمات کو ہندوستان کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

حوالہ جات

1۔ مولانا الطاف حسین حالی ،مقالات حالی ۔ جمال پرینٹنگ پریس جامع مسجد دہلی ۔1936م
2۔ ۔مولانا الطاف حسین حالی، مقالات حالی۔ جمال پرینٹنگ پریس جامع مسجد دہلی۔1936م
3۔ مولانا الطاف حسین حالی، مقالات حالی۔ جمال پرینٹنگ پریس جامع مسجد دہلی۔1936م
4۔ ۔احمد سرور، فکرونظر۔انجمن ترقی اردواورنگ آباد دکن ۔1971م
5۔ ۔مولانا الطاف حسین حالی، مقالات حالی۔ جمال پرینٹنگ پریس جامع مسجد دہلی۔1936م
6۔ ۔ڈاکٹرعبدالقیوم، حالی کی نثرنگاری۔انجمن ترقی اردو(ہند) نئی دہلی۔1992م
7۔ 7۔تا 18 مولانا الطاف حسین حالی ، حیات جاوید ۔معارف پرینٹنگ پریس اعظم گڑھ یوپی۔1956م
19۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ، مکتبہ جاوید میکلوڈ روڈ ،کراچی ، 1992م

☆☆☆

Muarrafi Kitab Tarikhi Raj Darshani by Dr. Akhtar Hussain Shah

(Asst.Prof.Dept.of Persian,BGSBU Rajouri)cell-

دکتور اختر حسین شاه (استاد گروه زبان و ادبیات فارسی، دانشگاه بابا غلام شاه بادشاه راجوری جاموکشمیر)

معرفی کتاب تاریخی راج درشنی

راج درشنی کتابی است در باره تاریخ جامو، کشمیر و پنجاب که دارای اطلاعات تاریخی ادوار مختلف این بخش از هندمی باشد و از نظر تاریخی، ادبی و فرهنگی اهمیت زیادی دارد. مصنف این کتاب لاله گنیش داس ملقب به دیهرا است. لاله گنیش داس در قرن سیزدهم میلادی در چکله گجرات به دنیا آمد این منطقه اکنون جزیی از پاکستان است خانواده گنیش از هنرمندان به شمار می آمد گنیش داس در ابتدا در دربار رنجیت سینگ ۔ که پادشاه لاهور بوده قانون گو بود علاوه بر این ایشان وظیفه دسترسی کامل در زمینه انشا نگاری و تاریخ نویسی داشت ۔ بعد از آن وقتیکه گلاب سینگ مهاراجه جامو شد ایشان گنیش داس را به دربار خود آورده و او را به سمت قانون گو منصوب کرد. راج درشنی در سال ٦۴۸۱ میلادی به حکم مهاراجه گلاب سینگ نگاشته شد قبل از نوشتن این کتاب گنیش داس با علما فضلا و شخصیتهای مهم جامو و همین طور با دانشوران آن زمان از جمله پندت رام کرشن برهمورت ۔ کوسالو پندت و پندت نرسنگ داس ملاقات کرد و با اینها حرف زد و در نگارش این کتاب از سخنان هر یک بهره گرفت. علاوه بر این با خانواده های صوفیان مانند پیرمتا، بابا جیتو، پیر کهو و چندین نفر دیگر نیز ملاقات کرده و اطلاعات تاریخی آنان را نیز در کتاب در آورد۔ گنیش داس منبع دیگری غیر از این حرفها که بالا بیان کردم نداشت و از هیچ کتاب تاریخی نام نبرده است ولی آثار تاریخی که در باره مهاراجه گلاب سینگ ذکر کرده است یا خود شاهد آن وقایع بوده و یا از مهاراجه گلاب سینگ شنیده است. راج درشنی در مورد احوال مهاراجه های شمال غربی و خصوصا تاریخ مهاراجه های جامو است گنیش داس در این کتاب در باره مهاراجه ها و در باره سلطنت انها نوشته ولی به مهاراجه های که قبل از شیو پرکاش تا اگنی گیر حکمران بودند که تقریبا شامل نوزده (۹۱) نسل هستند آنها را فقط به ذکر نام آنها اکتفا کرده است و در باره سلطنت آنها ذکر نکرده است اما از مهاراجه جوتی پرکاش تا مهاراجه تیج برج که شامل شانزده (٦١) نسل است را تک تک نام برده و به شرح ادوار حکومتشان پرداخته است. مصنف در این کتاب نه (۹) فهرست مرتب کرده و در آن در باره هشتاد و نه (۹۸)

مہاراجہ ہا وادوار دسلطنت ہریک از آنہار ابطور کامل ذکر نمودہ است. درفہرست ہفتم ازمہاراجہ سورج دیوتا گلاب سینگ ادوار دحکومت را با تاریخ دقیق بہ ہجری وبکرمی آوردہ است. مصنف علاوہ بر ذکر دوران حکومت مہاراجہ ہا، تاریخ حکمرانی چندین پادشاہ ہارا نیز دراین کتاب ذکر کردہ است از جملہ: محمود غزنوی و ملک خسرو کہ از یک خانوادہ بودند ومحمد غوری واز سلسلہ مغول ظہیر الدین بابر، ہمایون، کامران میرزا، واکبرشاہ واز سلسہ سوری، شیرشاہ سوری وسلیم شاہ سوری رانام بردہ است. گنیش داس در مورد مہاراجہ رنجیت سینگ کہ آخرین جانشین کپور دیو بود ومہاراجہ گلاب سینگ نیز فرماندہ ارتش او بود، نسبتا شرح بیشتری ذکرنمودہ. طبق مصنف رنجیت سینگ حاکم عدل پسند ومردم دوست بود. درنتیجہ مساعی مہاراجہ رنجیت سینگ رسوم بدوغیراخلاقی از جملہ: زنا، ستی وغیرہ رامسخ کرد. مہاراجہ رنجیت سینگ بحد زیادتحت تاثیراستعداد گلاب سینگ بود. بہ ہمین دلیل اولا گلاب سینگ راازسرباز معمولی ارتقادادہ و فرماندہ لشکرساخت وسپس فرماندہی منطقہ جامورا بہ وی اعطانمود. گنیش داس درمورد جنگ بین حکومت لاہور وانگلسی ہا وتشکیل ایالت جامووکشمیر نیز شرح دادہ است. طبق گنیش داس اولین بار درکنارہ رود ستلج دربین حکومت لاہور وانگلیسی ہا جنگ رخ داد و دراین جنگ حکومت لاہور از دست انگلیسی ہا شکست خورد ودر جنگ دوم نیز کہ درمنطقہ مدکی اتفاق افتاد پیروزی از آن انگلیسی ہا شد. پس از شکست رانی جندان، گلاب سینگ راوزیر دولت خود مامور کرد وتوافقنامہ مابین دولت انگلیسی وحکومت لاہور فرستاد ولی رانی جندان آن معاہدہ رانپذیرفت وگلاب سینگ راازعہدہ وزارت برطرف کرد. بعداز عزل گلاب سینگ رانی جندان لال سینگ رابعہدہ وزارت منتخب نمود. لال سینگ ازطرف حکومت لاہور برای معاہدہ باانگلیسی ہا مامور شد. ودربین لال سینگ وانگلیسی ہا معاہدہ بعمل آمد. حکومت لاہور نمی توانست طبق شرایط معاہدہ خسارت جنگ رابہ انگلیسی ہا پرداز د. سرانجام منطقہ جامووکشمیر را درعوض خسارت جنگ بہ انگلیسی ہا سپرد. بالاخرہ درسال ہزار وہشت صد وچہل وشش (۱۸۴۶) میلادی گلاب سینگ درضمن معاہدہ امرتسر منطقہ جامووکشمیر را درعوض ہفت ونیم میلیون روپیہ از انگلیسی ہا خریدہ وگلاب سینگ بحیث مہاراجہ برتخت حکومت نشست۔

کتاب راج درشنی: گنیش داس نویسندہ این کتاب باپیروی ازنویسندگان پیشین، کتاب رابا بسم اللہ وحمد باری تعالی اغاز می کند سپس بااحترام بہ ذکرمہاراجہ ہامی پردازد وآنہارابا القاب محترمانہ یاد می کند. متن کتاب بہ زبان فارسی قدیم نوشتہ شدہ است. کتاب درسہ نسخہ بہ خط شکستہ نستعلیق بہ نگارش در آمدہ است ونویسندہ از ابیات شعر فارسی ہم درجاہای بہرہ گرفتہ است. این کتاب اولین بار درسال

هزارونهصد و هفتاد وشش (۱۹۷۶) میلادی بتوسط مولوی عبدالعزیز به زبان اردو ترجمه شده ودر موزه شری پرتاب سینگ به شکل نسخه خطی به شماره ۴۲۲۳ نگهداری شده وتا حالا به چاپ نرسیده است وشامل ۲۷۰ صفحه بوده که مترجم درترجمه خود، مقدمه یا عبارت اضافی ننوشته است. این ترجمه براساس نسخه خطی موزه بریتانیا است ودر آخر تاریخ وامضای مترجم رادارد. علاوه ازاین کتاب راج درشنی درسال هزارو نهصد ونود و یک (۱۹۹۱) میلادی توسط سکهد یوسینگ چرک به زبان انگلیسی ترجمه شد. از طرف چاپخانه جی کی بک هاوس(J K Book House) منتشرشده است. مترجم دراین ترجمه از هردو نسخه خطی موزه بریتانیاوموزه شری پرتاب سنگ استفاده نموده است زیرا که نسخه موزه پرتاب سنگ ناقص بوده و.وی به ناچار درآخر ترجمه به نسخه موزه بریتانیا اکتفا کرده وکتاب رادر فصل ها تقسیم نموده است .

سکهد یوسینگ چرک درباره کتاب راج درشنی مقاله ای به زبان انگلیسی نوشته واین مقاله درکتاب تاریخ نگاری(Historiography on jammu)موجود است۔اهمیت وارزش تاریخی، فرهنگی، مذهبی وسیاسی راج درشنی: طوری که بیان شده که راج درشنی کتابی است در باب تاریخ جاموکشمیرو پنجاب که دارای اطلاعات تاریخی ادوارمختلف این بخش از هندمی باشد واز نظر تاریخی، ادبی وفرهنگی اهمیت زیادی دارد۔ راج درشنی باوجود نقایص سبک ارایه فنی کتاب مهمی است. دراین کتاب وقایع و رویدادهای تاریخی محلی به طور مفصل بیان شده است از جمله وقایع تاریخی ادوارقدیم درخصوص جاموکه در هیچ کتاب تاریخ دیگر در دسترس نیست. نویسنده دراین کتاب حکومتهای محلی جامورا بیان کرده و جریانات سیاسی پنجاب رانیز به رشته تحریر درآورده است. به حملات حکومت های خارجی برعلیه جاموو دفاع ومقاومت حکومتهای جامودرمقابل این حمله ها به طورکامل اشاره کرده است .ازنکات قابل توجه دراهمیت این کتاب این است که مهاراجه گلاب سینگ گنیش داس رادرنوشتن وقایع صادقانه وحقایق رویدادها آزادگذاشته بودوبه اوتاکید کرده بود که بدون هیچ محدودیتی درصداقت کامل اتفاقات ووقایع به صورت مستندنوشته شود۔ازاین رواسامی ووقایع شهرهای جامودراین کتاب براساس واقعیت است .

اطلاعات فرهنگی: گنیش داس دراین کتاب مذهب مردمان راذکرنکرده بلکه تنها به مذهب مهاراجه ها اشاره نموده است. ازمطالعه کتاب می توان گفت که همه مهاراجه ها هندو مذهب بوده اند. اودرباره رسومات مذهبی می نویسد که بعد از وفات مهاراجه جی سینگ پسر اومهاراجه رتن پرکاش برتخت نشست او با علما و مردمان نیکو به صحبت می نشست وباحسن خلق باانان رفتار می کرد. گنیش داس می نویسد که نسخه متبرکی که نوشته بالمیک ریشی بودرا همیشه پیش خودنگه می داشته وروزانه از پندت بدیه دهر آن نسخه را گوش می داد وبه

تعلیمات این نسخہ ودیگر کتابہای متبرکہ عمل می کرد، رسومات مذہبی ہم درہمین دورہ بود کہ رواج پیدا کرد. وی بالاخرہ پسر خودرا بر تخت نشاند وخود بہ سوی رودشری گنگ سفر کرد در آب گنگ ایستادہ عبادت می کرد و بہ ہمین حالت از جہان رفت. گنیش داس با استناد بہ منابع باقی ماندہ از تاریخ برہم پرکاش می نویسد کہ مردم از یونان بہ طرف جامو و پنجاب مہاجرت کردند وہمان جا ساکن شدند. ستارہ پرستی وآتش پرستی میان این گروہ رایج بود ولی رسومات مذہبی ایشان نزدیک بہ مذہب ہندوہا برہمان بودہ وبعضی از انان بہ مذہب ہندوہا معتقد بودند چنانچہ رسومات این افراد ہا تا حالا در پنجاب وجامو ادامہ دارد ودر یک روز خاصی مردہا وزنہای آنہا آتش روشن وجشن برپا می کنند امروزہ این جشن لوری نامیدہ می شود. گفتہ می شود کہ این رسم از آتش پرستان ایران بہ ہند آمدہ. آغاز این رسم از پادشاہ خراسان ہوشنگ شروع شدہ ولی در کتابہای ہندوہا وچینی ہا ہیچ اشارہ ای بہ آن وجود ندارد. نویسندہ در کتاب خود بہ تقدس گاو میان ہندوہا اشارہ می کند کہ آن را متبرک شمردہ ومی پرستیدند. مہاراجہ برندر با این کہ مرد نیک سیرت ومہربان بود ولی بہ شکار علاقہ داشت. او در یک شب تاریک بہ جای گوزن گاوی را شکار کرد وچون کشتن گاو نزد ہندوہا گناہ سنگینی شمردہ می شد ایشان از انجام این گناہ پشیمان شد ومی خواست کفارہ این گناہ پرداز داو با بزرگان مذہبی باویدانہا وبرہمنہا در مورد کفارہ مشورت کرد وآنہا از روی درہم شاستر بہ یک تصمیم رسیدند وگفتند کہ شما باید تنہا بہ رود گنگ سفر کنید وہیچ خوراکی با خودشون نداشتہ باشید وروز اول سفر گرسنہ بمانید روز دوم گدایی کنید ودر دوران سفر بہ خانہ ای کہ می روید بہ گناہ خود اعتراف کنید. ونیم کیلو آرد بگیرید وبا آن ورت را تمام کنید ووقتی بہ رود گنگ رسیدید بہ جای خود بہ برہمن ہا ومرتاز ہا عطیہ کنید وسپس غذا بخورید. او بہ این دستور عمل کرد وبہ این ترتیب بہ رود گنگ سفر کرد ولی باز ہم پشیمانی اش از گناہ کم نشد تا اینکہ آتش روشن کرد وخود را سوزاند. گنیش داس در این کتاب مذہب تبت نیز اشارہ می کند ومی نویسد کہ مردم تبت نیز پرستشگر بت ہا و لاما ہا ہستند ولی بت ہای آنہا از بت ہای ہندوہا متفاوت ہستند. در دوران حکومت مہاراجہ بودارجن، کنار رود توی قلعہ معبد ہا بود کہ بت ہای مختلفی در این معابد بود. مجسمہ خورشید نمایان ترین ومتبرک ترین مجسمہ بود طلایی وبرسر آن تاجی بود وبر اعضای آن ہم آب طلا بود. نگہبانان مجسمہ خورشید را لباس زربفت وانگشتری طلایی می پوشیدند. مجسمہ ماہتاب نقرہ ای بود ومحافظان آن را لباس سفید وسبز وانگشتری نقرہ می پوشیدند. مجسمہ مریخ با سنگ سرخ بودہ ودر دستش شمشیری بود ونگہبانان آن لباس سرخ ووانگشتری می پوشیدند. گنیش داس مجسمہ ہای مختلفی ونگہبانان آنہا را ذکر نمودہ است ومیان این مجسمہ ہا مدرسہ بزرگ ہم بود کہ استادان وشاگردان در آن زندگی می کردند و

غذا و خزینہ آنہا از طرف حکومت پرداخت می شد، بہ این دانشجو یان زبان سانسکریت تدریس می شد و روز یکشنبہ در این درس گاہ علما و مردم شہر جمع می شدند و مباحث علمی می کردند. گنیش داس در تاریخ خود اغلب بہ ذکر فرہنگ ہای زشت و ناروای آن زمان می پرداز د. از مطالعہ تاریخ راج درشنی معلوم می شود کہ در زمان مہاراجہ ہا تہمت زدن، سودخواری، زنا کاری، دختر کشی و ستی رواج عام داشتہ. البتہ بعضی از مہاراجہ ہا در زمان حکومت خود بعضی از این فرہنگہا را فسخ کردند. ایشان می نویسد کہ وقتی مہاراجہ کرم رای در سال ۱۸۱ بکرمی بر تخت نشست یک شب در رویای خود دید کہ روی اش را سیاہ کردہ اند مہاراجہ از این رویا پریشان شد و ہمان صبح از معبر ہا تعبیر خواست، معبر ہا گفتند کہ تعبیر این است کہ دختری نحس از تو بہ دنیا خواہد آمد چنانچہ ہمین طور شد و دختری بہ دنیا آمد و بہ وقت تولد دختر، مرتاض ہا و معبر ہا گفتند کہ این دختر برای شما نحس است و کشتن این دختر بہتر است چنانچہ داسی ہا بہ حکم مہاراجہ در حرمسرا این دختر را کشتند و از بین بردند چنانچہ قتل این دختر بہ رسم دختر کشی در این قوم رواج پیدا کرد .

فرہنگ تہمت زدن: در فرہنگ عامیانہ مردم تہمت زدن امری رایج بود. خصوصا در مورد نامزدی دختر ہا بہ طوری کہ وقتی نوزاد دختری در خانہ کسی زاییدہ می شد مردم اطراف بہ آن خانہ رفت و آمد می کردند و کسی کہ بہ خانہ آن نوزاد دختر بیشتر از بقیہ ہا رفت و آمدی کرد ایشان می توان ادعا کند کہ آن دختر را برای پسر خود نامزد کند و اگر خانوادہ آن پسر و دختر در بارہ این نامزدی بہ مشکل می خوردند و قضیہ بہ عدلیہ می رسد و طبق قانون آن دوران عدلیہ بدون رضایت خانوادہ دختر، ازدواج را انجام می دادند. مردم ہا از این قانون عدلیہ ناراحت بودند مہاراجہ رنجیت دیو این رسم را منسوخ کرد و بہ جای آن قانونی وضع کرد کہ ازدواج در صورت رضایت ہر دو خانوادہ می تواند انجام شود و اگر خانوادہ دختر رضایت نداشتہ باشد خواستگاری صورت نمی گیرد و ہر گونہ ادعای از طرف خانوادہ پسر تہمت شمردہ شدہ و مستحق مجازات خواہد بود. ہمینطور اگر بہ خانہ کسی پسر بچہ ای فوت می کرد مردم بہ زنی تہمت می زدند کہ جگر خوار است و ایشان جگر بچہ را خوردہ است پس از این تہمت سربازان حکومت، آن زن مورد نظر را گرفتہ و شکنجہ می کردند مہاراجہ رنجیت دیو این رسم را نیز منسوخ کرد و تا زمان حیات وی ہر دو رسم تہمت زدن از بین رفتہ بود اما بعد از وفات مہاراجہ این رسم دوبارہ بہ جامعہ برگشت و ادامہ پیدا کرد .

فرہنگ سودخواری: مردم ثروتمند دو گروہ بہ نیازمندان پول می دادند و از انان سود می گرفتند . اگر کسی در مہلت مقرر سود آنان را پرداخت نمی کرد در عوض ایشان زنہا و بچہ ہای آن کس را کہ مقروض بود گروگان می گرفتند و بہ آنہا آزار و اذیت می رساندند و در برخی از موارد بیگاری می کشیدند مہاراجہ رنجیت دیو این

رسم را ہم منسوخ کرد۔

فرہنگ دختر کشی وستی: در فرہنگ راج پوت ہا رسم دختر کشی وستی وجود داشت. افراد این قبیلہ دختران را نحس می شمردند وانان را می کشند ورسم دیگری بہ نام ستی داشتند کہ این رسم در بارہ زنان بیوہ اجرا می شد بہ این شکل کہ ہر گاہ زنی ہمسرش از جہان می رفت آن زن را بعد از مرگ ہمسر بہ ہمراہ او آتش می زدند. راج پوت ہا این سنت ستی را با افتخار انجام می دادند ومہاراجہ نمی توانست برای جلوگیری از اجرای این رسم قانونی وضع کند از این رو خود شخصا نہ تنہا دختر انش را بہ قتل نرساند بلکہ بیش از پسران بہ انان محبت می کرد وبا آنہا مہربان بود وبا این شیوہ می خواست رسم دختر کشی را از بین ببرد. ہمینطور در مورد سنت ستی مہاراجہ وصیت کرد کہ بعد از وفات من ہیچ یک از زنہای من را نباید ستی کنند. اما متاسفانہ بعد از وفات مہاراجہ در دوران ہای بعدی ہر دو رسم دختر کشی وستی ادامہ پیدا کرد .

فرہنگ خودکشی برہمن ہا: برہمن ہادر ادوار مہاراجہ ہا با وقاری خاص زندگی می کردند واگر کسی حق آنان را ضایع می کرد بیرون خانہ آن شخص بہ اعتراض می نشستند تا وقتی کہ قضیہ ایشان حل شود واگر این قضیہ حل نمی شد برہمن ہا خودشون رو در آتش می سوزاندند یا با خنجر خود را ہلاک می کردند مہاراجہ رنجیت دیو در حکومت خود این فرہنگ را نیز منسوخ کرد .

اوضاع واحوال سیاسی: گنیش داس در تاریخ راج درشنی بہ شرح احوال سیاسی ادوار دومناطق مختلف پرداختہ است جاموا ز قدیم مرکز سیاسی محسوب شدہ است. وغیر از این اوضاع سیاسی پنجاب ولاہور ہم اشارہ کردہ است. ونیز روابط مہاراجہ ہای جامو با مہاراجہ ہای پنجاب وکشمیر را ہم بیان کردہ است. گنیش داس در این کتاب روابط مہاراجہ ہا نسبت بہ یکدیگر را بیان می کند مہاراجہ ہای کہ در تاریخ نسبت بہ یکدیگر مہربان بودند یا با ہم روابط ظالمانہ داشتہ اند ر انام بردہ است. گنیش داس می نویسد کہ وقتی مہاراجہ پہوج دیو بر تخت نشست با مہاراجہ پنجاب یعنی با جی پال روابط دوستانہ ای را استوار کرد در اواخر عمر مہاراجہ پہوج دیو، سلطان ناصر الدین سبکتگین در سال ۱۰۰۸ بکرمی و ۳۶۷ ہجری بر ہند حملہ ور شد ودر شہر ہای مختلف خونریزی کرد. مردم مای زیادی را بہ اسارات گرفت. مہاراجہ جی پال در برابر این یورش ایستادگی کرد ومہاراجہ جامو، پہوج دیو بہ کمک جی پال آمد. در طول این جنگی برف و باران زیادی صورت گرفت چنان کہ مہاراجہ پہوج با سپاہ زیادی خود از شدت برف و باران مردند. ودر سال ۳۷۱ ہجری بہ سبب خستگی لشکر مہاراجہ جی پال با سبکتگین صلح کرد. در سال ۱۰۳۱ بکرمی سلطان محمود غزنوی بہ ہند حملہ ور شد واموال مردم ہا را غارت کرد. در مقابل سلطان غزنوی. پسر پہوج دیو مہاراجہ پہلا دیو

جی پال را کمک کرد در این جنگ پہلا دیو و جی پال ہر دو کشتہ شدند. محمود غزنوی در این جنگ پیروزی یافت وشہر ہای ملتان، پشاور و پنجاب راتحت سلطنت خود درآورد محمود غزنوی غیر از این جنگ بار ہا بار بہ ہند حملہ کرد. مسعود غزنوی پسر سلطان محمود غزنوی، در زمان مہاراجہ اوتار دیو بر جامو لشکر کشی کرد ولی مہاراجہ جس دیو و نارو دیو با او مقابلہ کردند و سلطان را شکست دادند گنیش داس می نویسد کہ در زمان حکومت مہاراجہ چکر دیو در سال ۵۵۵ ہجری ملک خسرو از نسل محمود غزنوی بہ لاہور حملہ کرد و آنجا را تحت سلطہ خود گرفت و ۸۲ سال بر لاہور حکومت کرد و از این طریق بہ جامو ہم حملہ کرد و بعضی از مناطق کوہستانی را فتح کرد. و در سال ۵۷۹ ہجری سلطان شہاب الدین غوری بر غزنی حاکم شد. مہاراجہ جامو چکر دیو برادر خود را با ہدیہ ہای زیادی بہ طرف شہاب الدین فرستاد و او را برای حملہ بہ لاہور برانگیخت وشہاب الدین ہمان سال بہ لاہور حملہ کرد ملتان و پشاور را تسخیر نمود اما نتوانست قلعہ لاہور را فتح کند. بہ دستور مہاراجہ چکر دیو، حسین جرنیل را فرماندار منصوب کرد و خود بہ غزنی برگشت سپس در سال ۵۸۳ ہجری دوبارہ بر قلعہ لاہور یورش بردہ وقلعہ را فتح کرد۔

گنیش داس در بارہ روابط مہاراجہ جیو دیو کہ در سال ۸۲۹ ہجری بر تخت جامو نشست و سلطان زین العابدین والی کشمیر می نویسد کہ این ہر دو با یکدیگر روابط دوستانہ داشتند چنانکہ مہاراجہ جیو دیو با کمک سلطان زین العابدین کہ حاکم مہربان وعدل پرور بود از حملات پنجاب در امان ماند و دوران حکمرانی اش در امن و امان بود. در زمان حکومت کھوکر دیو کہ از نسل مہاراجہ جیو دیو بود پادشاہ مغول ظہیر الدین بابر در سال ۹۱۵ ہجری بہ ہند حملہ کرد وی از رود سند گذشت و بہ نزدیک بہلول پور رسید و از آنجا بہ طرف سیالکوت روانہ شد. درمیان راہ مہاراجہ کھوکر دیو برای پادشاہ ظہیر الدین بابر ہدایای فرستاد و از او استقبال کرد طوری کہ پادشاہ از حملہ بہ جامو منصرف شد و بہ طرف دہلی رفت .

منابع ومآخذ۔ ۱۔ لالہ گنیش داس، راجدرشنی، جموں ۱۸۴۷ م
۲۔ بت، غلام رسول مورخین کشمیر کی تاریخیں، سرینگر۔ ۲۰۰۸ م۔
۳۔ نرگس۔ نرسنگ داس، تاریخ دوگرہ دیس جامو۔ ۱۹۶۷ م۔

☆☆☆

Lesani Salahiyaton ka umoomi jaeza(LSRW) by Syed Tauqeer Imam (Asst.Prof MANUU CTE,Asansol,reasearch scholar MANUU college of teacher education,Darbhanga) Prof. Dr. Faiz Ahmad,Principal MANUU CTE,Darbhnaga)cell-

سید توقیر امام (اسسٹنٹ پروفیسر مانو سی ٹی ای آسنسول، وریسرچ اسکالر مانو، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، دربھنگہ) **پروفیسر ڈاکٹر فیض احمد** (پرنسپل، مانو، کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، دربھنگہ)

لسانی صلاحیتوں کا عمومی جائزہ (ایل ایس آر ڈبلیو)

Abstract: موجودہ نظام تعلیم کا سب سے بڑا چیلنج زبان کی تعلیم ہے۔ زبان تعلیمی اور غیر تعلیمی کارکردگی کے ساتھ ساتھ انسانی عمل کے ہر شعبے میں یہ خیالات، سوچ، احساسات، معلومات اور علم کے ابلاغ میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، نیز زبان کی مہارتیں تعلیمی اور پیشہ ورانہ اہداف کے حصول کے لیے ایک شرط ہیں۔ تعلیمی اصطلاح میں "لسانی صلاحیت" اور "زبان کی مہارت" کو ایک دوسرے کے بدلے استعمال کیا جاتا ہے۔ سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ان چاروں کو زبان سیکھنے کی چار بنیادی صلاحیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ لسانی صلاحیتیں (LSRW) زبان کی مہارت کو بہتر بنانے کے لیے بہت اہم ہیں۔ سننے اور پڑھنے کو قبول کرنے کی مہارت کہا جاتا ہے، جب کہ بولنے اور لکھنے کو اظہاری مہارت کہا جاتا ہے۔ سننے سے مراد بولے جانے والے جملوں میں بیان کیے گئے خیالات اور احساسات کو سمجھنا ہے اور یہ بات چیت کے عمل کا ایک لازمی حصہ ہے جبکہ بولنا معنی کی تعمیر کا ایک متعامل عمل ہے جس میں معلومات کی پیداوار، وصول کرنا اور عمل کرنا شامل ہے۔ زبان سیکھنے کے دوران پڑھنے کی صلاحیت زیادہ ضروری ہے، اور یہ الفاظ کی شناخت، نحوی تجزیہ اور تحریری فہم کا شعوری عمل ہے، جب کہ لکھنا تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ یہ لسانی صلاحیتیں (LSRW) مؤثر اور درست مواصلات کی مہارت کے لیےاور زبان کی قابلیت کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے بہت اہم اور ضروری ہیں۔ زبان سیکھنے کا بنیادی تعلق لسانی صلاحیتوں (LSRW) سے ہے، اس مقالے میں بنیادی توجہ لسانی مہارتوں (LSRW) کے جائزہ اور لسانی صلاحیتوں (LSRW) کی دیگر تفصیلات پر ہوگی۔

کلیدی الفاظ: لسانی صلاحیت، سننے، بولنے، پڑھنے، لکھنے کی صلاحیت۔

تعارف: زبان قدرت کے ذریعہ عطا کردہ ایک انمول تحفہ ہے جو انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ اور قیمتی اثاثہ بھی ہے زبان مختلف افعال انجام دیتی ہے لوگ زبان کو رابطے کے ذریعہ اور انسانیت کی سماجی علامت کے طور پر حاصل کرتے ہیں۔ یہ معلومات کی ترسیل اور سماجی تعلقات کو برقرار رکھنے کا بھی کام کرتی ہے اور لوگوں کے درمیان خیالات، احساسات اور تجربات کے تبادلے کے لیے ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ تاہم کسی بھی زبان کو سیکھنے کا بنیادی مقصد موثر ابلاغ ہے۔

جیسا کہ سپیر (1921) نے کہا ہے: " زبان خیالات، احساسات اور خواہشات کے ابلاغ کا خالصتاً انسانی اور بدیہی طریقہ ہے جو رضا کارانہ طور پر تشکیل شدہ علامتوں کے نظام کے ذریعے ہے جسے تقریر کا حصہ کہتے ہیں۔ یہ علامتیں ابتدائی طور پر قابل سماعت ہیں اور قوت گویائی کے لیے برائے نام تیار کی گئی ہیں۔" اسے اگروال (2003) نے اپنے الفاظ میں یوں کہا ہے کہ " زبان علامتوں کے ایک سیٹ کے طور پر بہت سے لوگوں کے ذریعہ کم وبیش اسی طرح کے طریقوں سے استعمال ہوتی ہے، جس طرح لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔

" زبان کسی کے خیالات اور احساسات کی ترجمان ہے جو اسے ایک شکل دینے میں سہولت فراہم کرتی ہے، زبان نہ صرف رابطے کا کام کرتی ہے بلکہ یہ رابطے کے لیے بہترین ذریعہ ہے "Lakhera, et.al (2017)

لسانی صلاحیت: لسانی صلاحیت کی تعریف کسی زبان کو حاصل کرنے کی اہلیت کے طور پر کی جاتی ہے اور لسانیات سائنسی انداز میں زبان کا مطالعہ ہے۔ میٹنگلی (1972) نے "لسانی صلاحیت" کو ایک مقرر یا سامع کی لسانی مواد کی بجائے لسانی اظہار پر توجہ مرکوز کرنے اور بعض لسانی علامتوں پر شعوری طور پر عکاسی کرنے کی صلاحیت" کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ 'لسانی صلاحیت" کے معنی زبان سے متعلق مہارتیں ہیں، اور اکیڈمیا میں 'لسانی صلاحیت" اور " زبان کی مہارتیں" دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کے بدلے استعمال ہوتی ہیں۔ فاطمہ و دیگر حضرات نے (2019) میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زبان سیکھنے کا بہترین طریقہ زبان کی چار مہارتوں یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہے۔ زبان کی ان چار بنیادی صلاحیتوں کو لسانی صلاحیتیں کہا جاتا ہے۔ ان چار پہلوؤں میں سے ہر ایک سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہے۔ ' سننے اور پڑھنے کو قبول کرنے کی مہارت کہا جاتا ہے کیونکہ سیکھنے والا عام طور پر غیر فعال ہوتا ہے اور سننے یا پڑھنے کے ذریعے معلومات حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف بولنے اور لکھنے کو نتیجہ خیز

ہنر کہا جاتا ہے کیونکہ ان مہارتوں کو استعمال کرتے ہوئے سیکھنے والا نہ صرف متحرک ہوتا ہے بلکہ بولنے میں آوازیں اور تحریری طور پر علامتیں (حروف وغیرہ) بھی پیدا کرتا ہے۔(حسین،این.2015)

سننے کی صلاحیت: قوت سامعہ انسان کے لیے قدرت کا ایک انمول تحفہ ہے اور سننا پیغام کو مؤثر طریقے سے حاصل کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ hearing اور listening دونوں مختلف عمل ہیں۔hearing سننا کانوں کے ذریعے دماغ تک آواز کا ادراک اور ان کے معنی بتانا ہے جبکہ Listening سننا خیالات کا ادراک ہے اور بولے گئے الفاظ میں ظاہر ہونے والے احساس کو کہتے ہیں۔شرما (2011) نے بیان کیا کہ سمجھنا، برقرار رکھنا اور جواب دینا سننے کے تین اہم اجزاء ہیں۔لکھیرا (2017) نے کہا کہ سننا ایک ایسا عمل ہے جس میں سماعت، فیصلہ کو سمجھنا، اور بولنے والے کے الفاظ اور پیغامات سے معنی نکالنا شامل ہے۔

سننے کے پانچ مراحل ہوتے ہیں سننا، سمجھنا، یاد رکھنا، تشخیص کرنا اور جواب دینا۔سماعت کے طور پر پہلا قدم کان کے ذریعے دماغ تک پہونچنے والی آواز کی لہر کا ادراک ہے جبکہ دوسرا مرحلہ اس آواز کی فہم ہے۔ یہ قدم ان علامتوں کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے جو ہم نے دیکھی اور سنی ہیں ہمیں ان محرکات کے معنی کا تجزیہ کرنا ہے جو ہم سمجھے ہیں۔ یاد رکھنے کے مرحلے میں جب ایک پیغام موصول ہوتا ہے تو اسے روکا جاتا ہے اور اسے ذہن کے اسٹوریج بینک میں شامل کیا جاتا ہے اور یہ اس سے بالکل مختلف ہوسکتا ہے جو اصل میں دیکھا یا سنا گیا تھا۔ تشخیص کے مرحلے میں، ایک فعال سامع شواہد کی پیائش کرتا ہے اور پیغام میں تعصب یا تعصب کی موجودگی یا عدم موجودگی کی تعین کرتا ہے۔ سننے کے عمل کا آخری مرحلہ جواب دینا ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ وصول کنندہ اس عمل کو زبانی یا غیر زبانی تاثرات کے ذریعے مکمل کرے۔

سننے کی صلاحیت کو بڑھانے کے طریقہ: Hearing سننا اور Listening سماعت کرنا دو مختلف سرگرمیاں ہیں۔Hearing غیر فعال ہے جبکہ Listening ایک فعال عمل ہے، Hearing ایک نفسیاتی عمل ہے اس لیے اسے باقاعدہ مشق سے بڑھایا جاسکتا ہے اور Listening ایک بہت ہی مفید صلاحیت ہے۔ سننے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے چند تجاویز ذیل میں مذکور ہیں اس طرح کے اقدامات سننے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سازگار ہیں۔

1۔ سننے کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ پریزنٹیشن کو پرکشش اور دلچسپ بنایا جائے۔2۔ سننے کے عمل کو موثر بنانے کے لیے پرکشش انداز میں تقاریر کے ذریعے جگہ اور منظر کی

واضح تصویر پیش کرنا یہ سننے کے عمل کو نہ صرف دلچسپ اور قابل فہم بنائیں گی بلکہ کامیابی کے ساتھ فروغ بھی دیں گی تا کہ بات چیت کی صلاحیت کوتقویت ملے۔3۔ سننے کی مہارت کوفروغ دینے کے لئے آمنے سامنے کی بات چیت ایک اہم تکنیک ہے۔4۔سیمینار اور بحث ومباحثہ میں حصہ لینا لسانی صلاحیتوں کے لیے مفید ہے۔اس سے تلفظ، بات چیت اور روانی کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے۔

5 سننے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے انٹرویو، بحث، ٹاک شو،خبریں سننا بھی ایک بہتر طریقہ ہوسکتا ہے۔6۔بیان کی وضاحت زبان کی تعلیم کا ایک اہم عمل ہے، جملے کے معنی اور مفہوم کو صحیح طریقے سے بیان کیا جائے تو سامع خود بخود غور سے سننے پر مجبور ہو جائے گا،اس سے فہرست سازی کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔7۔ سننے کی صلاحیت کوفروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ زبان کی مہارت کے حصول کوفروغ دیا جائے جو کہ بات چیت کی مہارت کوفروغ دینے میں مدد کرتا ہے۔

بولنے کی صلاحیت: کسی بھی زبان کو بولنے کے لیے ذخیرہ الفاظ اور جملوں کی ساخت سے واقفیت بہت ضروری ہے۔اسی طرح کسی بھی زبان کوسیکھنے کی بنیادی مہارتیں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہے،اور ان مہارتوں میں کمال حاصل کرنے کے لیے مواد، مشق اور زبان سیکھنے کے لیے مسلسل کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔بولنا ہر شخص کی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔'بولنے سے مراد مختلف سیاق وسباق میں زبانی اور غیر زبانی علامتوں کے استعمال کے ذریعے معنی کی تعمیر اور اشتراک کا عمل ہے۔یہ معنی کی تعمیر کا ایک رواں عمل ہے جس میں معلومات کی پیداوار وصول کرنا اور عمل کرنا شامل ہے"(شروف،این ڈی)

بولنے میں حاصل کی گئی مہارتیں لکھنے اور پڑھنے میں منتقل ہوتی ہیں۔یہ ان صلاحیتوں کو تعلیمی پیشہ میں لاگو کرسکتی ہے۔واضح رہے کہ زیادہ تر لوگوں کے لیے کسی بھی زبان کا علم اس زبان کو بولنے کی صلاحیت کے مترادف ہے، کیونکہ انسانی رابطے کا بنیادی ذریعہ بول چال ہے (2006)اور بہتر رابطے کے لیے بولنے کی مہارت کو ایک بہت اہم جز سمجھا جاتا ہے۔

بولنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی حکمت عملی: بولنے کی صلاحیت کوفروغ دینے کے لیے مختلف طرح کی حکمت عملیوں پر زور دیا جاتا ہے،اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ کسی بھی زبان کوسیکھنے کا مقصد یا تو مؤثر طریقے سے بات چیت کرنا ہے یا طالب علم کی بات چیت کرنے کی صلاحیت کو بہتر بنانا ہے۔بولنے کی صلاحیت زبان کی نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔درج ذیل حکمت عملیاں بولنے کی صلاحیت کوتقویت بخشیں گی۔

1۔سیکھنے والوں سے درسی کتابوں کا ایک پیراگراف پڑھنے کو کہا جائے اور انہیں یہ بھی مشورہ دیا جائے

کہ وہ دیے گئے موضوع پر ایک درست تقریر کریں۔2۔بحث کرنے کی تکنیک کے ساتھ بولنے کی مہارت کو فروغ دینے کے لیے مختلف طرح کی سرگرمیوں کا انعقاد اورعصری موضوعات پر مباحثوں کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔3۔مختلف چیزوں کی صورتحال کے ساتھ ساتھ کسی کی شخصیت کو بیان کرنا اور ذاتی طور پر بولنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنا بہتر اقدام ہے،اس سے عوامی مقامات پر بولنے کا خوف بھی دور ہوجائے گا۔4۔کھیل کودایک ایسا ذریعہ ہے جس کے ذریعے کوئی بھی چیز بہت آسانی سے سکھائی جاسکتی ہے۔زبان کی مہارت سکھانے میں کھیلوں کا نقطہ نظر بہت مفید ہے۔
5۔لسانی لیبارٹریز/تجربہ گاہ کی مدد سے کسی بھی زبان کو جدید اور موثر طریقے سے سیکھا جاسکتا ہے اور بولنے کی صلاحیت کو بھی بہت اچھے طریقے سے بڑھایا جاسکتا ہے۔
پڑھنے کی صلاحیت: پڑھنے کی صلاحیت کی حیثیت زبان کی تعلیم کے مرکز میں ہے یہ زبان سیکھنے کی چار بنیادی مہارتوں میں سب سے اہم صلاحیت ہے۔سننا اور بولنا غیر شعوری یا قدرتی طور پر سیکھا جاسکتا ہے۔جہاں تک پڑھنے کا تعلق ہے تو یہ مشقی اور شعوری عمل ہے۔(لکھیرا،2017) نے بیان کیا ہے کہ ایک طالب علم طباعت شدہ متن کو اپنی مہارت کے ذریعے پڑھ اور سمجھ کر اس سے معلومات حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔طلباء کے تعلیمی کیریئر کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی کے حالات میں پڑھنے کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔پڑھنے کا مطلب الفاظ کو دیکھنا، پہچاننا اور بولنا ہے اور پڑھنے کا عمل پوشیدہ یا پوشیدہ تحریری علامتوں اور ان کی آوازوں کا احساس دلاتا ہے۔گاربی، ڈبلیو (2009) نے وضاحت کی ہے کہ لفظ کی شناخت،نحو،تجزیہ،اور تحریری متن کے تفہیمی عمل کو پڑھنا کہا جاتا ہے۔
پڑھنے کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی حکمت عملی:1۔ بلند آواز سے درسی کتاب پڑھنے سے پڑھنے کی مہارت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے اور تلفظ کی غلطیاں بھی کم ہوتی ہیں، اور ذہنی دباؤ سے وقفہ ملتا ہے۔2۔پڑھنے کی مہارت کو بہتر بنانے کے لیے انفرادی کام بہت مفید ہے۔3۔متن میں موجود مواد، الفاظ کی نوعیت اور خیالات کی گہرائی مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔4۔استاد کو چاہیے کہ وہ طلباء کو جملے پڑھنے کی ترغیب دیں اور لفظ بہ لفظ پڑھنے سے روکیں۔5۔زبان سیکھنے میں خاموش خوانی بہت ضروری ہے،اس لیے استاد کو چاہیے کہ ایسی کتابوں کا انتخاب کریں جو اچھے معیار کی ہوں اور طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہوں۔
لکھنے کی صلاحیت: زبان سیکھنے کے چار بنیادی مقاصد ہیں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا۔ان لسانی

صلاحیتوں (LSRW) میں سے، سننا اور پڑھنا فطری اور نظریاتی ہیں جبکہ بولنا اور لکھنا عملی ہیں۔لکھنا ایک انسانی عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خیالات کا اظہار علامتوں یعنی حروف اور الفاظ کے ذریعہ کرتا ہے۔لکھنا تخلیقی اور ثقافتی زندگی کا اظہار اور شخصیت کی تشکیل کا مظہر ہے، اس لیے لکھنا زبان کی تعلیم میں ایک اہم عنصر ہے۔(Alidmat, 2017) نے مشاہدہ کیا کہ لکھنا ایک منفرد مہارت ہے کیوں کہ اسے عموماً کلاس روم میں سکھایا جاتا ہے۔لکھنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے سیکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل طریقے اپنائیں۔

لکھنے کی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی حکمت عملی:1۔ ہر فرد کو اخبارات اور رسائل سے پیرا گراف پڑھنے اور پیرا گراف سے اہم الفاظ اور نکات کی نشاندہی کرنے اور انہیں اپنی زبان میں دوبارہ لکھنے سے مدد ملتی ہے۔2۔سیکھنے والوں سے حالات حاضرہ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ حال ہی میں دیکھی گئی فلموں پر اپنے خیالات لکھنے کو کہا جائے، اس سے جملے کو آزادانہ طور پر لکھنے اور الفاظ کو مناسب طریقے سے استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔3۔سیکھنے والوں کو روزانہ ڈائری لکھنے کی ترغیب دی جائے، اس سے ان کی وضاحت، درستگی، اتحاد اور موضوع کی تکمیل کے ساتھ لکھنے کی صلاحیت میں بہتری آئے گی۔4۔متن کی تشریح کو عام طور پر متن میں دی گئی معلومات کی تفہیم سمجھا جاتا ہے۔اس سے دلائل لکھنے کی مہارت پیدا ہوتی ہے۔5۔کتابیں لکھنے میں مناسب طریقہ کار اور ساخت پر عمل کرنا ضروری ہے۔یہ موضوعات، تصورات اور باب کے منصوبوں کے بارے میں آگاہی پیدا کرتا ہے۔

خلاصہ بحث: اکیسویں صدی کی تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے روانی سے بات چیت کے لیے لسانی صلاحیتوں میں اضافہ (LSRW) ایک شرط ہے۔زبان کی مہارتیں صوتی مواصلات کی مہارت میں بہت اہم اور ضروری کردار ادا کرتی ہیں۔زبان کی چار بنیادی مہارتیں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہے انہیں کئی طریقوں سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔سننے کی مہارت کو زبان کے حصول، پریزنٹیشن کے انداز، گفتگو، آپسی بات جیت اور عوامی خبروں کے ساتھ ساتھ ان حکمت عملیوں جیسے کہ ڈیبیٹ، مباحثہ، انٹرویوز اور ٹاک شوز میں حصہ لینا نیز تعلیمی ادارے کے دیگر اراکین کے ساتھ بات چیت کی مدد سے بہتر بنایا جاسکتا ہے۔پڑھنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے لیے نصابی کتب کو باقاعدگی سے پڑھنا اور اقتباس میں استعمال ہونے والے مواد، الفاظ اور فقروں کی نوعیت پر توجہ دینا ہے۔دوسری طرف لکھنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کے مختلف طریقے اپنائے جاسکتے ہیں مثلاً حالات حاضرہ پر اپنے

خیالات لکھنے، روزانہ ڈائری لکھنے کی عادت، متن کی ترجمانی اور گردونواح میں کیا کیا ہورہا ہے اس کو
تحریر کرنا وغیرہ۔ مجموعی طور پر لسانی صلاحیتوں کی بہتری (LSRW) موثر اور طاقتور مواصلاتی
مہارتوں میں معاون ثابت ہوگی۔

References

1. Ahmad, R(2016(. Urdu Tadrees: Jadeed, Tareeqe Aur Taqaze, Maktaba Jamia Limited, New Delhi.

2. Fatima, M. &Kumar, B. K.)2019(. Influencing the LSRW Methods in Telangana Schools with Reference to Sociological Factors. Pramana Research Journal, Volume 9.Issue1, 2019.

3. Hosain, N.)2015(.Language and Language Skills, https//:www.reseachgate.net/ 2743

4.Lakhera, H.&Biswal,A.(2017(.Strategies to enhance English language skills in students at secondary level, International journal of multidisciplinary approach and studies,vol.04,no.5,29-36.

5. Najmus, S&Sabira, S(2006(.TadresayUrdu, Premier Printing House. Hyderabad

6. Mukta.)2011(. A Study of effect of Edusat on Curiosity, Linguistic ability and Achievement of Primary School

7. Naqvi, T.F. &Nadeem, A(2018(.Urdu Zaban Ki Tedrees wa Faham, Educational Book House, Aligarh.

8. Shrouf, F.)n.d.(. Teaching and Improving Speaking Skill. Philadelphia University. Retrieved On 14.10.2023from

http//:www.philadelphia.edu.jo/academics/fshrouf/uploads/speaking.pdf

☆☆☆

"Sone Lanke path" Husen ka dareecha by Asif Ali Bhat

(Wahedatpora,Budgam)cell-7889912330

آصف علی بٹ (بڈگام)

"سنہ لانکہِ پٹھ" حسن کا دریچہ

"سنہ لانکہِ پٹھ" کشمیری زبان کے ممتاز اور گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شاعر رحمان راہی کی تخلیق کردہ ایک آزاد نظم ہے جو ان کی شعری مجموعہ "نوروزِ صبا" میں شامل ہے۔ یہ نظم جولائی ۱۹۵۶ء میں ضبطِ تحریر لائی گیئے جو ترقی پسند تحریک کے جولان سے نکل کر تخلیقی آزادی کی اور آغازِ سفر تھا۔

"سنہ لانک" دراصل جنتِ ارضی کشمیر کے عالمی شہرہ آفاق جھیلِ ڈل میں واقع ایک دل فریب جزیرہ ہے جسے عرفِ عام میں" چار چنار" کہتے ہے کیونکہ اس جزیرے کی اراضی کے چاروں کونوں پر چار تناور درخت لگے ہوے ہیں۔"اچھا ہم چلتے ہیں" گیت کو اسی جزیرے پے فلمایا گیا تھا جس کے بعد یہ جزیرہ سیاحوں کے لیے مقناطیسی عمل کو انجام دیتا رہا۔"سنہ لانکہِ پٹھ" نظم واضح طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔ حال، ماضی اور مستقبل۔حصہِ اول حال ہے۔اس حصے میں شاعر نے جھیلِ ڈل کے بالکل وسط میں یعنی" سنہ لانک" پے بیٹھ کر گردونواح کے قدرتی حسن کا نہایت ہی باریک بینی سے مشاہدہ کرکے ایک روح پرور خاکہ کھینچا ہے۔سرِ شام جھیل ڈل کا پر کیف منظر اس قدر مرغوب الطبع ہوتا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ شکارا پانی پر نہیں بلکہ پگھلتے ہوے سونے پر چل رہا ہے۔ایک طرف آفتاب قبل از وقت یوں غروب ہو رہا ہے کہ شوخ رنگ شفق کے دہکتے صنوبروں کی آگ سرمئ ہو رہی ہے۔ دوسری طرف پسِ کوہ سے چاند آہستہ آہستہ زینہِ طلوع چڑھ رہا ہے۔ایسے میں شاعر کی خیالاتِ قندیل کیونکر بے نور رہ سکتی ہے ؎

از ہنا بروٹھے پہن اختابہ لوس   شوخ رنگ شفقک سُہ کا یر نار لوت لوت سور گو
شامہ ژھایوا کھ اکس بنگال زلفن شانہ کور   بالہ پت لوت پور تراواں زون کھژ

تاروں کی پلکیں مستی سے لبریز ہیں۔ پانی کی لہر اٹھنے سے کنول کا پھول جاگ اٹھتا ہے۔ شاعر کو لگ رہا ہے کہ شالیمار کا کوہ خواب دیکھ رہا ہے۔وہ قاری کو بھی اس جزیرے پے بیٹھنے کی دعوت دے رہا ہے کیونکہ یہ شہر کے شور و غل سے بالکل مبرا ہے ؎

تارکن مستی پچھے ٹارن منز برتھ ہورکن ووتھ آبہ ملرا، یورکنہ پمپوش گو بیدار رہیو

شالمارک کہ چھُ زن خواباؤ چھان اکھ دما یتھ لانکہ پٹھ بیہہ، وچھ تماشامیان پاٹھ

یوروا تتھ شور شہرک پان پانے کول گڑھان

مینڈکوں کی جلترنگ نے پاتال سے عرش تک ایک عجیب ساز وسرود پیدا کیا ہے۔شاعر نے "تیل بل" اور" ووٹھ کدل" کے نام لے کر جو کہ جھیل ڈل کے کنارے آباد بستیاں ہیں،نظم کو ایک مقامی رنگ دینا چاہا ہے ۔

بوز کمہ انمانہ ہیبت مانوژ پاسے واین جلترنگ کیاہ مودر سوز اسر ودا پھیو رتلپا تالہ پٹھ اسمان تام

تیل بل کندرایہ ظاہر بیاکھ سالان شکار ووٹھ کدلس نش چھُ وِنہِ ڈنگس اندر پرزلان گاش

کشمیری زبان میں ایسی اور بھی چند نظمیں ہیں جو مذکورہ نظم کے حصہ اول سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔غلام احمد فاضل کشمیری کی نظم" زونہِ منز ڈل "اور غلام نبی فراق کی نظم" حسن ہر رنگس اندر نیران چھُ نون "

بالہ پت کھڑ زون، وژھ بے اختیار آبس اندر ی ڈلس منز عام گوولگ اشتہار آبس اندر

زونہ گاشک ساز بے آواز آ بک جل ترنگ یِی کنو بوز،نندرِ ہوت ووتھ آبشار آبس اندر

"زونہِ منز ڈل "

شفقہ کس سودرس اندر وٹھ لاے افتابن تہ ژول ہمہِ بالہ پت

کاینا تس رنگ چھِ بدلان ون کینس برزس اندر نارژھٹھ ہش پھیرِ وچھُ بالن ڈلن

اکھ اکس رخصت ہوان تل جانو ارو چر گیشا فضہس اندر

اڈ نسیم باغس کنتھ،اڈ تیل بل کن غاب گے "حسن ہر رنگس اندر نیران چھُ نون "

ہم یہ بات بے خوف و بے تردد کہہ سکتے ہیں کہ نظم کا حصہ اول رومانیت کی تال پر رقصاں ہے۔شاعر نے بالکل عام موضوعات آفتاب، چاند، تارے، پہاڑ،جھیل،شام وغیرہ کا انتخاب کرنے کے ساتھ ساتھ سادہ وسلیس زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔لیکن وہ کسی بھی پہلو کو اظہار بخشنے کے وقت ذرا بھی تخیل سے غافل نہیں رہیے ہیں۔یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ شاعر نے کسی بھی منظر کو پیش کرتے وقت تجریدیت کے برعکس شبیہوں Images کا سہارہ لیا ہے۔

حصہ دوم میں شاعر ماضی کی طرف رجوع کرتا ہے۔جزیرے کے قرب وجوار کا قدرتی حسن دیکھ کر شاعر کو اب یہ محسوس ہورہا ہے کہ وہ ایسا پہلا فرد نہیں جس نے "سنہ لانک" پے بیٹھ کر اس

حسن کو محسوس کیا ہوگا بلکہ اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنے لوگ آے ہونگے اور اس جزیرے پے بیٹھے ہونگے ۔لیکن اب وہ زیرِ خاک ہونگے ۔شاعر سے اب تصور بھی نہیں کیا جاتا کیونکہ اسے اکتاہٹ محسوس ہورہی ہے۔ وہ اب تصور کرنے کا کام قاری کے سپرد کرر ہا ہے ۔

سونچ کم کم شوقہ ہت آسن نسیمک بونہِ ہوہن ساومت   سونچ ژے، مے چھُ سونچ وارا گے تلان
سونچ ژے، مے چھُ سونچ از باسان ڈیکس پٹھ   زن ٹُلوتین گل وہان

شاعر قاری سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تم ہی تصور کرو کہ کتنی ماہ جبینوں نے اپنی سیماب جیسی تن کو اس پانی سے نہلا یا ہوگا، کتنے عاشق دل ڈل کے کنارے اپنے محبوب کے منتظر رہیے ہونگے ، کتنے شہنشاہوں کو یہ حسن و جمال دیکھ کر اپنی تہی دامنی کا احساس ہوا ہوگا ، کتنے بے باک روحوں نے ستاروں کو دوست گردانتے ہوے زندگی کی بے قراری انہیں سنائ ہوگی ، اس جزیرے کے مدہوش شام نے آج سے پہلے بھی کئ میرے جیسے دیوانے شاعر اپنے حسن میں مصروف رکھے ہونگے، وہ بلبلیں اڑ کے چلے گیے ہیں جو اب کبھی بھی لوٹ کے یہاں واپس نہیں آسکتے ہیں ۔

کاتہن شاہنشہن یمہِ شایہِ یُتھ حسناوُ چھتھ   آسہن باسان برت دامانہ ژھر......
کاتہو بے باک روحو آسہِ ازتامتھ یتھس تارکھ نبس   دوست گنز رتھ زندگی ہنز بیقراری باوِمژ
ہاے یمہِ سنہ لانکہِ ہند مدہوش شامن آسہن   بارہا از برونہہ تہِ آورمت مے ہو دیوانہ شاعر واریاہ
ہاے تم نوزک نوا بلبل تہِ گیہِ وُڈواہ کرتھ......   یس اکھا گو، وہ سہ گو، افسوس گو!

کا نہہ جلا چھنہ تورزا نہہ پھیرتھ یوان!

اس نظم کا آخری حصہ مستقبل ہے یعنی شاعر رفتگان کے بارے میں سوچ سوچ کر اب اس تصور کے شکنجے میں پھنس جا تا ہے کہ کل وہ بھی اوروں کی طرح زیرہ خاک ہوگا اس پے اس قدر موت کا خوف طاری ہو جا تا کہ وہ (Thanatophobia) مرض کا شکار ہو جا تا ہے ۔ یہاں شاعر اس لیے موت سے خوف زدہ نہیں ہے کہ بعد از مرگ اس سے قبر کے اندر زندگی کا حساب کتاب لیا جاے گا، بلکہ اسے یہ غم کھاے جارہا ہے کہ وہ یہ حسن مرنے کے بعد کبھی بھی نہیں دیکھ پاے گا، وہ اس جزیرے پے کبھی بھی شام کے وقت نہیں بیٹھ پاے ※ گا، وہ اس قدر اپنے آپ کو موت کے آگے بے بس محسوس کرر ہا ہے کہ وہ حیران ہو کے پوچھ رہا ہے کہ کیا موت کے پنجرے کی کھڑکی ذرا بھی کھلی نہیں رہتی ہے ۔آخر کار وہ بدعا دیتا ہے کہ موت ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی ہی کارسازی میں اسیر ہو جاے ※ اور زندگی کو دوام حاصل ہو جاے ۔

موتہ کس پنجرس چھناڈوژھ تہِ روزان دارزانہہ!　　ہاے اتھ سنگین قلایس سپدِ ناول ول شگاف!
واے کر گرژھِ اتھ طلسماتس نر!　　پاٹ کیم سند پاٹھ کر گرژھِ
موت پننی کارسازی منزاسیر!　　زندگانی سپدِ کر حاصل کمال!
کرچھُ انسانس بنن ون لازوال !

کشمیری زبان کے معروف شاعر و نقاد محترم مجروح رشید صاحب اس نظم کے حوالے سے اپنی کتاب" عصری کاشر شاعری" میں رقمطراز ہیں کہ:

"شاعر چھُ اتھ نظمہِ منزاکہِ طرفہ زندگی ہندس حسنس سام ہوان تہ بییہ طرفہ چھُ تس موتک خوف بانبرپاوان۔ یہِ نظم چھے وضاحتی استھ تہِ خش کران خاص کرتھ چھُ نظمہِ ہندیہِ مصرعہ پرن والس زنتہِ مژِ نندرِ تلان ے

موتہ کس پنجرس چھناڈوژھ تہِ روزان دارزانہہ! "

☆☆☆

Sheikh Yaqoob Sarfi ke ahwal aur farsi asaar par ek nazar by Dr. Shazia Bano(dept.of Persian,Jamia Millia Islamia)cell-8494044653
Dr. Safi Mohd.Naik(dept.of Persian,Delhi University,Delhi)
ڈاکٹر شازیہ بانو (شعبہ فارسی، دانشگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)
ڈاکٹر صفی محمدّ نایک (شعبہ فارسی، دھلی یونیورسٹی)

شیخ یعقوب صرفی کے احوال اور فارسی آثار پر ایک نظر

کشمیر قدیم زمانے سے ہی علم اور ادب کا مرکز رہا ہے اس سرزمین پر منفرد فنکار، بلند پایہ صوفی اور دینی پیشوا پیدا ہوے۔ شیخ یعقوب صرفی کا شمار بھی ان ہی برگزیدہ شاعروں اور صوفیوں میں ہوتا ہے شیخ یعقوب صرفی کی پیدائش ۹۲۸ھ مطابق با ۱۵۲۱ء کشمیر شہر سرینگر میں ہوئی۔ صرفی ایک دیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے آپ کے والد کمال الدّین شیخ حسن ایک عالم اور فاضل شخصیت مانے جاتے تھے صرفی کے خاندان کو عاصمی اور گنایی دونوں القاب سے یاد کیا جاتا ہے صرفی بچپن سے ہی بہت ذہین اور ہوشیار تھے ابتدایی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ سات سال کی عمر ہی میں قرآن حفظ کرلیا۔ اسی دوران فارسی میں شعروشاعری کا بھی آغاز کیا اور اپنے والد سے ہی اصلاح لیتے تھے چنانچہ اس بارے میں خود فرماتے ہیں ۔

چودر سال ھشتم نہادم قدم	زطبعم رواں گشت شعر عجم
پدر کردی اصلاح اشعار من	باصلاح بودمی مددگار من

شیخ یعقوب صرفی نے اس زمانے کے ممتاز عالموں اور فاضلوں سے علم حاصل کیا اور سب سے پہلے مولانا آنیؔ کے علم اور دانش سے فیضیاب ہوگیے۔ جو مولانا جامیؔ کے شاگرد تھے اور فن تعمیہ، معما گویی، تصوّف، شعروشاعری اور فنون لطیفہ میں اسقدر مہارت حاصل کی کہ استاد نے ان کو جامی ثانی لقب دے دیا۔ اس کے بعد صرفی نے ایک ممتاز عالم و فاضل ملا حافظ بصیر خندہ جوئی جو کہ اس وقت کے عارفوں اور صوفیوں میں سے تھے، مختلف علوم جیسے منطق، اصل معانی اور تصوف سے بہرہ مند ہوگیے اور اس زمانے کے معروف عالم دین مولانا میر رضی الدّین سے علم صرف ونحو اور علم فقہ سے روشناس ہوگیے ۔صرفی نے انیس سال کی عمر میں خراسان کا سفر شروع کیا اور شیخ حسین خوارزمی کی

خدمت میں پناہ لی اور فیضیاب ہوے اور ان کے خاص شاگردوں کی صف میں ایک خاص مقام پر فسبقت حاصل کی اور اسی دوران ان کے دل میں تصوّف اور عرفان کی شمع روشن ہوگئی۔ شیخ یعقوب صرفی اس مطلب کو یوں اپنے اشعار میں بیان کرتے ہیں ۔

درآندک زمان ساخت روشن ضمیر تعجب مکن، گرمرا نیز پیر
شداز پرتوم روشنایی گزین چہ روشن ضمیری، کہ روی زمین

شیخ کمال الدین حسین خوارزمی ان کے رویے، افعال، گفتار اور معنوی علوم سے متاثر ہوکر ،انہیں ہدایت اور ارشاد کی سند عطا کی۔ اس کے بعد صرفی اپنے وطن واپس آ گئے۔ چند سالوں کے بعد صرفی اپنے مرشد سے ملنے کے لیے دوبارہ سفر پر گئے اور جب شیخ کی خدمت سے فراغت ملی تو انہوں نے مزید تجربہات حاصل کرنے اور حصول علم کے غرض سے مختلف مقامات مثلا سیالکوٹ، لاہور، کابل، سمرقند، مشہد، مکہ اور مدینہ کا سفر کیا اور ممتاز عالموں، باکمال صوفیوں سے روحانی کمال اور معنویت سے فیض حاصل کیا اور متداول علوم سے مالا مال ہوئے۔ حج کے دوران صرفی کی ملاقات خواجہ سلیم چستی سے ہوئی اور ایک دوسرے سے اس قدر عقیدت ہوگیی کہ صرفی نے شیخ سلیم کو کبروی خاندان کی رہبری کا سرٹیفیکیٹ دیا اور شیخ چستی نے صرفی کو چستی خاندان کی رہبری کا سرٹیفکیٹ دیا۔ طویل سفر کے بعد جب وہ ہندوستان پہنچے تو صرفی نے دوسرے شہروں کا دورہ کیا اور اس وقت کی اہم شخصیات سے ملاقاتیں کیں۔

اس طویل سفر کے بعد شیخ یعقوب صرفی کشمیر واپس آئے اور درس وتدریس کا آغاز کیا۔ صرفی کی ۲۵ سال کی عمر میں شادی ہوئی اور ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، لیکن وہ اپنی جوانی میں ہی وفات پائی۔ صرفی اکبر بادشاہ اور اس کے والد ہمایوں کی نظر میں قابل احترام تھے۔ خواجہ عبدالحمید عرفانی اپنی کتاب" تذکرہ شعرای فارسی زبان کشمیر "میں لکھتے ہیں:

’’اکبرشاہ و پدرش ھمایون شاہ عقیدت بخدمت شیخ داشتند وابوالفضل اورا بزرگترین عالم دین درعصر خودقلمداد کردہ وگفتہ است کہ صرفی درتمام انواع شعروعلوم مختلف تسلط کامل داشت۔‘‘

"اکبر شاہ اور ان کے والد ہمایوں شاہ شیخ سے کافی عقیدت رکھتے تھا، اور ابوالفضل انہیں اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم دین مانتا تھا اور کہتا تھا کہ صرفی کو ہر قسم کی شاعری اور مختلف علوم پر مکمل عبور حاصل ہے۔" صرفی ۱۵۹۵ء میں ۷۵ سال کی عمر میں اس دارالفانی سے دارالآخرہ کی طرف کوچ کیا۔ اگرچہ شیخ یعقوب صرفی کا کوئی دوسرا بیٹا نہیں تھا، لیکن اس نے معزز اور کامل طلبا کی پرورش کی۔ جن میں

محمد میر، مولانا حسن آفاقی ، میر سید حمزہ کریری ، شاہ قاسم حقانی ، خواجہ حبیب اللہ حبی نوشہری ، خواجہ حبیب اللہ عطار، شیخ احمد سرھندی و شیخ محمد حسن گنایی قابل ذکر ہے ۔ شیخ یعقوب صرفی کا شمار مشہور خطیبوں اور علما میں ہوتا ہے۔ وہ شاعری اور نثر میں بلند مقام رکھتے ہیں اور انہوں نے فارسی ادب میں ایک قیمتی اور انمول سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے صرفی نے اپنی نظموں میں بھی اپنی شاعری کی عظمت و برتری ،فصاحت و بلاغت ،سلاست اور روانی کا اعتراف کیا ہے:

لطف طبع تو صرفیا در شعر　　　　از ظہیری وانوری عجب است

اور دوسری جگہ اس طرح فرمارہے ہیں ؎

بہ فن شاعری صرفی طریق ساحری دارد　　　　مگر تحصیل علم سحر کرد از چشم جادویت

دوسری جگہ صرفی اپنی شیرین بیانی کے بارے میں یوں رقمطراز ہے ؎

شعر صرفی است بہ وصف لب شکر شکنت　　　　از کلام ھمہ شیرین سخنان ،شیرین تر

عبد القادر بدایونی صرفی کی توصیف میں اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں: '' **شیخ یعقوب کشمیری است کہ شمہای از اوصاف کمالش مقوم خامہ شکستہ گردید. چون جامع مراتب حیثیات است ......باوجود تصانیف معتبر در تصوف وسایر علوم وفنون طبعش بہ نظم اشعار بلاغت ،آثار مناسب وملایم افتادہ** ''

مشہور مورخ اور جلال الدّین اکبر کے منشی ،ابو لفضل نے اس اسطرح شیخ یعقوب صرفی کی قابلیت اور ذکاوت کو سراہا ہے: '' **صرفی کشمیری نام شیخ یعقوب از فن آگاہ و گوناگون دانش آشنا دلاویز گفتار ابن عربی نیکومی دانست** ''

صرفی نے شاعری کی مختلف اقسام میں لکھ کر فارسی زبان کو احساس کی روشنی، گہری فکر اور خاص بصیرت سے ایک نئ شکل دی ۔نظم و نثر کے علاوہ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔ دیوان صرفی میں غزلیں ،قصیدے، رباعیات ،نعتیں اور منقبات موجود ہیں۔ ان کے کلام کا موضوع زیادہ تر صوفیانہ اور عارفانہ ہے۔

شیخ یعقوب صرفی کا فارسی منثور کلام : شیخ یعقوب صرفی ایک باکمال صوفی اور عالم، منفرد شاعر، مفسر، محدّث، فقیہ اور نثر نگار تھے اور ظاہری و باطنی علوم سے بھی سرشار تھے۔ صرفی نے نثر بیش قیمت کام انجام دیے ہیں اور ان کی تحریریں مختلف موضوعات پر مبنی ہیں جن میں روائح ،حدیث الاربعین، کنز الجواہر، رسالہ ذکریہ، رباعیات صرفی مع شرح قابل ذکر ہیں ۔ اس کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی نے قرآن کریم کے دو پاروں کی تفسیر بھی کی ہے اور متعدد مکتوبات کے نسخے بھی چھوڑے ہیں۔

شیخ یعقوب صرفیؔ کی فارسی مثنوی نگاری: صرفیؔ وہ پہلا شخص ہے جس نے کشمیر میں فارسی مثنوی نگاری کا آغاز کیا اور خمسہ مثنویاں کہی۔ خمسہ صرفیؔ نظامی کے خمسہ کے مطابق لکھا گیا اور بہت دلچسپ اور عمیق مطالب کا حامل ہے۔ خمسہ صرفیؔ میں زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور صوفی افکار کی وضاحت کی گیی ہیں۔ جو مسلک الاخیار، وامق وعذرا، لیلی ومجنون، مغازی النبی اور مقامات مرشد کے نام سے معروف ہیں۔

شیخ یعقوب صرفیؔ کا دیوان: صرفیؔ کشمیر کے سب سے معروف فارسی بولنے والے شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے آٹھ سال کی عمر میں فارسی شاعری کی شروعات کی۔ ان کے والد ان کے اشعار کی تصحیح کرتے تھے۔ چونکہ وہ صوفی شاعر تھے اس لیے ان کی شاعری میں صوفیانہ رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے شاعری کی مختلف اقسام میں طبع آزمائی کی اور اپنے خاص احساس، فکر اور بصیرت سے فارسی شاعری کو تازگی اور طراوت بخشی۔ صرفیؔ ایک قادرالکلام اور جامع الکمالات شخصیت تھی جن میں فارسی شاعری کے تمام صلاحیتیں اور کمالات موجود تھے۔ جب ہم فارسی شاعری کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو اکثر شاعروں نے بادشاہوں، وزیروں اور حکمرانوں کی مدح سرائی کی ہے، لیکن ان کے برعکس صرفیؔ نے کبھی کسی خاندان یا شاہی دربار کی رہنمائی میں کوئی نظم نہیں لکھی۔ صرفیؔ کی نظمیں شاعر کے اندرونی خیالات کو ظاہر کرتی ہیں۔ کیونکہ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ سیر وسیاحت، دین کی تبلیغ اور ترویج، درس وتدریس میں صرف کیا۔

صرفیؔ کا دیوان: صرفیؔ کے اہم ترین کارناموں میں سے ایک ان کا دیوان ہے۔ اس دیوان میں غزلیات، قصیدے، رباعیات، قطعات اور منقبات شامل ہیں۔

غزلیات: شیخ یعقوب صرفیؔ نے بچپن سے ہی غزلیں لکھنا شروع کیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فن میں ایک خاص مقام حاصل کیا اور ان کا شمار غزل کے نامور شاعروں میں ہوا۔ دیوان صرفیؔ میں آٹھ سو سے غزلیں ہیں اور ہر غزل تقریباً بارہ اور تیرہ بیت پر مشتمل ہے۔ صرفیؔ نے پروردگار کی حمد وستائش کرتے ہوئے اسطرح دیوان کا آغاز کیا ہے ؎

ای از بیان حمد تو عاجز زبان ما　　تیغ ادب بریدہ زبان زبان ما
مانند عامی کہ نداند الف ز بے　　در وصف قدس تو خرد خوردہ دان ما

صرفیؔ کے کلام عشق ومحبت، حقانیت، توحید، فنا و بقا، سوز وگداز سے بھرا ہوا ہے۔ اپنی غزلوں میں دوسرے شعرا کی طرح صرفیؔ نے بھی درد وغم، حسن و جمال، جدائیو وصل اور عشق ومحبت کو منفرد انداز اور اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے اور غزل کو تشبیہات اور استعاروں سے زینت دی ہے،

جیسے کہ درج ذیل اشعار میں شاعر اپنے دل کا درد محسوس کرتا ہے اور نسیم صبح کے ساتھ درد دل کرتا ہے تا کہ وہ اس کے پیغام کو معشوق تک پہنچا یے اور اسے اپنے عاشق کے حال سے آ گاہ کرے ۔

بہ گل کن شرح حال بلبلان آھستہ آھستہ　　　اگر یابی بکویش رفتہ رفتہ قاصدا راہی

بشرح حال ما بکشا زبان آھستہ آھستہ　　　بروآہستہ آہستہ دران کوی وبگو با او

زحالم اندک اندک ھمچنان آھستہ آھستہ

صوفی منش شاعروں اور مشہور صوفیا نے اپنی صوفیانہ شاعری میں فطرت اور خدا کی تخلیق اور خلقت کا بہت زیادہ استعمال کیا ہے۔انہوں نے فطرت میں اللہ کے جلووں کو محسوس کیا اور ان نظاروں سے خدا کی معرفت اور شناخت کو سمجھا۔ اکثر انہوں نے حقیقی معشوق کی توصیف اور تمجید کے لیے اور محبوب کی خوبصورتی اور حسن کو بیان کرنے کے لیے فطرت اور قدرت سے کافی فائدہ لیا ہے۔شیخ یعقوب صرفی نے بھی ان آ رائشی عناصر کو ترک نہیں کیا۔ ان کے اشعار میں فطرت کا یہ حسن رواں دواں نظر آ تا ہے۔صرفی کی غزلوں میں اول سے لے کر آ خر تک سرو، گل، نرگس ،شمشاد، سنگ ،شمع، پروانہ، سنبل، لعل وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔کبھی قدرت کے بہت سے عناصر کو خدا کے حسن کو سمجھنے کے لیے استعمال کیا، کبھی پیر و مرشد کی توصیف بیان کرنے کے لیے، اور کبھی صوفیوں اور علما کی خوبیوں کو سمجھانے کے لئے ان الفاظ سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار میں دیکھتے ہیں ۔

شب ھجران کہ درفکر قداو بردم خوابم را　　　بخوابم درں ظرگہ سروو گہ شمشاد می آید

یا اسطرح بیان کرتے ہیں ۔

برمن از روی بتان نور خدا جلوہ گر است　　　للہ الحمد رسیدم بحقیقت زمجاز

شیخ یعقوب صرفی کے قصیدے: صرفی فارسی زبان کے قصیدہ گو شاعروں سے کم پایہ نہیں ہے۔انھوں نے سعدی ،فرخی ،عنصری ، انوری ، خاقانی ، قا آنی وغیرہ جیسے شاعروں کے کلام سے فیض حاصل کیا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اکثر قصیدہ گو شاعروں نے بادشاہوں، حکمرانوں، حکام اور ان جیسے لوگوں کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں، لیکن صرفی ـ نے سادہ قصیدے لکھے ہیں جن میں اللہ تعالی، خلفائے راشدین، چودہ معصومینؑ، بزرگان دین کی مدح سرایی اور نصیحتیں و وعظ شامل ہیں۔صرفی کے قصیدوں میں خلوص، قلبی اثرات ،تصوف اور توحید عیاں ہے۔ان کی زبان ہموار، سادہ اور شیریں ہے ذیل میں ان کے قصیدوں کا ایک نمونہ ہے ۔

بحمد حق چہ کشانم زبان دعوی را　　　کہ حمد بندہ چہ لایق بشان مولی را

زبان بدعوی حمدش چگونہ بکشانم کہ تیغ عجز بریدہ زبان دعوی را

صرفیؔ کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اہل بیت علیہم السلام کے عاشقوں اور محبوں میں تھے اور اپنے اکثر اشعار میں ان کی فضیلت اور برتری کا اظہار کیا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے واضح ہوتا ہے ۔

اصحاب جو درا چو دفتر نوشتہ اند سر دفتر ابن عمِ پیامبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نوشتہ اند

زآن بیشتر کہ لوح وقلم آفریدہ اند مارا بدل محبت حیدر نوشتہ اند

شیخ یعقوب صرفیؔ کی رباعیات:

صرفیؔ نے دوسرے کشمیری شاعروں کے مقابلے زیادہ رباعیات لکھی ہیں، اور ان کی رباعیات، ان کی غزلیات کی طرح عاشقانہ، صوفیانہ اور فلسفیانہ موضوعات پر مبنی ہیں۔ جن میں اکثر رباعیات خدا کی توحید اور وحدانیت کے بارے میں ہیں اور لوگوں کو حق اور حقیقت کی دعوت دیتی ہے۔ جس طرح شاعر اس رباعی میں اشارہ کرتے ہیں ۔

درکعبہ وسومنات معبود توئی ھر جا کہ سری نھند مسجود توئی

غیر توکسی حمد تو نتواند گفت یعنی جھان حامد ومحمود توئی

دوسری رباعی ۔

گہ مھر وگھی مہ تمامت گویم گہ سرو قد کبک خرامت گویم

ھر جلوہ تو نام دیگری طلبد درحیرتم کہ آیا بہ چہ نامت گویم

صرفیؔ کے دیوان میں غزلوں، قصیدوں اور رباعیوں کے علاوہ کچھ متفرقات ہیں جیسے نعتیں اور منقبات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل بیتؑ، خلفائے راشدین اور دیگر اولیا کرام کی تعریف میں ہیں۔ ان میں زیادہ تر صرفیؔ نے عربی الفاظ کا بہت استعمال کیا ہے جیسا کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں درج ذیل الفاظ استعمال کیے ہیں ۔

یا ایھا العباد علیٰ سید الانام صلوا وسلموا وعلی الہ الکرام

ختم نبوتش بہ او بلکہ آمدہ ھم افتتاح آن بوجودش ھم اختتام

موسی سوال کرد ارنی لن ترا شنید اورا بکام دولت دیدار بردوام

چوں کرد صرف راہ تو نقد حیات خویش یعقوب را بہ عشق تو صرفی شدہ است نام

شیخ یعقوب صرفیؔ کا شمار کشمیر کے ان شاعروں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جن کا کوئی ہمسر

نہیں۔شیخ یعقوب صرفی کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ ہیں جو انسان کو اللہ تعالی کے قریب کرتی ہیں۔صرفی کا کلام کافی وسیع ہیں جس کا ذکر کچھ صفحات پر ممکن نہیں ۔

مآخذ

۱:ایران صغیر،عبدالحمید عرفانی، کتابفروشی ابن سینا،تھران،۱۳۳۵ش

۲:پارسی سرایان کشمیر،گ ل تیکو،انتشارات انجمن ایران وھندتھران،۱۹۲۲ع

۳:تاریخ حسن، پیر غلام حسن کھویہامی،جلد، ریسرچ اینڈ پبلی کیشن،کشمیر ۱۹۹۷م

۴: تذکر شعراء کشمیر، پیر حسام الدین راشدی،زین آرٹ پریس ریلویروڈ لاہور۔اقبال اکیڈیمی پاکستان،۱۳۴۶ش

۵:دیوانِ صرفی،میر حبیب للہ کاملی، بروکاز پریس سرینگر،۱۳۸۷ھ

۶:شیخ یعقوب صرفی،جی آر جان، بک میڈیا،سرینگر کشمیر ،۱۹۹۵ع

۷:فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹر محمد ریاض وصدیق شبلی، نیوبسم کتاب گھر،۲۰۱۶ع

۸:کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ،عبدالقادر سروری،مجلس تحقیقات اردو کشمیر سرینگر ۱۹۶۸ع

۹:کشمیر کے فارسی ادب کی تاریخ،م۔م۔مسعودی، بک میڈیا انڈین پرنٹنگ پریس ڈلگیٹ سرینگر ۳ ۱۹۹ع

۱۰:کشمیر کے فارسی شعرا،محمد صدیق نیازمند،اویس وقاص پبلشنگ ہاوس ۱۳۳۴ھ

۱۱:واقعات کشمیر،محمد اعظم دیدمری، جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر،سرینگر ۱۹۹۸م

Amin Kamil ke Afsano mein Kirdaron ki Tehdari by Dr.Mudassir Rashid Rather(NRLC,Punjabi University,Patiala)cell-9796715300

ڈاکٹر مدثر رشید راتھر (این-آر-ایل-سی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ)

امین کامل کے افسانوں میں کرداروں کی تہداری

مرحوم امین کامل اگرچہ کشمیری شاعری کے امین تھے، مگر کشمیر میں صنف افسانہ کے ارتقائی سفر میں انہوں نے چند اہم افسانے لکھ کر اس صنف میں بھی اپنا اہم رول ادا کیا۔ امین کامل کے افسانوں میں کشمیری دیہاتی زندگی کے حقیقی رنگ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ کامل کے ابتدائی افسانوں میں کہیں کہیں نعرہ بازی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن ترقی پسند تحریک کے اثرات مدھم ہوتے ہی انہوں نے کشمیری میں عمدہ افسانے تحریر کیے۔ کامل کے ابتدائی اہم افسانوں میں ''یا دوستو'' اور ''گوگو'' جیسے افسانے شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۴ سے لے کر ۱۹۶۱ تک جو افسانے امین کامل نے لکھے ہیں وہ ان کے افسانوی مجموعے ''کتھِ منز کتھ'' میں شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ''کوکر جنگ'' آب سرکنہ بل، نو یاؤن، جہنمی، آینہ' وغیرہ بہت ہی مشہور ہوئے۔ وہ خود اپنے افسانون کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''میرے یہ افسانے مجھ سے ہی جنم لیتے ہیں، اور میں جس پیچیدہ سیاسی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہوں اس کا اثر ان افسانوں کے پلاٹ اور کرداروں میں بھی نمایاں ہے اور یہی بات ان کو باقی افسانہ نگاروں سے الگ کرتی ہے۔''

امین کامل کے افسانوں میں انسانی مشکل ترین حالات کی عکاسی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے جن موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے وہ زندگی کی بے ثباتی، تضاد، بے سکونی، ظلم و جبر اور انسان پر جبراً ٹھونسے ہوئے اصولوں کی مجبوری پر مبنی ہیں۔ جس کے لئے وہ کہیں سادہ زبان تو کہیں رمز و کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ امین کامل نے بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے افسانوں میں اپنے دور کے واردات و حادثات، خودغرضی اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں عام انسان پر روزمرہ رونما ہونے والے واقعات اور ان کا تدارُک، کشمیری ثقافت اور انسانی نفسیات کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ انسانی نفسیات کو اپنا خاص

موضوع بنا کر قاری کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی حقیقت کس بھنور میں الجھ چکی ہے۔ وہ اس کے لئے اپنے افسانوں میں کہیں کہیں دلیلی عنصر اور ماضی کے واقعات کا سہارا لے کر عصری دور کی اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے ایک انسان جوج رہا ہے۔ وہ پیچیدہ عصری حالات کو دکھانے کے لیے اپنے افسانون میں عمل پیرا دلیلی عنصر کو ایک اوزار کے طور پر استعمال کرتے پیں۔ تاکہ وہ اپنے دور کے افسانوں کا دکھ درد لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔ افسانہ ''پھاٹک'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

امین کامل کے افسانوں کا سنجیدہ مطالعہ کرنے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کے کردار ہر لحاظ سے کشمیری میراث اور تمدن کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کی عمل کو خود ہی آگے بڑھاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے تقریباً سارے کردار حقیقی نظر آتے ہیں۔ امین کامل ان کردارون کو افسانوں میں اسی طرح پیش کرتا ہے جس طرح یہ روزمرہ زندگی میں نظر آتے ہیں۔ ان افسانوں میں خاص طور پر ''پوت کل، آئینہ، آبسر کنہٕ بل، کوکر جنگ، تلاش وغیرہ افسانے قابل ذکر ہیں۔

پوت کل افسانے کی کردار ''راجہ'' کا وجود تذبذب کا شکار ہے جو اپنے لیے کوئی مخصوص فیصلہ نہیں کر پاتی۔ وہ رات کے وقت سسرال سے بھاگ کر میکے چلی جاتی ہے۔ مگر اسے یہ بھی خیال آتا ہے کہ آخر وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ لیکن بعد میں خود ہی یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ اس کی وجہ اس کی میکے سے بے انتہا محبت ہے۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو تسلی دے کر کہتی ہے کہ اس کے سسرال اور میکے والوں کے درمیان نوسال کے فساد کی جڑ وہ ہر گز نہیں ہے۔ مگر میکے پہنچ کر اس کے ذہن میں آیا ایک اور خیال اسکو جھنجوڑ لیتا ہے اور وہ اپنے سسرال کی طرف دوبارہ رُخ کر لیتی ہے۔ اس کردار کی ذہنی کیفیت اور حقیقت کے درمیان لگاتار تصادم پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ تصادم مرحلہ وار ارتقائی سفر پانے میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے۔

" آب سرکنہ پل" افسانے کا مرکزی کردار عشق کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔ افسانے کا مرکز ''حاجرہ'' کے عشق کا وہ حصہ ہے جب وہ اپنے خاوند کے مرنے کے بعد بے حس اور مایوس ہو چکی ہوتی ہے۔ وہ دن بھر بے مطلب اور بے مقصد پتھروں پر بیٹھ کر مغل شاہراہ کو تکتی رہتی ہے۔ اس کے خاوند کے مرنے کے بعد اسے کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں رہتی۔

''حاجرہ اب بھی ڈالان پر اکیلی اور سرد مہری کی دیوی بن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے کسی بھی چیز کا احساس

نہیں تھا، اور نہ ہی اس سنہری شام میں کوئی دلچسپی تھی۔ اور نہ اس احساس کا کہ وہ ایک عورت ہے۔''

امین کامل کے افسانوں کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ان کے افسانوں میں انسان کی داخلی شناخت کی حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ کردار کے داخلی پہلو کو اپنے ہم اثر افسانہ نگاروں کی طرح پیش کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان افسانوں میں پوشیدہ انسانی احساس، خواہش اور نفسیاتی بے قراری کو بھی زبان دینے کا علم رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے ہنر سے کرداروں کو افسانے میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری اپنے سارے حواس کو بروے کار لا کر افسانے میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اور اسے لگتا ہے جیسے وہ بھی اسی عمل کا حصہ ہے۔ ایسے افسانوں میں ''دندوزُن، کوکر جنگ، ہردواؤ'' قابل ذکر ہیں۔

''ہردواؤ'' افسانے میں عظم بب اپنے آپ میں ایک دنیا بسا کر زندگی جی رہا ہے۔ وہ ماضی کی اقدار کی پاسداری کر سمیت گھر گھر گھومتا پھرتا رہتا ہے، اور اپنے اسلاف کی کہانیاں لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ مگر لوگ اس کو باتونی کہہ کر اسے ''عظم بکواسی'' نام دیتے ہیں۔ یعنی بکواس کرنے والا بوڑھا۔ عظم بب کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ لوگ اس کی بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور بدلے میں وہ اس کی بے عزتی کرتے ہیں تو وہ افسردہ ہو کر اس علاقے سے کہیں دور بھاجاتا ہے۔

''کوکر جنگ'' افسانے میں امین کامل نے سماجی زندگی کی حقیقت کو واقعات اور کرداروں کے ذریعے اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ اگرچہ اس افسانے میں دو مرغوں کی لڑائی کا منظر دکھایا گیا ہے، مگر حقیقت میں یہ افسانہ نفسیات کا آئینہ ہے۔ افسانے میں ''شاہ مال'' اور ''جانہ'' ان مرغوں کے جنگ میں جیسے خود بھی لڑ رہی ہوں۔ افسانے کا یہ طرزِ عمل حقیقی انسانی فطرت کو آفاقی رنگ بخش کر قاری کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ بقلِ مجروح رشید:

''جب ہم غور سے افسانے کو جانچتے ہیں پھر نہ افسانے میں مرغا مرغا رہتا ہے اور نہ ہمسایہ ہمسایہ۔ بلکہ یہ آفاقی سطح پر انسانی فطرت کو پیش کرتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہ پاتے ہیں کہ ایک کے عمل کے بعد دوسرے کا ردعمل کیا ہوگا۔ کیوں کہ انسانی نفسیات کسی حد تک ایک جیسی ہے۔۔۔ یہ افسانہ انسانی نفسیات کے وہی پوشیدہ پہلو درشاتا ہے۔''

انسانی نفسیات کی یہی کشمکش اس افسانے کی خوبی ہے اور اس کشمکش کے مسائل کا حل شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈھونڈنا اس افسانے کا خاص پہلو ہے۔ بقلِ رتن لال شانت:

''کوکر جنگ افسانے کا خارجی structura ریوایتی کہانی کے جیسا ہے۔ مگر داخلی طور نہ تو یہ ہموار

اور نہ یک رنگ (Monotonus) ہے۔ نہ صرف شاہ مال کی نفسیاتی تہہ داری بلکہ جانہ کی عیاں صورت (obviousness) بھی اس کو عام وخاص قاریوں اور ناقدوں کے لئے بھی قابلِ قبول بناتا ہے۔'' (کاشُر افسانہ؛منزل تہ مُنار)

امین کامل جو زبان اپنے کردارون کو بخشتا ہے وہ قاری کو سوچنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ ان کے کرداروں کا ایک ایک مقالہ معنی بخش اور افسانے میں تجسس برقرار رکھنے کے لئے معاون ثابت ہوتا ہے۔ان کے افسانوں کی زبان قاری کو کردار کی ذہنی کیفیت، احساسات اور جذبات تک پہنچنے کے لئے ترسیلی اہمیت کی حامل ہے اور قاری کردار کے دل کی دھڑکن تک محسوس کرتا ہے۔

ایک ادیب کو اپنا ایک مخصوص الفاظ کا ذخیرہ اور ان کے استعمال میں لانے کا ایک الگ طریقہ کار ہوتا ہے۔ امین کامل کا بھی اپنا ایک الگ ذخیرۂ الفاظ تھا۔جس کا استعمال وہ اپنے طریقے سے اپنے افسانوں میں کرتے تھے۔جس کی وجہ سے وہ مختلف افسانوں میں مختلف رنگ پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے تھے۔ان کو اس بات کا بھی بھر پور علم تھا کہ کون سا افسانہ کس قالب میں ڈالنا ہے۔لہٰذا ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ امین کامل کو جتنا عبور شاعری پر تھا اتنی ہی دسترس افسانہ نگاری پر بھی تھی۔

☆☆☆

Akhter Mohi-ud-din: Bahaisiyat Kashmiri Afsana nigar by Sabzar Ahmad Naikoo(NRLC,Punjabi University,Patiala)cell-6005130283
سبزار احمد نائیکو(این-آر-ایل-سی، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ)

اختر محی الدین: بحثیت کشمیری افسانہ نگار

کشمیری افسانے کی تواریخ 73 سال پرانا ہے۔ جب 1955 عیسوی میں کشمیری زبان کے دو افسانے "جوابی کارڈ" اور "ییلہ پھول گاش" دینا ناتھ نادم اور سوم ناتھ زتشی نے بالترتیب لکھے۔ جو کونگ پوش رسالے میں شائع ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ترقی پسند تحریک نے پورے عالم کے ادب کو خود سے متعارف کرایا تھا اور اب کشمیری زبان کے ادیب بھی اس نظریہ سے متعارف ہو رہے تھے۔ چونکہِ بہت سارے کشمیری قلمکار اب تک اردو زبان میں قلم آزمائی کر رہے تھے۔ جنھوں نے اب اردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کشمیری میں لکھنا شروع کیا۔جن میں پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ نادمؔ اور دوسرے مشہور قلمکار قابلِ ذکر ہیں۔ دینا ناتھ نادمؔ نے قلیل وقت میں کشمیری زبان میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔دوسرے افسانہ نگار جنھوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی جن میں تاج بیگم رینزوؔ(پہلی کشمیری خاتون افسانہ نگار)، علی محمد لون، سوم ناتھ زتشی، بنسی نردوش، اوتار کشن رہبر، دیپک کول، ڈاکٹر شنکر رینہ، ترلوکی ناتھ کُندن، امیش کول، امین کامل، عباس تابش، غلام نبی بابا وغیرہ قابلِ قدر افسانہ نگار ہیں۔عزیز ہارون، نور محمد روشن اور حبیب کامران نے کچھ چینی، روسی اور بلغیرین کہانیوں کو کشمیری زبان میں ترجمہ کیا۔بقولِ دینا ناتھ نادِم:

"کشمیری زبان کے نامور افسانہ نگاروں میں اختر محی الدین کا قد اُس کے ہم عصروں میں سب سے اونچا تھا" (انہار نمبر، کاشرس منز تنقید، کشمیری ڈپارٹمنٹ، کشمیر یونیورسٹی)

اختر محی الدین کا جنم شہرِ سرینگر کے علاقہ بٹہ مالو میں 1928 عیسوی میں ہوا۔انھوں نے بیسوی صدی کے پہلے نصف میں اردو میں بحثیت ایک افسانہ نگار طبع آزمائی کی اور قلیل وقت میں ہی انھوں نے اردو دنیا میں ایک بڑا مقام اور شہرت حاصل کیا۔اُن کی 73 سال کی حیاتی میں انھونے جو کچھ کشمیری ادب کو بخشا وہ ایک قابلِ داد عمل ہے۔اُن کے کشمیری میں 50 افسانے شائع ہوئے۔ جن میں "دندوژ ن"، "دریاے ہند یزار"، "آپن ہور جنگ"، "آدم چھُ عجب ذات" عالمی سطح کی

شہرت اور داد کے قابل ہیں۔دندوزٕن افسانہ پڑھ کے ہی مشہور افسانہ نگار رتن لال شانت صاحب افسانوی فن سے متاثر ہوئے اور محض سولہ سال کی عمر میں اس فن کو گلے لگایا۔اس بات کا اظہار وہ ایک ملاقات میں میرے ساتھ کرتے ہیں۔یہ بات میں نے اپنے ایم فل کے مضمون میں بھی درج کی ہے:

"جوں ہی میں نے اختر محی الدین کا افسانہ" دندوزٕن" پڑھا، میں نے اپنے آپ کے ساتھ عہد کیا کہ مجھے افسانے لکھنے ہیں"۔(رتن لال سانت سند افسانہ فن تہٕ ٹکنیک : اکھ مطالعہ)

اختر محی الدین باقی قلمکاروں کی طرح ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے اور پھر کشمیری افسانہ میں نت نئے تجربے کرنے شروع کئے۔انھو نے اس فن میں وہ روایات قائم کی جس کی وجہ سے کشمیری افسانہ نے ایک الگ موڑ اختیار کیا۔ اُن کے افسانوں نے پہلی بار افسانے میں حقیقت پسندی کا معیار قائم کیا۔اختر نے اِنسان کی داخلیت اور خارجیت دونوں کا ملاپ کر کے کردار ایجاد کئے۔جو لاجواب اور لامثال ہیں۔گلشن مجید اُن کے افسانوں کی خاصیت اور خوبی کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اختر کے افسانوں میں اُس حقیقت کی تلاش ہے جو اُس کے داخلیت سے پیدا ہو کے خارجی حالات میں زم ہو جاتے ہیں۔یہ کردار مصنف کی خواہش کے نمائندے ہیں۔کردار کا عمل اور کردار کا برتاو یہ سب ناپ تول کے ہیں"۔(انہار نمبر، کاشرس منز تنقید، کشمیری ڈپارٹمنٹ، کشمیر یونیورسٹی)

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اختر کے افسانوں نے کم وقت میں کشمیری افسانے کے ابتدایی مُنازل طے کئے۔ اسطرح یہ دوسرے افسانہ نگاروں کے لیے باعثِ مدد ثابت ہوئے۔تخلیقی سطح پر وہ عالمی سطح کے افسانوں سے استعفادہ ہوتے رہے اور اپنے افسانوں کو عالمی معیار بخشنے کی عمل میں کشمکش کرتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ اُس کے اکثر افسانوں کا ترجمہ دُنیا کی بہت ساری زبانوں میں ہوا۔اختر محی الدین کشمیری افسانے کو بڑی محنت اور مشقت سے سینچنے لگے۔وہ نہ ڈراما نگار تھے اور نہ ہی شاعر۔انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت کا بیشتر وقت افسانے کی ترقی کے لئے نچھاور کیا۔مشعل سلطان پوری اختر محی الدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’اختر صاحب وہ شخص ہے جنھوں نے اس صنف کو پوری طرح سے اپنایا۔اور وقتاً فوقتاً اس چیز کا احساس دلایا کہ، "مجھ میں ہمت ہے اور میں نہیں تھک سکتا"۔

(کاشرِ نثرک تعمیر کار، مشعل سلطان پوری)

اختر محی الدین دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح اشترا کی اور ترقی پسند فلسفوں سے لگاتار وابسطہ نہیں رہے بلکہ وہ عام انسان کی زندگی کے بہت قریب ہو گئے۔ وہ انسان اور اُسکی کمزوریوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی کوششوں میں محور رہے ہے۔اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس کا فن انسان شناسی کی عمل کی طرف گامزن ہوا۔اختر کے افسانوں سے اس صنف میں یہ شعور پیدا ہوا کہ ادب میں مقصدیت اور نظریاتی وابستگی ہونے کے باوجود نعرے بازی اور کھوکھلے جذباتوں کی کوئی گنجایش نہیں ہے اور فن کی تعریف یہی ہے کہ فنکار کو اپنے آس پاس میں ایسا کوئی عمل نہیں ڈھونڈنا چاہیے جس کو وہ اپنی آگاہی اور نظریات سے ایک نئی پہچان بخش سکے۔

1956 عیسوی میں اختر محی الدین کی" ستھ سنگر" سات پہاڑ نام کا ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔یہ سات افسانے اختر محی الدین کی بنیادی تخلیق ہیں اور ایک افسانہ موپاساں کے A Peice of sting افسانہ کا ترجمہ "سوتلہِ داو" ہے۔سات سنگر کشمیری میں وہ پہلا افسانوی مجموعہ تھا جس کو ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ حاصل ہوا۔ اس کے بعد اختر محی الدین کی دوسری کتاب " سونزل"1959 عیسوی میں چھاپ ہوئی۔یہ افسانوی مجموعہ بھی سات افسانوں پہ مشتمل ہے۔ان دونوں افسانوی مجموعوں میں درج افسانوں میں حقیقت پسندی کا رنگ چھلکتا ہے۔جس کی وجہ سے یہ کشمیری ماحول اور تہذیب کی عکاسی کرنے میں صفل رہے ہیں۔اختر نے اپنے افسانوی کردار کو آزادی دے کر اپنی فطری عمل اور ردِعمل سے اُن کو زندگی بخشی ہے۔بقولِ شفیع شوق اور ناجی منور:

" انھوں نے افسانے کو ایک الگ اور خود مختار دُنیا بخشی ہے۔جس میں کردار افسانہ نگار سے آزادی پا کے اپنے حرکتوں یا اپنے عمل سے وجود میں آتا ہے"۔

(کاشرِ ادبک تواریخ، شفیع شوق اور ناجی منور، کاشُر ڈپارٹمنٹ، کشمیر یونیورسٹی)

" دریایہ ہُند یزار"، "مے توگ نہ کینہہ "، "دندوزٗن"، " آدم چھُ عجب ذات" جیسے افسانوں کے کردار اس کی خوبصورت مثالیں ہیں۔

ترجمہ:" برسیت نے حقے کا ایک لمبا کش لیا۔" اب پانچ رہے۔تین اسی نے کچھ دیر پہلے کھورش کو دئے۔ وہ اِس نے اُسے قرضہ لیے تھے"۔" ہاں ہاں! کھورش وہی بیٹھی تھی۔ اُس نے اِس بات کی گواہی دی"۔" سچ ہے، میں کیوں جھوٹ بولوں۔آخر مرنا تو ہے۔کچھ دیر پہلے تین روپے لے کے آئی"۔(دندوزن)

☆☆☆

Ghazlein غزلیں

Yaqoob Tasawwur(California)
U.S.A. cell-001-636-293-0421
یعقوب تصور (کیلیفورنیا، امریکہ)

بے کراں ہونا جدا ،مہرباں ہونا ہے جدا
آسماں ہونا جدا ،سائباں ہونا ہے جدا
میر ہونا ہے کسی قافلہء زیست کا اور!
اپنی ہی ذات میں اک کارواں ہونا ہے جدا
سینکڑوں لفظ بناتے ہیں کہانی کا فسوں
اور اک حرف کا اک داستاں ہونا ہے جدا
وسعت عرش میں پرواز کی لذت ہے دگر
شاخ گلزار پہ اک آشیاں ہونا ہے جدا
زیادہ تعداد سے حدت تو فزوں ہوتی نہیں
مہر ہونا ہے الگ، کہکشاں ہونا ہے جدا
چند لمحات تعلق کا تصوؔر دیگر
زندگی بھر کے لئے پاسباں ہونا ہے جدا

☆☆☆

در کشادہ ہی رہا صبح کی پو تک شب بھر
کوئی دیوار پہ دیتا رہا دستک شب بھر
یہ ہواؤں حفاظت کا صلہ ہے کہ چراغ
چہرہء طاق پہ ملتا رہا کالک شب بھر
اس نے تو صبح دم آنے کا کیا تھا وعدہ
دل بہت تیزی سے کرتا رہا دھک دھک شب بھر
وصل کی وعدہ خلافی میں ہر اک شب کی طرح
پیار کے قصر میں لگتی رہی دیمک شب بھر
اس کا خط لے کے کوئی صبح سمئے آئے گا
انتظار آسا رہی ہاتھ میں عینک شب بھر
سخت سردی تھی کھلی چھت پہ رہے وعدہء وصل
میں فقط اوڑھے رہا پیار کی اجرک شب بھر
روٹھ کر اس کو گئے عمر تصوؔر گزری
ہے وہ دروازے پہ موجود رہے شک شب بھر

☆☆☆

کیا تعلق ہے، یہ ہونے لگا شک دھوپ کے ساتھ
آسماں پر دھنک آئی ہے نظر دھوپ کے ساتھ
تیرگی ہوتے ہی روپوش نگاہوں سے ہوا !
رقص سائے نے کیا شام تلک دھوپ کے ساتھ
طے مسافت تو ہوئی عمر کی حسرت یہ رہی
کاش ہوتی کہیں سائے کی سڑک دھوپ کے ساتھ
ہے اسے دعویٰ کہ ہے جسم منور اس کا
تیز کم ہوتی رہے جس کی چمک دھوپ کے ساتھ
حدت شمس سے جلتی ہیں تصوؔر آنکھیں
کیسے ممکن ہے کہ جھپکے نہ پلک دھوپ کے ساتھ

☆☆☆

Irfan Arif(Jammu)cell-9682698032

عرفان عارفؔ (جموں)

چمن اجڑا سا کیوں ویران سا کیوں ہے
خموشی میں نہاں طوفان سا کیوں ہے
بظاہر تو نہیں ہے آرزو کوئی
مگر دل میں کوئی ارمان سا کیوں ہے
نہ جانے مجھ سے کیسی ہے اسے نسبت
وہ مدت سے مرا مہمان سا کیوں ہے
نوازا ہر ستم سے آپ نے مجھ کو
یہ مجھ پر آپ کا احسان سا کیوں ہے
ہزاروں بار پہلے بھی ملے ہیں ہم
مگر وہ آج کچھ حیران سا کیوں ہے
ہوا ہے جو نہ سوچا تھا نہ چاہا تھا
یہی تقدیر کا فرمان سا کیوں ہے
وہ اک اک بات سے واقف ہے گو عارفؔ
مگر ظاہر میں پھر انجان سا کیوں ہے

☆☆☆

کوئی نہ آئے گا تو انتظار مت کرنا
کہا تھا دل نے یہ مجھ سے کہ پیار مت کرنا
تو مسکرا کہ یہی دن ہیں مسکرانے کے
غم حیات سے دل سوگوار مت کرنا
مسرتوں کو بھی حاصل نہیں ثبات یہاں
مسرتوں سے یہ دل ہم کنار مت کرنا
ہے فہم کس کو جو دل کا معاملہ سمجھے
کسی کی یاد میں دل بے قرار مت کرنا
وہ جس کو ہو نہ شعور وفا ذرا سا بھی
وفا شعاروں میں اس کا شمار مت کرنا
سکون زندگی جس کی نظر میں کچھ بھی نہیں
سکون زیست تو اس پر نثار مت کرنا
پرکھ کسی کو نہ ہو پیار کی جہان ائے دوست!
وفا جتا کے یہاں خود کو خوار مت کرنا
ہے اپنے رستے پہ ہر شخص گامزن عارفؔ
یہاں کسی کا بھی تو انتظار مت کرنا

☆☆☆

ہر طرف نالہ و بکا کیا ہے
کیا ہوا ہے بھلا ہوا کیا ہے
کون منصف ہے طے جو کرتا ہے
کیا ہے اچھا یہاں برا کیا ہے
درمیاں رہ کے تم نہ سمجھوگے
ابتدا کیا ہے انتہا کیا ہے
جیتے رہتے ہیں مرتے رہتے ہیں
عشق والوں کی یہ ادا کیا ہے
مٹ ہی جائے گا ایک دن سب کچھ
آنکھ میں پھر غرور سا کیا ہے
دشمنوں میں گھرے یہ سوچتے ہیں
دوستی نام کی بلا کیا ہے
ان کو عرفانؔ سے شکایت ہے
یہ بتاتے نہیں خطا کیا ہے☆☆☆

Naseem begum Naseem(New Delhi)
نسیم بیگم نسیم (نئی دہلی) cell-7678379891

رکھ چاک پر جہاں کے ذرا آزما کے دیکھ
مٹی سے میری اب کے نیا دل بنا کے دیکھ
کیسا ہے دور کیسے ہیں ناسور عشق میں
مرہم کا آج زخموں سے پردہ ہٹا کے دیکھ
صدیوں کا فاصلہ ہے وفا اور جفا کے بیچ
خود آ کبھی یہاں کبھی مجھ کو بلا کے دیکھ
شہر کمال میں نہ مسیحا نہ بخیہ گر
پتھر کو پوجتے یہاں بندے خدا کے دیکھ
پہنچے گی آسمانوں سے آگے تری صدا
سجدے میں عشق کے ذرا آنسو بہا کے دیکھ
رستے بدل بدل کے ہوئے دور گھر سے ہم
کاسہء زیست میں ہنر اپنی جفا کے دیکھ
شوق جنون عشق میں گر تیز گام ہے
پھر ابتدائے عشق میں رنگ انتہا کے دیکھ
تجھ کو یقین ہوگا مرے عشق کا نسیمؔ
پھر آ کہ اپنی یاد کا لمحہ اٹھا کے دیکھ

☆☆☆

یوں دشت میں لگایا ہے دربار آگہی
دیکھو جنوں بھی ہو گیا سرشار آگہی
ماتم ہے آبلوں کا نہ خاروں سے کچھ گلہ
کتنی ہے سست دشت میں رفتار آگہی
بیمار عشق ہوں میں جنوں ہے مرا شعار
لیکن مرا مسیحا ہے بیمار آگہی
خونریز راستوں پہ ہے نفرت بچھی ہوئی
ہستی کو ہو گیا ہے جو دیدار آگہی
ساری قبا جنون ہے لیکن بنام عقل
بیٹھا ہے آستین میں اک مار آگہی
بخشا جنونِ عشق نے وحدت کا راستہ
کاٹے ہے راستہ کوئی تلوار آگہی
کس طور بھول جائیں خودی کو ترے لئے
اۓ عشق سن ! کہ ہم ہیں گنہگار آگہی
دنیا سمٹ کے آ گئی دامن میں اب نسیمؔ
پہنچا ہے آسمان پہ مینار آگہی

☆☆☆

راہزن کا ہم سفر کا تذکرہ
کتنا قاتل ہے سفر کا تذکرہ
دشت میں مسرور دیوانوں کے بیچ
بیچ ہے دیوار و در کا تذکرہ
اک طرف ہے حال شہر مفلسی
اک طرف ہے سیم و زر کا تذکرہ
عشق میں گزری نہ باقی ہی رہی
ہے حیات مختصر کا تذکرہ
آج میرے حوصلوں کو پر لگے
آج ہے بے کار ڈر کا تذکرہ
آ گیا ہے سر پہ سورج اب نسیمؔ
ہو رہا ہے اک شجر کا تذکرہ☆☆☆

Khurshid Bismil(Thanna Mandi,Rajouri)
خورشید بسملؔ (راجوری) cell-9622045323

ہے المیہ انسان میں شیطان کی خصلت
انسان کو درکار ہے انسان کی خصلت
اب چین سے جینے کا تصور بھی نہیں ہے
باقی نہیں انسان میں احسان کی خصلت
جس سے بھی ملو،آگ بگولہ کی طرح ہے
ملتا ہے کوئی شاذ ہی گلدان کی صورت
تاریکیوں نے ملک کو تاراج کیا ہے
ماؤف ہوئی ہے مرے اعیان کی خصلت
اب ہند بھی اور پاک بھی لیں ہوش کے ناخن
اللہ! عطا کر انہیں جاپان کی خصلت
آزادیء افکار کا اعلان ہے یہ عام
رکھے نہ کوئی شہر میں خاقان کی خصلت
کچھ جبہ و دستار میں اسلام نہیں ہے
مومن ہے وہی جس کی ہو قرآن کی خصلت
ہو مدحِ نبی ﷺ اب مرے اشعار کی زینت
اے مولیٰ مرے دے مجھے حسان کی خصلت
میں بندہ رہوں بندگی معراج ہو میری
مجھ میں کبھی جاگے نہیں یزدان کی خصلت
یہ دونوں جہاں دست تصرف میں ہوں بسملؔ
جو ہاتھ لگے صاحب ایمان کی خصلت

☆☆☆

سب پتہ چل گیا حقیقت کا
نشہ اترا ہے سارا طاقت کا
قوم جو ہے نفاق کی ماری
کس طرح سوچتی ہے نصرت کا
فرقہ بندی عزیز ہو جن کو
نام مٹتا ہے ایسی ملت کا
میرے کشمیر پہ ہے کیا گزری
سن نہ پاؤگے درد جنت کا
ابتری اس قدر نہ ہونی تھی
سارا چکر ہے یاں صدارت کا
میرے دل کی نہ بات پوچھو تم
یہ تو صحرا ہے ایک وحشت کا
روز محشر کا غم نہیں بسملؔ
اک بھروسہ ہے تیری رحمت کا

☆☆☆

ڈوبنا ہوگا کبھی ہم کو ابھرنا ہوگا
زندہ رہنا ہے تو ہر گام پہ مرنا ہوگا
پھول سے لہجے کے اب لوگ کہاں ملتے ہیں
اب تو اس شہر میں دل سنگ ہی کرنا ہوگا
کوچے کوچے میں کماندار یہاں بیٹھے ہیں
ہو کے محتاط قدم شہر میں دھرنا ہوگا
فوج در فوج ابابیل نہ اب آئیں گے
خادم کعبہ تجھے رن میں اترنا ہوگا

شوق جنت تو نہیں ہے کوئی سستا سودا
پہلے اک آگ کے دریا سے گزرنا ہوگا
دائمی سر پہ چمکتا نہیں رہتا سورج
اس کو جانا ہے افق پار اترنا ہوگا
ہم مسافر ہیں ہمیں تھوڑا سا رکنا ہے یہاں
ہے جہاں اور جہاں صدیوں ٹھہرنا ہوگا
اپنا انداز طرب اب تو بدل دو بسملؔ
ورنہ حالات کے صحرا میں بکھرنا ہوگا

☆☆☆

مکاں سے گزریں گے یا لامکاں سے گزریں گے
نئے نصاب نئے امتحاں سے گزریں گے
شکار جن کو ترا حسن بے نظیر کرے
متاع زیست کے سودوزیاں سے گزریں گے
تری تلاش میں جو محو صبح و شام رہیں
کبھی زمین، کبھی آسماں سے گزریں گے
خدائے پاک سبھی ظلمتیں مٹا دے گا
"ہم ایک روز کسی کہکشاں سے گزریں گے"
وہ جن کو شوقِ جناں بے قرار رکھتا ہے
یہ طے شدہ ہے کہ آتش فشاں سے گزریں گے
ہٹاؤ خار مغیلاں تم اپنے رستوں سے
تمہارے بعد بھی کچھ لوگ یاں سے گزریں گے
نصیب ہم کو ہے بسملؔ کچھ ایسی ویرانی
عذاب جان ہی ہوگا جہاں سے گزریں گے

☆☆☆

Suraiya Jabeen(Patna)

ثریا جبین (پٹنہ) cell-8789534880

بے وفائی میں کر نہیں سکتی
دنیا والوں سے ڈر نہیں سکتی
ایک دن تو قضاء آئے گی
موت سے پہلے مر نہیں سکتی
کس کی ہمت ہے مجھ کو روکے گا
میں ہوا ہوں، ٹھہر نہیں سکتی
غم سے رشتہ مرا پرانا ہے
اشک آنکھوں میں بھر نہیں سکتی
پھول ہوں مجھ کو یوں نہ مسلو تم
مٹ گئی تو سنور نہیں سکتی
میں جو کہتی ہوں اس کو کرتی ہوں
وعدہ کر کے مکر نہیں سکتی
میں ثریاؔ نہیں ہوں آئینہ
ٹوٹ کر میں بکھر نہیں سکتی

☆☆☆

Bachchon ke Munfarid Mazmoon nigar Zaman Azurda by Sabrina Javid(Research Scholar,Desh Bhagat University,Fatehgarh,Punjab)
سبرینہ جاوید (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دیش بھگت یونیورسٹی، فتح گڑھ، پنجاب)

بچوں کے منفرد مضمون نگار زماں آزردہ

جموں کشمیر میں آزادی کے بعد ادب اطفال لکھنے والوں میں پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ کا نام سرفہرست ہے۔ آزادی کے بعد آپ جموں کشمیر کے واحد قلم کار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے بچوں کے ادب کی طرف توجہ دی اور بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بچوں کے ادب کے میدان میں پیش قدمی کی۔ اس ضمن میں وہ خود رقم طراز ہیں:

''بچوں کے بین الاقوامی سال ۱۹۷۹ء میں لکھی گئی یہ کتاب تقریباً گیارہ برس بعد چھپ رہی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اب اسے نہ چھاپا جاتا مگر ایسی کتابوں کی ضرورت جتنی گیارہ سال پہلے تھی، اُس سے کہیں زیادہ ضرورت آج ہے اور شاید آئندہ بھی رہے گی۔'' (گلدستہ، حصہ اوّل، ص ۵)

عام پر بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں لکھی جاتی ہیں لیکن محمد زماں آزردہ نے عام روش سے ہٹ کر بچوں کے لیے لکھا ہے۔ آپ نے ادب اطفال میں ایک نئی نثری صنف کا اضافہ کیا ہے۔ موصوف نے اپنے منفرد انداز میں بچوں کے لیے اخلاقی اور روحانی طرز کے مضامین لکھے۔ جس زمانے میں یہ مضامین لکھے گئے تھے شاید ادب اطفال میں اس طرح کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے مضامین کی انفرادیت کے متعلق موصوف خود رقم طراز ہیں:

''عام معلومات، تاریخی واقعات اور سائنسی ایجادات پر تو کتابیں آئے دن چھپتی رہتی ہیں۔ بچّوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے کتابیں خاص طور پر اردو میں، نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے ایسی کتابوں کی تصنیف کرنا مصنفین کی بڑی ذمہ داری ہے۔ تعلیمی، سماجی بہبود اور دہی اور شہری ترقی کے محکموں کے منتظمین کے لئے ایسی کتابیں تیار کروانا، خریدنا اور عام کرنا ضروری ہے۔'' (ص ۵)

زماں آزردہ نے اپنے ان مضامین کو ''گلدستہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ یہ کتاب چار حصوں پر مبنی ہے۔ 23 x 36 /16 کے سائز میں چھپی اس سیریز کا ٹائٹل ملٹی کلر ہے۔ ہر کتاب ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ہر حصے کی قیمت ۲۵ روپے رکھی گئی

ہے۔اس طرح پورے سیٹ کی قیمت ۱۰۰ روپے بنتی ہے۔جبکہ غیر ملکی خرید داروں کو فی حصہ ۳ ڈالر دینے ہوں گے۔اس طرح غیر ملکیوں کے لئے پوری کتاب کی قیمت ۱۲ روپے بنتی ہے۔اس سیریز کے سبھی حصوں کے مضامین کے بیچ بیچ میں موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے ملٹی کلر تصویریں آویزاں کی گئی ہیں تاکہ بچوں کو مضمون کو سمجھنے میں آسانی ہو۔اس کتاب کی کمپوزنگ توفیق حسین نے کی ہے جو کہ دلکش نہیں ہے۔ٹائپ کا فونٹ بہت زیادہ بڑا ہے۔حاشیہ بہت کم چھوڑا گیا ہے۔علاوہ ازیں مضامین کے درمیان دی گئیں تصویروں کا سائز بہت چھوٹا ہے۔اور یہ کتاب مرزا پبلی کیشن حسن آباد رعناواری سرینگر، کشمیر ۱۹۰۰۰۳ کی جانب سے شائع کی گئی ہے۔کتاب کے کاپی رائٹ مصنف کے پاس محفوظ ہیں۔کتاب کا انتساب مصنف کی جانب سے کم سن بچوں کے نام کیا گیا ہے۔انتساب دو جملوں پر مشتمل ہے۔دوسرے جملے میں بچوں کو والدین سے عمر رسیدہ کہا گیا ہے ۔اس جملے کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انتساب پیش خدمت ہے:

''اُن کم سن بچّوں کے نام جو اپنے والدین سے عمر رسیدہ ہیں۔''

زیر دست کتاب ''گلدستہ'' کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا تھا جو دو ہزار کاپیوں پر مشتمل تھا۔بڑی بات ہے کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ستمبر ۲۰۰۳ میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔قابل ذکر ہے کہ اس ایڈیشن کی تعداد بھی دو ہزار ہے۔اس کتاب میں مضامین سے پہلے ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان سے مصنف نے اپنی بات تحریر کی ہے۔قابل ذکر ہے کہ دستیاب ہوئی کتاب دوسرے ایڈیشن کی ہے جس میں مصنف نے پہلے ایڈیشن کی اپنی بات بھی شامل کی ہے۔مصنف ''کتاب سے پہلے'' کے عنوان کے تحت اس کتاب کو تحریر کرنے کے متعلق لکھتے ہیں:

''گل دستہ نام کی یہ کتابیں لکھتے وقت یہ خیال رکھا گیا ہے کہ ان کتابوں کو بچّے نہ صرف یہ کہ دلچسپی سے پڑھیں بلکہ ان کو پڑھنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے بھی جائیں۔اس کے علاوہ یہ کتابیں لکھتے وقت سکولوں میں تعلیم پانے والے وہ بچے پیش نظر رکھے گئے ہیں، جو اردو پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ یہ کتابیں ایسی صورت اختیار نہ کریں کہ بچے کا ذہن بیچ سفر کے تھک جائے۔یہی وجہ ہے کہ الگ الگ عنوانات کے تحت زندگی کی مختلف منزلوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے، مصنف بچے کی انگلی پکڑ کر چلتا رہا ہے۔جہاں بچہ آگے بڑھا ہے وہاں مصنف نے بھی اُس کا ساتھ دیا ہے۔'' (محمد زمان آزردہ، ۴، جنوری ۱۹۹۰ء، گلدستہ، ص ۴۔۵)

محمد زمان آزردہ کی اس کتاب ''گلدستہ'' کا پہلا حصّہ مصنف کی مختصر سی بات کے علاوہ

مندرجہ ذیل تین مضامین پر مشتمل ہے۔1۔کھیل کود 2۔اتفاق 3۔وقت کی پابندی

اسی طرح اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی مصنف کی بات یعنی ''کتاب سے پہلے'' سے شروع ہوتا ہے۔مصنف کی اس مختصر سی گفتگو کے بعد مندرجہ ذیل تین مضامین اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ 1۔تعلیم 2۔اپنی مدد آپ 3۔حب الوطنی ۔اس طرح مصنف نے اس کتاب کے حصہ سوم میں بھی اپنی بات کے بعد مندرجہ ذیل تین مضامین شامل کئے ہیں: 1۔تندرستی 2۔ایمانداری 3۔مشغلے ۔اس کتاب کا حصہ چہارم بھی مندرجہ ذیل دو مضامین پر مبنی ہے: 1۔اچھی عادتیں 2۔اخلاق ۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر زماں آزردہ کا یہ گلدستہ گیارہ مختلف رنگوں کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ہر مضمون موضوع کے اعتبار سے دوسرے سے جدا ہے اور ہر موضوع اپنے آپ میں مکمل اور نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔مصنف نے اپنے ان مضامین کے ذریعے بچوں کو زندگی کے گیارہ اہم پہلوؤں سے روشناس کروایا ہے۔اگر بچے ان مضامین کے مطالعے کے بعد ان پر عمل کریں گے تو یقینا ان کو زندگی میں کامیابی اور کامرانی نصیب ہوگی۔اس سیریز کا سب سے پہلا مضمون جس کا عنوان ''کھیل کود'' ہے، جو ایک منفرد اور بڑے اہم موضوع کو سمیٹے ہوئے ہے۔کھیل کود کو بچوں کی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔دیکھنے میں آیا ہے کہ کھیل کود کرنے والے بچے تندرست ہوتے ہیں جبکہ کھیل کود نہ کرنے والے بچے اکثر بیمار رہتے ہیں اور کمزور ہوتے ہیں۔لیکن والدین ان کو کھیلنے نہیں دیتے۔انہیں اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ کھیلنے سے کہیں ان کے بچے کی پڑھائی متاثر نہ ہو جائے۔زماں آزردہ کے مطابق کھیل کود بچوں کی زندگی کا ایک اہم حصّہ ہے۔اس مضمون کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مضمون بچوں کے ساتھ ساتھ والدین کو بھی پڑھایا جائے تا کہ وہ بچوں کی زندگی میں کھیل کود اہمیت سے واقف ہو سکیں۔بقول زماں آزردہ:

''بعض والدین یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بچّے ہر وقت پڑھتے رہیں، صرف امتحان کی تیاری میں مصروف رہیں اسی سے وہ آگے چل کر بڑے آدمی بن جائیں گے۔سماج میں عزت پائیں گے اور اخلاقی اعتبار سے صالح بن جائیں گے۔اس سے انکار نہیں کہ پڑھنے لکھنے سے بچّہ بڑا ہو کے بہت سارے فائدے حاصل کرتا ہے۔وہ سماج کی ترقی میں حصّہ لیتا ہے مگر کھیل کود سے اُس کا جسم دلکش، خوبصورت اور صحت مند بنتا ہے۔وہ خوش رہتا ہے اور عملی طور پر ایسی عادتوں کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے جن کی ضرورت زندگی میں ہمیشہ ہی رہتی ہے۔'' (گلدستہ، حصّہ اوّل، ص ۸)

آزردہ بچے کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ

پڑھائی کے ساتھ ساتھ بچوں کو کچھ وقت کے لیے کھیل کود کرنے کا بھی موقع دیا جائے۔ موصوف نے اس مضمون کا آغاز میں بچوں کی زندگی میں کھیل کود کی اہمیت پر یوں روشنی ڈالی ہے:

''کھیل کود انسان کے لئے ضروری ہے۔ خاص طور پر بچّے کے لئے۔ جو بچّے کھیل کود سے جی چرائیں گے اُن کا جسم کمزور رہے گا اور وہ کئی طرح کے فائدوں سے محروم رہیں گے۔ جسم کی کمزوری کا مطلب دماغی کمزوری بھی ہے۔ کیونکہ دماغ جسم ہی کا ایک حصّہ ہے اگر جسم ہی تندرست نہ ہو تو ذہن کیسے تندرست رہ سکتا ہے۔'' (گلدستہ، حصّہ اوّل، ص ۸)

کھیل کود کرنے کے ساتھ ساتھ زماں آزردہ چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر بچّہ تعلیم حاصل کرے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بے شمار فائدے ہیں۔ وہ علم کو روشنی سے مشابہت دیتے ہیں۔ ان کے مطابق علم حاصل کرنے کی کوئی حد نہیں ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے تعلق سے پروفیسر زماں آزردہ اپنے مضمون ''تعلیم'' میں رقم طراز ہیں:

''تعلیم کے فائدوں کے متعلق آپ اپنے اساتذہ، اپنے بزرگوں اور اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ سنتے رہے ہیں اور سنتے رہتے ہیں۔ یہاں پر ایک بات عرض کروں گا کہ علم کی حیثیت روشنی کی ہے۔ جو اس میں جتنا آگے بڑھے اتنی ہی روشنی حاصل کرے گا۔ آنکھیں تو سب کی ہوتی ہیں (ان پڑھوں اور جاہلوں کو بھی) مگر دیکھنے کے لئے، زندگی کا مشاہدہ کرنے کے لئے، فطرت کا نظارہ کرنے کے لئے صرف آنکھیں کافی نہیں بلکہ اس کے لئے روشنی بھی چاہئے۔'' (گلدستہ، حصّہ دوم، ص ۹)

لیکن اس مضمون میں زماں آزردہ شاید یہ بھول گئے ہیں کہ وہ یہ مضمون بچّوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے علم کے متعلق بہت ثقیل گفتگو کی ہے۔ جس کو سمجھنا بچوں کے لئے بہت مشکل ہے۔ اسی طرح مضمون ''ایمانداری'' اس گلدستہ کا ایک منفرد قسم کا مضمون ہے۔ جو موضوع کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دنیا میں ایمانداری کی بڑی اہمیت ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں مصنف نے ایمانداری کی تعریف یوں پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایمانداری سے مطلب یہ ہے کہ انسان دوسروں کے فائدے کو اپنا فائدہ اور دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان خیال کرے۔ جب یہ خیال پختہ ہو تو انسان کا ضمیر صاف رہتا ہے۔'' (ص ۱۵)

ایمانداری کی بنیاد سچائی پر ہے۔ ایماندار انسان ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اگر ہم سچ نہیں بولیں گے تو ہم معاشرے میں اپنا اعتبار کھو دیں گے۔ اس لئے ایمانداری کا دارومدار سچائی پر ہے۔ اس مضمون میں زماں آزردہ نے ایمانداری کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بچوں کو سچ بولنے کی تلقین کی ہے تا

کہ سماج میں وہ ایک ایماندار شخص کے طور پر جانے پہچانے جائیں گے۔اسی میں ان کی، ان کے والدین اوران کے اساتذہ کی عزت ہے۔اسی طرح زماں آزردہ کے اس گلدستے میں ایک اورمنفرد مضمون ''اپنی مدد آپ'' ہے۔اس مضمون میں مضمون نگار نے زندگی کے ایک بہت ہی اہم پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔اس مضمون میں وہ بچوں کواس بات کا درس دے رہے ہیں کہ انھیں اپنی مدد آپ کرنی چاہئے یعنی اپنا ہر کام خود کرنا چاہئے۔زماں آزردہ رقم طراز ہیں:

''انسان کے لئے پہلا درس تو یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنا کام کرنے کے لئے تنہا ہے۔اگر یہ بات ذہن میں نہ ہوتو وہ صرف دوسروں کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کرے گا۔اورانسان کو جتنا دوسروں کا سہارا ملتا جائے گا اتنا ہی وہ کمزور ہوتا جائے گا۔یہ کمزوری زندگی کے لئے زہر ہے۔اس زہر سے آدمی جتنا بچے گا اتنا اچھا ہے۔'' (ص۱۷)

اس مضمون میں مضمون نگار نے ارون نام کے ایک لڑکے کا منظر پیش کیا ہے۔جو خود کچھ نہیں کرتا۔دوسروں پر منحصر رہتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ کالج جاتے وقت لیٹ ہو جاتا ہے۔کیونکہ وقت پراس کے کپڑے پریس نہیں ہوتے۔جوتے پالش نہیں ہوتے۔اس منظرنامے کے چند مکالمے پیش خدمت ہیں۔جن سے ارون کی کاہلی نظر آتی ہے۔

ارون(کالج میں بی اے میں پڑھتا ہے۔)(گھڑی دیکھی ساڑھے نو کا وقت دیکھا۔چلانے لگا۔) ارے غضب ہوگیا! امی! امی! مجھ سے کہا کیوں نہیں کہ اتنا وقت ہو گیا۔(کتابیں میز سے سمیٹتے ہوئے) دس بجے تو کالج پہنچنا ہے۔بس بھی کہاں ملتی ہے وقت پر۔(امی دوڑتی ہوئی آئی ہے۔فیڈ ان(۱۸)

اس طرح دیکھا جائے تو زماں آزردہ کے تحریر کردہ یہ سبھی مضامین انسانی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔انھوں نے تفریحی مضامین بھی بجائے اخلاقی اور اصلاحی طرز کے مضامین لکھے ہیں۔جن کی اہمیت آج کی برقرار ہے اورآنے والے دور میں بھی رہے گی۔زماں آزردہ کے تحریر کردہ یہ مضامین ادب اطفال کے نوعمر بچوں یعنی دسویں اور بارہویں کے بچوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ مضامین بہت معیاری اوراعلیٰ پائے کے ہیں۔زماں آزردہ کے ان مضامین کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔انھوں نے ان مضامین کو دلچسپ بنانے کے لئے مثال کے طور پر چھوٹے چھوٹے قصے یا واقعات ان میں شامل کر دیئے ہیں۔لیکن کہیں کہیں زماں آزردہ ایک فلاسفر کی طرح باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔الختصر یہ کہ زماں آزردہ کے یہ مضامین اردو کے ادب اطفال کا بہترین نمونہ ہیں۔جو ادب اطفال کے سبھی تقاضوں پر کھرے اترتے ہیں۔☆☆☆

Barr-e-saghir mein Pandit Shoara par "Masnavi-e-Manvi" ke Manvi Asraat:Ek mutala by Aijaz Ahmad Malik(Research scholar,dept.of Persian University of Kashmir,Srinagar)

اعجاز احمد ملک (ریسرچ سکالر، شعبہ فارسی، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر)

برصغیر میں پنڈت شعراء پر مثنوی معنوی کے معنوی اثرات

(ایک مطالعہ)

مقدمہ: مولانا جلال الدین رومی ایک قدآور اور نابغہ روزگار شخصیت گذری ہے۔ اس عظیم شخصیت کی شہرت پوری دنیا میں ہے۔ انہوں نے اپنے فکرفن سے فارسی ادب کو ارتقاء کے منازل پر پہنچایا۔ ان کے اشعار نے ہر زمانے میں مردہ اور خستہ دلوں میں جان پیدا کی ہے۔ عہد بہ عہد اور نسل در نسل ان کے نقلابی افکار وخیلایات نے صوفیا و اہل دل کی مجلس کو تر و تازہ رکھا ان کا کلام ادب عالیہ کا وہ نمونہ ہے جہاں اسرار و رموز کا لامتناہی گنجینہ کا مصداق ہے اس گنجینہ معنی میں زندگی کے اسرار و رموز منعکش کیئے گیئے ہیں علاوہ از این مولانا نے اپنے شاعری کے ذریعے اسلامی افکار کی تشریح وتعبیر کی ہے جو کہ انسانی ذہن و دل کی تربیت کا باعث بنے، پوری دنیا کی طرح برصغیر میں بھی مولانا کو بڑے عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہے، شاہ و گدا، امیر وغریب وغیرہ غرض بلاتفریق مذہب وملت کے ہاں رومی کی جلوہ نمائی ہے۔ انہی ادبی وصوفیایی نامور شخصیات میں پنڈت دیا رام کا چرو، پنڈت بھوانی داس اور بینوالی داس نامی ایک ہندوستانی مصنفین قابل ذکر ہیں جن کے ادبی آثار میں مولانا رومی کا اثر بدرجہ اتم موجود ہیں۔

کلیدی الفاظ: پنڈت، برصغیر، عرفان رومی، مثنوی، تصوف۔

مولانا جلال الدین رومی کا شمار دنیا کے نامور شاعر و عارف سوختہ میں کیا جاتا ہیں۔ برصغیر میں بھی ان کو بڑے احترام وعقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ان کے کلام کا اثر برصغیر کے مختلف زبانوں پر رہا ہے۔ ایران کے مشہور ومعروف محقق پروفیسر عبدالحسین زرین کوب رقمطراز ہے:

''درخارج از حوزہ یاران قونیہ۔۔۔تا مدت ھا بعد از وفات وی مجال انتشار چندانی نیافت، بدون شک فرصت ومہلتی لازم بود تا خلفای مولانا بہ نشر مثنوی در خارج از حوزہ مجالس یاران وی راضی و مصمم گردند'' (کوب، ۱۳۸۷، ص ۱۵۰)

دسویں اور گیارہویں صدی ہجری میں بہت سے ایرانی شعراء نے برصغیر کا رخ اختیار کرتے ہیں چونکہ یہاں کے حکمران ادب پرور و شاعر سنج تھے وہ شعرا کو خوب نوازتے تھے۔ ایرانی شعرا نے یہاں آ کر برصغیر کے شعر کو مولانا جیسے شاعر کا تعارف دیا۔ انہوں نے رومی کے اسلوب کلام کی پیروی شروع کر دی اور اہل علم و ادب نے مثنوی معنوی کی شرحیں تالیف کی۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو میں مثنوی کی مختلف تشریحات و تشریامت کا انتخاب کیا گیا، نیز دیوان شمس کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح سرزمین ہندوستان میں رومی شناسی کا باب کھل گیا۔ اس میدان میں پندت شعراء بھی پیش پیش رہے نیز اس علمی تحریک میں حصہ لیا، مثال کے طور پر کشمیر کے نامور مورخ، ادیب و شاعر پنڈت دیارام کاچرو، جنہیں ادبی دنیا میں خوشدل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے،۔ انہوں نے مولانا رومی کے تتبع میں اپنی ایک معرکہ الآرا ادبی مثنوی بہ نام' دفع شبہات از ابیات مثنوی'' تصنیف کی۔ خوشدل کشمیر کے حکمران عطا خان (۱۲۳۶۔ ۱۲۲۲ھ/ ۱۸۰۷۔ ۱۸۰۲م) کے دور میں سری نگر، کشمیر میں مقیم تھے انہوں نے اس مثنوی کو سید کرم علی کے نام منسوب کیا۔ انہوں نے اس مثنوی میں مثنوی معنوی کے ان اشعار کا جواب لکھا جن کے بارے میں لوگوں کو شک و شبہات تھا۔ اس فن پارے کا ایک اصلی نسخہ کتابخانہ انجمن ترقی کراچی پاکستان میں موجود ہے۔ (نوشاھی، ۱۳۵۰؛ ص ۲۱۳)

اسی طرح کشمیر کے ایک اور معروف فارسی پنڈت شاعر بوانی داس (قرن ۱۱ھ) نے بھی ''پیر رومی'' کے نام سے ایک مثنوی تصنیف کی، جو تقریباً ایک سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ہمارے پاس شاعر کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں، مگر کچھ محققین و مورخین سے یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے مولانا روم کی تقلید میں ایک مثنوی بہ نام'' پیر رومی'' تخلیق کی ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ شاعر کی سوانح عمری ہمارے دسترس میں نہ ہونے کے سبب مثنوی ہذا بھی گردش زمانہ کے نظر ہو گئے۔

اسی طرح برصغیر کے مشہور و معروف ھندو شاعر ولی دہلوی نے ''مثنوی ولی رام'' کے نام سے ایک مثنوی تصنیف کی، جو چھ جلدوں اور دو ہزار چار سو اور تنتالیس اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس مثنوی میں شاعر کی ذہنی اپچ اور ادبی دسترس قابل دید ہے۔ انہوں نے اس مثنوی میں مضمون کا تسلسل، الفاظ کی روانگی، محاورات، تشبیہات اور استعارات کو بڑے ماہرانہ اور نازک خیالی کے ساتھ عمل میں لایا ہے۔ اس کی لطافت اور معنی کی نزاکت ہم ترجمہ میں محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔

برصغیر قرون وسطیٰ میں فارسی زبان و ادب کے زیر سایہ اپنے سماجی، ثقافتی، فرہنگی اور ادبی رشد کے مراحل طے کر کے ایک نئی ماہیت جلوہ نمود ہوتا ہے۔ اس فرہنگی و ادبی رشد کو حاصل کرنے کے

لیے بلاتفریق مذہب بے شمار شعرا، ادیب اور مصنفین پیش پیش رہے ان میں بنوالی داس معرف بہ ولی بابا ولی رام سرفہرست ہے۔ وہ دربار شاہ جہاں 1078۔1037) کے مشہور ومعروف ادباء میں شمار کیا جاتا تھے۔ کچھ عرصہ وہ دارا شکوہ کے دربار میں سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے۔ عرفان اور تصوف کے میدان میں ان کی بڑی شہرت تھی۔ انہوں نے اسلام اور ہندمت کے مابین اتحاد قائم کرنے کی از حد کوشش کی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے فارسی نظم اور نثر میں بہت سے آثار تخلیق کیں۔ (منزوی ۲ ۱۶۳۲: ص ۳)

ولی رام کی مثنوی جو چھ جلدوں پر اور چھ اوزان پر مشتمل ہے۔ یہ تقریباً ۲۴۴۳۱ شعار پر مبنی ہے۔ (منزوی، ۲ ۱۶۳۲: ص ۲)

اس مثنوی کو مطالعہ کرنے کے بعد مثنوی معنوی کی چاشنی اور مٹھاس کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی میں نہ فقط موضوعاتی ابحاث کا اشتراک پایا جاتا ہیان چھ دفاتر میں سے جو دفتر مثنوی معنوی کے بحر میں رقم کی گئی ہیں۔ جس جلد میں مولانا کا اثر غالب رہا ہے وہ ۲۱۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ موضوعات کے حوالے سے اس میں نظریاتی عرفان، خدا کی تعریف وتمجید ،صوفیانہ نصیحت اور حدیث شریف کی تشریح ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' (سیوطی) کی تفصیل ملتی ہے۔ بقول سید عبداللہ:

''اس مثنوی میں مسلسل عنوانات ملتے ہیں'' (عبداللہ، ۱۹۶۷ء: ص ۶۳)

ولی رام کو فارسی شاعری اور نثر میں مہارت تامہ حاصل تھی، اور بہت سے تصانیف فارسی ادب میں ان کی یادگار رہے۔ جیسے مثنوی ولی رام، مثنوی اوم نامہ، مصباح الھدیٰ، دیوان ولی، گلزار حال، تاریخ راجہ ولی اور ایک رسالہ باباولی قابل ذکر ہیں۔ ولی رام کے موضوعات میں وحدت الوجود کا موضوع خاصا اہمیت رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قادرا از من بستان وبس　　　کن عنایت ذرہ عرفان وبس　(مولانا)

ولی رام نے یہ شعر مثنوی کے دیباچے میں رقم کیا ہے۔ شاعر نے اس مثنوی میں جس موضوع کا اظہار خیال کیا ہے، اس شعر سے پوری مثنوی کا عیاں ہوتا ہے شاعر خدا تعالیٰ سے بڑی انکساری اور تواضع کے ساتھ راز و نیاز کرتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود تصوف کے بنیادی اور اہم فلسفے میں شمار کیا جاتا ہے، اور ولی رام کے ہاں یہ فلسفہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ اس فلسفے کے حامیوں میں نیز اس فلسفے کو ثابت کرنے کے لیے انہوں اغلب اشعار لکھے ہے اور شروع سے آخر تک ان کے خیالی دنیا میں یہ موضوع غالب رہتا ہے۔ مثال کے طور پر:

مام چون ذرای شمس کمال ست و بود مام از بودتو

درلباس ماتوپی جویای خود حمد خودرااززبانی خودکنی

چیست اشیافرع اصل ذات تو درج ان جسم جان پیداتوپی

روح وجان ودل ظورذات تو خودمحبت خویش محبوب خوداست

ردوعالم مظرذات حق است مام آنیم وم آن آن ما

درلباس مام حق آمد برگ وساز مازتست ای ذوالجلال

علم وقدرت مانموداز جودتو بندخویشتی وم مولای خود

عالمی ازآب وگل پیداکنی ای تومری مام ذرات تو

درلباس جان آدم خودتوپی مظرتوجمل موجودات تو

عاشقی خویش است ومعشوق خوداست مظرمطلق ظورمطلق است

درلباس جان ماجانان ما موبہ موزان درانالحق آمد (رام،ص:۷۱)

اس مثنوی میں اس موضوع کے علاوہ توحید اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اظہار بھی بہت متاثر کن الفاظ میں کیا گیا ہے چونکہ ولی رام ہندو مذہب کے پیروکار ہونے کے باوجود توحید پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور اس عقیدے کو ثابت کرنے اور سمجھانے کے لیے انہوں نے کئی اشعار لکھے ہیں،عقیدہ توحید کو کچھ یوں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دل صفاازصیقل توحیدکن ذرغرحق حرام آمدحرام

لن ف الدارن غرالل وبس پیشتر ازمرگ مردن بتراست

ترک ازپندارواز تقلیدکن طالب حق ذکرحق داردمدام

پرزحق ازحق بحق بین بین وبس لذت توحید بردن بتراست (ایضاً:ص ۷۳)

توحید کے عقیدہ کو بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں خداوند متعال کے بغیر تمام دیگر مصنوعی معبودوں کی نفی کرنی چاہیے، کیونکہ اگر کوئی شخص خداوند متعال کے بغیر کسی کا توسل کرے تو یہ گمراہی ہے اور وہ وصل الٰھی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔اور کہتا ہے۔

روی شکم پرکن ودل کن تھی ازسوی اللہ تا قدم بالانہی (ایضاً،۷۵)

ولی رام کہتے ہیں کہ توحید کو ثابت کرنے کی راہ میں مارا جانا موت اور حیات سے بالاتر ہے۔

ہرکجادرمیخانہ توحیدذات مست شدواست ازمرگ وحیات

ولی رام نے اس بارے میں بہت ساری نظمیں لکھی ہیں اور وہ اس طرح دعا کرتے ہیں:

کن بہ نوعی ہستیم زیر و زبر تا نماند جز تو از بودم اثر (ایضاً ۲۷)

وہ کہتا ہے کہ جو جوہر الٰہی میں اپنا جوہر بنا تا ہے وہ خدا کی ذات میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

کی خبر دار داز ین چون و چرا نیست اینجا جای عقل و فم وش

رک فانی شد ب عشق ذوالجلال غرق بحر رحمت نور خدا

در فنای خویشتن باقی بکوش غیر حق در فعل او باشد محال (ایضاً: ص ۶۷)

وہ "بقا" کے بارے میں کہتا ہے جو فنا مضمر ہے:

چون بقا آید فنا کم می شود مست بی میکی شود ست این محال

ای ولی در مشرب عرفان پرست قطر در قلزم چو قلزم می شود

بس فنا یت بی بقا باشد محال این فنا بعد از بقا آید ب دست (ایضاً: ص ۵۷)

موت کے گھر سے گزر کر بقا کی گلی میں داخل ہونے کے لیے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ یقین کی روشنی ہے، کیونکہ وہم کی تاریکی انسان کو گمراہ کر دیتی ہے اور یقین کی روشنی طالب کو سچائی اور افراط و تفریط کے گھر تک کھینچ لاتی ہے۔

وم تو از تو جدا دار د ترا چون یقین آمد گمان رفت از میان

زان ب بینی جلوۂ علم القن بعد از ان عین الیقین پیش آمدت

دولت حق الیقین زانجا کند زان بخود نادید ماندی مبتلا

لذت و آرام روافزون از ان واری از کفر و شرک و ننگ و دین

ترک از اوصاف خود فرمایدت قطرات را بحر بی متا کند (ایضاً: ص ۴۷)

ان کے مطابق، الٰہی تعلق کو جاننے اور حاصل کرنے کے لیے، یقین کے بعد، سالک کو ہمیشہ جھکنا چاہیے اور اپنے ذہن میں کوئی شک اور انکار نہیں چھوڑنا چاہیے۔ خواہش اور خوف سے قطع نظر، محبت کرنے والوں نے ہتھیار ڈال دیے، امید سے بالاتر ہو گئے، اور کہتے ہیں:

راستی اینست رو تسلیم شو عاشقان تسلیم تسلیم آمدند

فارغ از خوف و رجا و بیم شو برتر از امید و از بیم آمدند (ایضاً: ص ۷۵)

اطاعت و فرمانبرداری کے لیے سالک کے لیے اپنی انا پر قابو پانا ضروری ہے۔ کیونکہ نفس ربط کے راستے کی سب سے بڑی دستاویز ہے اور جو لوگ خود کو تابعدار بناتے ہیں وہ عنقریب طریقت

کے راستے پر چل پڑیں گے۔خودشناسی ایک اہم مسئلہ ہے،لیکن اس اصول کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

معنی زتارنفس دون تست　　　شخصیت اینست رواز مکر خویش
روعلاج کفر باطن کن نخست　　　پای نفسانی منہ از حد بیش (ایضاً:ص ۷۶)

عرفاء اور صوفیاء کے نزدیک انسان نائب حق، کائنات کی تخلیق کا ہدف اور ذاتِ مطلق کا مظہر ہے۔اس لیے وہ انسانی عظمت پر یقین رکھتے ہیں لیکن ولی رام نے ایک کامل صوفی کی طرح اپنی مثنوی میں انسانی عظمت کے بارے میں اشعار لکھے ہیں،

لامکان اندر مکانت جلوگر　　　روز خودبشناس ذات ذوالجلال
مرغ عرشی چون زمین گیری نگر　　　ای زتو پیدا صفات پر کمال (ایضاً:ص ۷۷)

اس نے اپنی مثنوی میں رومی کی پیروی کرتے ہوئے اپنا فلسفہ بیان کیا ہے۔اس کے مطابق ہم کائنات کو اپنی طاقت سے ہی مسخر کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ قدرت اور طاقت خدا کی فطرت میں ظاہر ہوتی ہے۔

انکہ بیخود ماند از خود خاک شد　　　ہر کہ اگہ از صفات خوش شد
آخرش در شان اولولاک شد　　　شدگنی از حق زخود درویش شد (ایضاً:ص ۸۴)

تیسرے مرحلے میں، ولی رام نے انسانی فطرت کی نفی کے بارے میں لکھا ہیکہ سالک کو اپنی ذات کو نفی کرنی ہے۔سچائی تک پہنچنے اور انا پرستی سے نجات حاصل کرنا اس مرحلے کا جز ولاینفک ہے۔

ازخودو بیخودی روتافتہ　　　ہر کہ اودر اصل فرع کو دبدید
دو ہمہ وبی ہم اویافتہ　　　ازخودی و بیخدی مطلق رہید (ایضاً:ص ۸۴)

وہ کہتا ہے کہ انسان کو روشنی کی بجائے اپنے باطنی یقین کی شمع روشن کرنی چاہیے تاکہ وہ کمال کی چوٹی تک پہنچیں۔

باطنت شمع یقین روشن کند　　　ازکمال جہد از زندہ دلی
ظاہرت پرنور چون گلشن کند　　　ظاہر و باطن بی آرا چون ولی (ایضاً:ص ۸۴)

سچے مرشد کے عرفانی سفر میں عشق حقیقی چراغ ہداہت کے مانند ہے جو سالک کو منزل کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے،خدا کی ذات سیم توسل کرنے کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے:

شاد باش ای عشق خودسودای ما　　　ای طبیب جملہ علت ہای ما

عرفانی سفر کے اسباب میں سے، پر جوش جذبہ، دانشمند رہنما، نور ہدایت، حق کا پیامبر عشق کی عظیم اور حقیقی قوت عشق ہے۔ صوفیاء کے نزدیک انسان اس سے گزر سکتا ہے۔ کائنات انسانی تخلیق کی منزل اور سچائی کا آشکار چہرہ ہے، اور اگر محبت نہ ہو تو کوئی محنت حاصل نہیں ہوگی۔ لیکن ولی رام پر جوش جذبے سے اپنی مثنوی کے اشعار یوں بیان کرتے ہے:۔

شاد باش ای عشق خود سودای ما — خان چون صحرا و صحرا خان کن
عشق در دل خیم چون بر پا کند — غیر عشق عاشقی با اصل خویش
ظار و باطن فدا پر اصل کن — ای طبیب جمل علت ای ما
متی در عشق چون پروان کن — فارغ از شور و شر و غوغا کند
رچ باشد غفلتست و رنج پیش — در گذر از جر قصد وصل کن (ایضاً: ص ۸۵)

صوفیاء کے پاس عقل کی مذمت میں بہت سے دلائل ہوتے ہیں، لیکن ولی رام عقل کو قابل تعریف سمجھتے ہیں اور بعض اوقات خود شناسی کی بحث میں تنقید بھی کرتے ہیں۔

نیست اینجا جای عقل و فہم و ہوش — عقل جزوی شد حجاب راہ تو
در فنای خویشتن دایم بکوش — مانع اسرار شہنشاہ تو (ایضاً: ص ۸۱)

کونسی عقل قابل تقلید اور تعریف ہے۔ اس حوالے سے وہ کہتا ہے کہ:

عقل کہ جز حق بنمایدت — عقل نوری معرفت افزایدت (ایضاً: ص ۸۱)

لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ولی رام، حالانکہ وہ ہندو مذہبی کا پیرو تھا۔ لیکن جیسا ہم نے اس سے پہلے کہا ہے کہ وہ توحید کے عظیم حامیوں میں سے تھے:

کفر باشد یک دلت صد جا بود — یک دل و یکتا زبس زیبا بود (ایضاً: ۸۳)

لیکن ان جگہوں میں بعض مقامات پر اس کی دنیا سے دور رہنے میں دلچسپی رہبانیوں کی طرح خلوت میں رہنے کا مشاہدہ بھی کیا جاتا ہے۔

ترک دنیا رآس کلی بندگی است — حب دنیا رآس کلی جرم ھاست
ھر چہ غیر این بود شرمندگیست — در سرت سودای این فانی است (ایضاً: ص ۷۷)

صوفیوں کے خیالات اور عقائد کے مطابق ولی رام نے نظم میں معاشرے اور عوام کے درمیان موجود ہونے کے عقیدے کو پیش کیا ہے۔

عزلت از کثرت زکج فہمی مجو — خلوت اندر انجمن بگذیدہ ام

خلوت اندر انجمن آمد نکو　　　　حق بہ حق درحق ہمہ شی دیدہ ام　(ایضاً: ص ۷۳)

نتیجہ گیری: اگر چہ یہ مثنویات ابیات کے لحاظ سے مختصر ہے لیکن افکار و معانی کے لحاظ سے بہت ہی بھرپور اور جامع ہیں۔ ولی رام کی صوفیانہ مثنوی کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موضوعات کی قسم اور افکار کی ترتیب کے لحاظ سے یہ مثنوی مکمل اور جامع بھی ہے۔ ولی رام نے رومی کی مثنوی معنوی کی پیروی کی اور وہ موضوعات کو مولوی روم کی مثنوی سے اخذ کرتے ہیں، لیکن انہوں نے بغیر کسی تشبیہ کے اپنے خیالات کا اظہار سادہ انداز میں کیا۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ رومی کی فکر سے متاثر تھا اور رومی کی طرح اس نے بھی قرآنی مواد کا اظہار کیا اور کلام الٰہی سے استدلال کیا۔

منابع و ماخذ: رام، ولی. مثنوی ولی رام. لاہور: دست نویس شمارہ 771\478 کتابخانہ دانشگاہ پنجاب، n.d.

سیوطی، جلاج. الفتاوی الصوفی للامام السیطی.. Vol۳ بیروت لبنان: دال الکتب العلمی 2000ء

عبداللہ، سید. ھم ھندوان درادبیات فارسی (اردو). لاہور: چاپخانہ شفق لاہور، 1972ش۔.

کوب، عبدالحسین زرین. سرنی۔ نقد و شرح تحلیلی و تطبیقی مثنوی. تھران: علمی تھران، 1386ش۔.

منزوی، احمد. فھرست مشترق نسخہ ھای خطی درموزہ پاکستان. کراچی: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام اباد، 1984ش۔.

نوشاھی، شید عارف. فھرست نسخہ ھای خطی درموززززہ پاکستان. کراچی: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، 1250ءش۔.

☆☆☆

Makhtuta shanasi mein tadveen-e-matn ki ahmiyat by Junaid Husain
(research scholar,dept.of persian,university of kashmir.srinagar)
جنید حسین (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر)

مخطوطہ شناسی میں تدوین متن کی اہمیت

تحقیق وتدوین متن یا ترتیب وتدوین متن ایک ہی کام کے دو نام ہیں۔ یہ تحقیق کا ایک شعبہ ہے جس میں ریسرچ اسکالر کسی مصنف کی کتاب کو ترتیب دیتا ہے، کسی کتاب کے پرانے ایڈیشن کو حواشی کے ساتھ ایک نئی شکل دے کر پیش کرتا ہے یا کسی اہم مخطوطہ کو مدوّن کر کے عام استفادے کے قابل بناتا ہے۔ ان باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ علمی اور تحقیقی کام کی صنف ہے۔

تدوین یعنی متن کی تصحیح وترتیب دراصل ایک عملی فن ہے جس میں مدوّن کتاب اپنی پوری توجہ اور محنت سے کسی مصنف کی کتاب کو پوری صحت کے ساتھ ترتیب دیتا ہے۔ سب سے پہلے تو وہ اصل متن کی تلاش کرتا ہے۔ خواہ وہ ایک جگہ ہو یا اس کے اجزا منتشر حالتوں میں مختلف جگہوں پر ہوں، اسے فراہم کرتا ہے پھر اس متن کو منشائے مصنف کے مطابق ترتیب دیتا ہے۔ متن کی ترتیب میں اسے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، یعنی اوّل تو وہ اس کی تصحیح کرتا ہے، تصحیح کے دوران اس متن کی پوری چھان بین کرتا ہے، اسے تنقیدی زاویوں سے ناپتا ہے، پھر اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ حسب ضرورت متن کی وضاحت بھی کرتا ہے، اس پر حاشیہ (فٹ نوٹ) دے کر اس کی تدوین کرتا ہے۔ اس طرح تدوین متن، عملی پہلوؤں کے اعتبار سے فراہمی متن، ترتیب متن، تصحیح متن، تنقید متن پر محیط ہے۔ ریسرچ اسکالر کو اس صنف تحقیق میں مذکورہ بالا سارے امور پر زیر حاصل بحث کرنی پڑتی ہے۔ ایک دانشور کا یہ خیال ہے۔

تحقیق وتدوین متن کا مقصد:

تحقیق وتدوین:۔ متن کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ دستیاب شدہ ''متن'' کو اصول تحقیق وتنقید کے مطابق جانچ کر ہم اس طرح ترتیب دیں جو مصنف کی منشا کے عین مطابق ہو، اور اس کی عبارت میں خفیف سے خفیف نقص کا امکان باقی نہ رہے۔ تدوین وترتیب متن دراصل ''تحقیق'' ہی کا ایک حصّہ ہے، لیکن دونوں کے حدود کار میں خاصا فرق ہے اور دونوں کے دائرہ کار الگ الگ ہیں۔ کوئی

ضروری نہیں کہ ایک اچھا محقق ایک ماہر کار مدوّن بھی ثابت ہو، یعنی اگر وہ تحقیق کے میدان میں بہتر طریقے سے حالات و واقعات اور ذاتی مشاہدات کی روشنی میں کوئی تحقیقی کام انجام دے سکتا ہے تو بہتر طریقے سے کسی کتاب کی تدوین بھی کر سکتا ہو؟ یہ اقتباس ملاحظ ہو:

''اگر ایک شخص صحیح طریقے، سے حقائق کی کھوج لگانے، مناسب انداز سے واقعات کو ترتیب دینے اور خالص منطقی، ڈھنگ سے نتائج نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ تو اس سے یہ لازم نہیں ہے کہ وہ متن کو بھی پورے آداب کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے۔ اس سے اس کی تحقیقی صلاحیت پر حروف بھی نہیں آتا۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ ترتیب متن پر بھی اسی طرح دسترس رکھتا ہو، البتہ تدوین کا کام کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو آداب تحقیق سے بھی اسی قدر واقفیت ہو اور لگاؤ بھی ہو۔ اس کے بغیر، تدوین کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا ا ؎

تدوین متن میں قلمی نسخوں اور مخطوطوں کو ایک خاص اصول کے تحت ترتیب دیا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاصی آگاہی کی ضرورت پڑتی ہے آج سے چند صدیوں پہلے جب طباعت کا ابھی رواج نہ ہوا تھا اور تحریری نقوش صرف ہاتھ کی نگارشات پر موقوف تھیں تو کسی تحریر کی ایک سے زیادہ کاپی کرنا نہایت ہی مشکل مسلہ تھا جبکہ آج انتہائی سہل اور آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے بتدریج ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اگر اس کی حالیہ زندگی ماضی کے دھندلے نقوش سے یکسر نا آشنا ہوتی تو آج سائنسی برکات کے باعث حسین وجمیل اور پر رونق ہے، کھنڈر نظر آتی۔ ہندوستان کی تاریخ، معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی زندگیوں میں مسلمان سلاطین اور حکمرانوں کے آئین و آداب اور فنون لطیفہ نے جتنے زیادہ گہرے نقوش چھوڑے ہیں، سچ یہ ہے کہ آج کے ہندوستان کی ترقیوں کا سرچشمہ یہی باقیات الصالحات ہیں۔ یہاں کی گذشتہ ہزار سالہ تاریخ وثقافت کا آئینہ دار علمی ذخیرے اور علوم و فنون کی کتابیں ہیں جو ان زمانوں میں لکھی گئیں اور جن کے قلمی نسخے سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔ ان قلمی مخطوطات کا بڑا حصّہ آج بھی تدوین و ترتیب کا محتاج ہے۔

مخطوطات کی قسمیں:

قلمی نسخہ یا متن کتاب کو عام طور پر تین حصّوں مین تقسیم کیا جاتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ یا اس کا دستخط کردہ یا اصلاح یافتہ۔ 2۔ اس کی زندگی کے بعد کے نسخے جو اس کے نسخوں سے نقل کیے گئے ہوں۔ 3۔ مذکورہ دونوں قسم کے نسخوں کے نقلوں کی نقلیں۔

مدوّن کتاب یعنی ریسرچ اسکالر کے نزدیک تیسرا نسخہ زیادہ تر پریشانیوں کا سبب بنتا ہے

۔ تحقیق و تصیح متن کے دوران جو دقتیں اور پریشانیاں پیش آتی ہیں، اسی تیسرے نسخے کے دوران آتی ہیں۔ یہ نسخہ چونکہ نقل در نقل کی منزلوں سے گزر کر آتا ہے۔اور مختلف کاتبوں کے ہاتھ مختلف زبانوں میں لکھا ہوتا ہے۔اس لئے اس میں غلطیوں کے امکان زیادہ ہوتے ہیں، اس کی نسبت پہلے اور دوسرے نسخوں کی تدوین میں محقق متن کے لئے زیادہ پریشانیاں نہیں ہوتیں، کیونکہ اس میں غلطیاں نسبتاً کم ہوتی ہیں پھر یہ کہ اس کا تعلق براہ راست مصنف کے نسخہ یا اس کے نقل سے ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ مصنف کے نسخہ کی موجودگی میں کوئی دوسرا نسخہ، قابل وثوق نہ ہوگا، وہی نسخہ بنیادی نسخہ بنایا جائے گا۔اور متن کی صحت کا ضامن ہوگا۔

تحقیق و تدوین متن کی پیچیدگیاں: تدوین متن کے دوران مختلف دقتیں پیش آتی ہیں۔اس کے لئے اگر مہارتوں کی ضرورت ہے تو محنت و کاوش اور جذبہ صادق کی بھی ضرورت ہے۔ ریسرچ اسکالر کو الفاظ و محاورات پر پوری قدرت ہونی چاہیے، اسے مختلف خطوط خصوصاً خط شکستہ کی خصوصیات سے واقف ہونا چاہیے، ساتھ ساتھ علم و ادب اور تحقیق سے بھی مناسبت ہونی چاہیے، چونکہ فارسی یا اردو کے رسم الخط عربی رسم الخط سے ماخوذ ہیں لہذا اسکے نقطے شوشے منجملہ وہی ہیں جو عربی کے ہیں، یہی وجہ ہے کے فارسی اور اردو میں تحقیق و تدوین متن کے دوران دقیق اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں اگر چہ اس کے علاوہ اور بھی دیگر وجوہ ہیں؟ یہ دقتیں اس طرح ہیں:

(ا) ایک سے زیادہ نقطے رکھنے والے حرفوں کے پے در پے آنے سے ''تحقیق متن'' میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔(2) نقطے دار حرفوں کو ملا کر لکھنے سے ان پر پڑے نقطوں کی تقدیم و تاخیر سے الفاظ کے تعین میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔(3) اگر حروف ایک دوسرے سے جدا ہوں تو نقطوں سے زیادہ پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی لیکن جب حروف کی نشاندہی صرف شوشے اور ان پر پڑے نقطوں سے ہو رہی ہو اور نقطوں کا خاصا اہتمام نہ ہو، تو ایسی صورت میں الفاظ کے تعین میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔(4) خط شکستہ میں نہ تو نقطوں کا التزام ہوتا ہے اور نہ ہی شوشوں اور مفرد حرفوں کی شکلیں اپنی اصل پر باقی رہتی ہیں، سارا معاملہ مدوّن و مرتب کے قیاس اور اس کی صلاحیت پر مخصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے مخطوطوں کی تدوین و ترتیب میں زیادہ دشواریاں اور پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۵) ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات حرفوں کو اختصار کے ساتھ لکھنے اور شوشوں اور تشدید والے لفظوں کے املا میں کم جگہ پانے کے سبب ان کے ہجاوں کے تعین میں دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(٦) بعض اوقات ایسے حروف جو ایک دوسرے سے ملا کر نہیں لکھے جاتے ان کی وجہ سے بھی متن کے

صحیح پڑھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں، مثلاً پہلے لفظ کا آخری حرف دوسرے لفظ کا ابتدائی حرف سمجھا جانے لگتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مفرد لفظ دو مفرد لفظ سمجھے جاتے ہیں۔(7) کبھی کبھی صاف وشستہ کتاب کی عدم موجودگی کے سبب بھی متن کتاب کا صحیح پڑھنا دشوار ہوجاتا ہے۔

متذکرہ بالا پیچیدگیوں اور دقتوں کی وجہ سے تدوین وترتیب متن میں بڑی عرق ریزی اور جانکاری صرف ہوتی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ یہ تحقیق کا ایک شعبہ ضرور ہے لیکن ہر محقق کے بس کا روگ نہیں۔ تدوین متن میں ریسرچ اسکالر کو خصوصاً املا اور تلفظ سے اس کی آشنائی ضروری ہے اور نیز خط کے پڑھنے میں مہارت ضروری ہے۔

نسخوں کی تلاش اور اس کے حصول کے طریقے: متن کتاب مختلف صورتوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ ریسرچ اسکالر کا کام نہ صرف اسے یکجا کرنا ہے بلکہ اس کی پوری تحقیق ،تنقید اور توضیح اور اس پر مقدمہ لکھ کر اسے مکمل کرنا ہے۔ یہ اگر منتشر یا غیر متعین حالت میں ہے تو اسے ایک جگہ کرنا مدون کا کام ہے، اور اسی پر بس نہیں! بلکہ اس کے منتشر اجزا کہاں کہاں ہیں؟ کن کن حالتوں میں ہیں؟ اور وہ کس طرح حاصل ہوں گئے؟ یہ ساری ذمہ داریاں اسی مدوّن کی ہیں۔ ریسرچ اسکالر کا سب سے پہلا کام قلمی نسخوں کی تلاش کرنا ہے، اس کے بعد اس کی حصولیابی ہے۔ نسخوں کی تلاش اور اس کے حصول کے سلسلے میں درج ذیل باتیں یاد رکھنے کی ہیں۔

نسخوں کی تلاش: قلمی نسخوں کی تلاش اور اس کی دریافت کے سلسلے میں سب سے پہلے اپنے سپروائزر سے پھر دیگر محققین اور اسکالروں سے معلومات فراہم کرنی چاہئیں۔ اوّل انھیں بزرگوں سے مشورے لینے چاہئیں، پھر قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ نسخوں کی تلاش کے سلسلے میں سب سے اہم ذریعہ کیٹلاگ ہے۔ ہندو بیرون ہند کے تقریباً بیشتر معروف کتبخانوں کے کیٹلاگ طبع ہو چکے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے ان سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ ان سے مخطوطوں کے بارے میں اہم اور بنیادی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں، لہذا کسی بھی معروف لائبریری سے منسلک ہو کر کام کی ابتدا کردینی چاہیے۔ قلمی نسخوں کی تلاش کے سلسلے میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ریسرچ اسکالر کو خود مختلف لائبریریوں میں جا کر نسخے تلاش کرنے چاہیئے۔ اس کام کے لئے پہلے لائبریرین سے ملاقات کر کے آسانیاں فراہم کرنی چاہئیں۔ یہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مخطوطے اندراج فہرست سے رہ جاتے ہیں۔ لہذا کٹیلاگ کا طریقہ مقابلتاً زیادہ سودمند نہیں ہوتا۔ ریسرچ اسکالر نے اگر صرف کٹیلاگ پر بھروسہ کیا تو نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ نسخوں کی تلاش کے لیے ریسرچ اسکالر کو خود مشہور ومعروف کتب خانوں تک

پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔اگرکسی وجہ سے خود سفر نہ کرسکے تو کسی معتبر شخص کو بھیج کر متن کتاب کے بارے میں معلومات کرائے۔قلمی نسخوں کی تلاش کے لیے معروف وغیر معروف کتب خانے سے استفادہ کرنا چاہیئے۔اس کے علاوہ بعض لوگوں کے پاس کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہوتا ہے،ان سے بھی استفادہ کرنا چاہیئے۔ریسرچ اسکالر کے لیے ضروری ہے کہ نسخوں کی دریافت جہاں کہیں سے بھی متوقع ہو،ان جگہوں کا پتہ لگائے اور وہاں سے استفادے کی شکل نکالے۔ریسرچ اسکالر کو پرانی کتابوں کے تاجروں سے بھی رابطے رکھنا چاہیئے،ان کے ذریعہ قلمی نسخوں کی دریافت ہوسکتی ہے اور مطبوعہ کتابوں کی فہرست بھی مہیا ہوسکتی ہے۔

متن کتاب کی فراہمی یا اس کے حصول کے طریقے:

(۱)قلمی نسخے کی تلاش کے بعد اس کی فراہمی اور حصولیابی کا مسلہ پیش آتا ہے۔ریسرچ اسکالر کو چاہیے کہ متن کی فراہمی کے سلسلے میں سوچ سمجھ کر کوئی دانشمندانہ قدم اٹھائے اور ہمہ تن اس کے حصول میں لگ جائے۔(2)مخطوطات کی فراہمی جس حالت میں جہاں سے ممکن ہو اور جس قدر ہو کرنی چاہیئے،قطع نظر اس سے کہ وہ معتبر یا غیر معتبر مکمل ہے یا ناقص اور غلط ہے یا صحیح۔حتیٰ الوسع یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ جلد سے جلد اس کا حصول ہوجائے۔(3)ریسرچ اسکالر کو چاہیئے کہ قلمی نسخوں میں جس نسخہ کو بنیادی بنانا ہے اس کی فلم یا فوٹو گراف کاپی کرے اور اس کو دیگر نسخوں سے مقابلہ کرے۔

(۴)اگر مذکورہ بالا دونوں صورتوں کالعدم ہوں تو پوری احتیاط کے ساتھ بنیادی نسخہ کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا جائے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ ریسرچ اسکالر کسی دوسرے شخص پر اعتماد کر کے متن کتاب نقل کراتا ہے۔ایسی صورت میں غلطیوں کے امکان زیادہ ہوتے ہیں!لہذا اس سے بچنا چاہیئے۔

منابع وماخذ:(۱)ادبی تحقیق۔۔۔مسائل اور تجزیہ:۔رشید حسن خان

(۲) ادب میں جمالیاتی اقدار ایک مطالعہ:۔ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

(۳)تحقیق وتدوین:۔مرتب سید محمد ہاشم

(۴) تحقیق کے طریقِ کار:۔ڈاکٹر اختر

(۵)اصول تحقیق وترتیب متن:۔ڈاکٹر تنویر احمد

(۶) تاریخ تصوف:۔علامہ اقبال ،مرتب پروفیسر صابر کلوردی

(۷) تاریخ نقد ادب:۔ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب

(۸) تدوین متن کے مسائل:۔(خدا بخش لائبریری جرنل) ☆☆☆

Qaseeda"Mukhbir-ul-israr":ek Mutala by Mohd.Akram(Research Scholar,dept.of persian,Jamia Millia Islamia, New Delhi)

محمد اکرم (ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی)

قصیدا 'مخبرالاسرار' ایک مطالعہ

'مخبرالاسرار' کشمیر میں مغل سلطنت کے آخری دور کے ایک مشہور صوفی شاعر شیخ اکمل الدین بدخشی کی ایک عمدہ اور اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ شیخ اکمل الدین کے دادا اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں ہندوستان وارد ہوئے اور ملازمت اختیار کی اور اس کے بعد شیخ اکمل کے والد عادل بیگ خان شاہجان کے دورہ حکومت میں کشمیر میں ملازمت کی حیثیت سے گئے اور وہی سکونت اختیار کر لی اور یہی کشمیر میں شیخ اکمل الدین کی پیدائش ہوئی۔ عادل بیگ خان کو دربار شاہجانی میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ جب میرزا اکمل پیدا ہوئے تو (۱۶۶۳ء) میں شاہجان بادشاہ کشمیر میں ہی تھا۔ شاہجان نے اس نومولد کا نام کامل رکھا جس کا ذکر تذکرہ خوشنویسان کشمیر میں یوں لکھا ہوا ہے۔

''ملک محمد کے ایک فرزند میرزا عادل خان عہد شاہجانی میں دہلی سے آ کر کشمیر میں آباد ہو گئے تھے میرزا اکمل الدین انہی کے فرزند ہیں۔ آپ کا نام شاہجان بادشاہ کا رکھا ہوا ہے''۔ [۱]

حضرت میرزا اکمل الدین پر اللہ کا خاص فضل وکرم تھا جس کے سبب انہوں نے پندرہ برس کی ہی عمر میں علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کر لیا۔ حدیث، فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور اسی پندرہ سال کی عمر میں وہ اپنے مرشد خواجہ حبیب اللہ عطار کی صحبتوں سے فیضیاب ہو کر تیرہ سال اور نو ماہ کی مدّت تک آپ کی خدمت میں رہے۔ استاد شبیر احمد بٹ اپنی کتاب عین العرفان' میں محمد طیب کا قول لکھتے ہیں کہ۔

''حضرت شیخ اکمل الدین میرزا محمد کامل بیگ خان بدخشی کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف وہ بلند پایہ جامع السلاسل صوفی بزرگ تھے۔ دوسری طرف وہ اپنے زمانے میں ممتاز ادیب، شاعر اور مصلح تھے۔ وہ معرفت خداشناسی، دین اور دینی احکام کی پوشیدہ اور پچیدہ حکمتوں سے صرف آگاہ تھے۔ بلکہ ان کو آشکار کرنے کی ان کو پوری پوری صلاحیت تھی اور آپ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قدرت کے پوشیدہ رازوں کو مخاطب کر کے حسب استعداد و فراست ظاہر کرنے کے لئے

مولوی رومی کی طرف موزون تھے‘‘۔ ۲ ؎

شیخ اکمل الدین اپنے زمانے کے صوفی بزرگ ہونے کے ساتھ مغل دور کے ایک بڑے صوفی شاعر تھے جھنوں فارسی زبان وادب میں چار جلدوں پر مشتمل ’بحرالعرفان‘ کے نام سے ایک مثنوی اور ’مخبرالاسرار کے نام سے ایک قصیدا لکھا۔شیخ اکمل الدین کی یہ تصانیف کشمیر میں مغل سلطنت کے آخری دور کے فارسی زبان وادب کو زندہ رکھنے کے لئے نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔مخبرالاسرار شیخ اکمل الدین بدخشی کا ایک صوفیانہ قصیدا ہے جو فارسی زبان وادب میں ایک بہترین کارنامہ ہے۔

شیخ اکمل الدین نے یہ قصیدا کسی بادشاہ کی مدح، یا کسی سے انعام واکرام کے لئے نہیں لکھا ۔اس قصیدے کا آغاز بدخشی نے حمد باری تعالی سے کیا ہے۔حمد باری میں اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے بدخشی لکھتے ہیں۔

شکر اللہ چہ خوست دولت یادنہ دارم تادرین منزل ویرانہ چنین آبادم
ہرچہ موصوفم واوصاف جمیل من است ازکجا آمدم وہر چہ بود نیادم ۳ ؎

س کے بعد شیخ اکمل الدین بدخشی رسولؐ کا ذکر کرتے ہوئے اُمت رسولؐ کی سب امتوں پر برتری کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ رسولؐ کی امت سب سے افضل اُمت ہے۔

مصطفی رحمت عالم کہ بودشایدم بہراو گنج پنہان دوجہان بگشادم
اُمتش افضل واکرم زہمہ ہی ہاست بسکہ براُمت اوفضل وکرامت دادم ۴ ؎

بعدازان شیخ اکمل الدین بدخشی نے اس قصیدے میں معراج رسولؐ کا ذکر کرنے کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ ،حضرت عثمان غنیؓ ،حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذکر کے بعد حسن بصرٰ ی کا ذکر بھی کیا ہے۔شیخ اکمل الدین بدخشی کا یہ قصیدا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔امام حسن وامام حسین کا ذکر کرتے ہوئے بدخشی لکھتے ہیں۔

ہم حسین است کہ بعدازحسن آمد درپیش بخلافت زپدرکرد بحق ارشادم ۵ ؎

اسی طرح شیخ اکمل الدین نے اس قصیدے میں امام جعفر صادق، امام موسیٰ کاظم، امام حسن العسکر ی کے ذکر کے بعد صوفی بزرگ جس میں شیخ بوعلی، شیخ عثمان، عبدالرحمن کا ذکر بھی کیا ہے۔

بعداومرشداین راہ عبدالرحمن نورالدین شدبلقب ھست چنین ارشادم ۶ ؎

دیگر صوفی بزرگوں مثلاً شیخ علاالدولہ، شیخ شرف الدین محمود، شاہ ہمدان، شیخ کشمیر شیخ نورالدین کے علاوہ کچھ بزرگوں کے ذکر کے بعد اپنے پیرومرشد شیخ حبیب اللہ کے ذکر تک بدخشی

پہنچتے ہیں۔اپنے پیرومرشد کا ذکر کرتے ہوئے بدخشی لکھتے ہیں۔

شیخ من مرشد دین شیخ حبیب اللہ است گفت اوخرقہ دین حضرت قاسم دادم ۷؎

اکمل الدین کا لقب بدخشی نے اپنے پیرومرشد سے حاصل کیا جس کا ذکر وہ اپنے اس قصیدے میں کرتے ہیں۔

اکمل الدین لقبم کردز احسان مرشد چونکہ بسیار خاک دراوافتادم ۸؎

تذکرہ خوشنویسان کشمیر اور پروفیسر سروری کی کتاب 'کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ' میں لکھا گیا ہے کہ شیخ اکمل الدین کامل کے والد عادل بیگ خان کو دربار شاہجانی میں بڑی قدر ومنزلت تھی۔جب میرزا اکمل پیدا ہوئے تو (۱۶۶۳ء) میں شاہجان بادشاہ کشمیر میں ہی تھا۔شاہجان نے اس نومولد کا نام کامل رکھا۔شاہجان کے نام رکھنے کا ذکر بھی بدخشی نے اپنے اس قصیدے میں کیا ہے۔

کاملم شاہجان نام نہادہ آنروز کاندرین دارفنا کردخدا میلادم ۹؎

اکمل الدین لکھتے ہیں کہ میں اپنے مرشد کے در کی خاک کو اپنے سر اور آنکھوں میں جھونکتا رہا پھر جا کر میں بالغ ہوا اور میں نے عقل کی آنکھیں کھولی یعنی میں ایک مدت تک اپنے پیرومرشد کے ہمراہ رہا تب جا کر مجھے حقیقی دنیا کی واقفیت ہوئی اور مجھے ہوش آیا کہ اصل کیا ہے۔بدخشی میں جو یہ تصوف کا رنگ نمایاں دکھائی دے رہا ہے یہ سب بدخشی پر اس کے پیرومرشد کی عنایتیں ہیں۔

خلعت فقر کہ فخر است مرا بخشیدند چون بخاک درمرشد سرخود بنہادم

سالہا خاکدرش رابمژگان رفتم تا کہ بالغ شدم وچشم خرد بگشادم

دیدمرشد کہ شدم پختہ وآمادہ بکار وزہمہ قیدتعلق زجہان آزادم ۱۰؎

بحر العرفان کہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ 'بحر العرفان' شیخ اکمل الدین کامل کی ایک مثنوی ہے۔مثنوی کی یہ مثنوی چار جلدوں پر مشتمل ہے۔اس کا ذکر بھی بدخشی نے اپنے اس قصیدے میں کیا ہے کہ بحر العرفان میرے جسم سے نکلا ہوا ایک قطرہ ہے یعنی یہ میرا ایک چھوٹا سا کارنامہ ہے لیکن اس چھوٹے سے کارنامے میں نے لاکھوں راز کے دروازوں کو کھول دیا ہے۔بدخشی نے اس چھوٹے سے کارنامے میں لاکھوں راز بیان کئے ہیں۔

بحر العرفان کہ بخوش آمدہ ازتن یک قطرہ صد ہزاران در اسرار بدست افتادم ۱۱؎

اکمل الدین بدخشی اس قصیدے درس دیتے ہیں کہ علم کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے۔جس کی مثال وہ ابلیس سے دیتے ہیں کہ ابلیس کا علم اس کا جہالت کا سبب بنا کیونکہ اس نے آدم زاد

سے سر پھیر لیا کہ میں آدم زاد نہیں ہوں۔اس لئے علم کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے۔علم کے عمل کا درس ہندوستان میں لکھی جانے والی پہلی تصوف کی کتاب 'کشف المحجوب' سے ہمیں ملتا ہے۔بدخشی کا یہ جملہ شاید سید علی ہجویری کی اس کتاب سے ہی ہے۔آخر یہ کہ بدخشی علم کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں جو انسان کے لئے ضروری بھی ہے۔

علم ابلیس کہ شد منشاء جہل زحد تافت سر زآدم من نیز نہ آدم زادم

علمداری و عمل کن عملت از دیدہ است دیدہ بگشای کہ نادادہی بردارم ۱۲ 11ے

بالآخر یہ کہ میرزا اکمل الدین کامل بدخشی کا یہ قصیدا بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ پایہ ہے جس میں بدخشی نے بہت ہی عمدہ طور طریقے سے کام لیا ہے۔میرزا اکمل الدین بدخشی کا ایک اہم کارنامہ ہے جو کشمیر میں مغل سلطنت کے آخری دور کے فارسی ادب کو زندہ رکھنے کے لئے نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

حوالاجات:

۱:،تذکرہ خوشنویسان کشمیر، پروفیسر مولوی محمد ابراہیم۔ص ۳۸۔

۲:عین العرفان، استاد شبیر احمد بٹ۔ص نمبر ۱۵۔

۳:مخبر الاسرار نسخہ خطی ،اکمل الدین بدخشی،فولیو نمبر ۲۔

۴:ایضاً ۳۔۔،۵:ایضاً۔ ۴۔۔،۶:ایضاً ۔

ُ۷ تا ۱۲: ایضاً۔۵۔۷اور ۱۲۔

کتابیات

۱: پروفیسر سروری، کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ ، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب مدینہ چوک سرینگر۔ ۲۰۱۲ء۔

۲:عبدالوہاب نوری، عین العرفان، محقق و مدون استاد شبیر احمد بٹ، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب مدینہ چوک سرینگر۔ ۲۰۱۷۔

۳: شیخ اکمل الدین کامل ،قصیدا مخبر الاسرار نسخہ خطی ، اکاؤنٹ نمبر ۱۰۳۰ اورینٹل ریسرچ لائبریری سرینگر۔

☆☆☆

Ghalib ki Shairi mein Tasawwur-e-Hayat by Ishtiyaq Ahmad(dept. of Urdu,University of Jammu,Jammu)cell-6006512876

اشتیاق احمد (شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

غالب کی اردو شاعری میں تصوّر حیات

شاعری کی دنیا میں غالب ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے بالکل منفرد و ممتاز مقام کے حامل ہے۔ غالب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے قصیدہ، مرثیہ وغیرہ اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن انہیں دیگر اصناف میں وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جو غزل گوئی میں ہوااور یہی صنف ان کے لئے حیات جاوداں پانے کا سبب بنی۔ غالبؔ کی شاعری میں عشق و عاشقی، فلسفہ وتصوف، فکر معاش، فکر روزگار وغیرہ موضوعات ملتے ہیں۔ لیکن زیر نظر مضمون کا علاقہ غالبؔ کی اُردو شاعری میں تصور حیات سے ہے۔ چونکہ غالبؔ کا تصور حیات تصوف پر مبنی ہے اس لئے ان کے صوفیانہ خیالات کے بارے میں جاننا بھی ضروری ہے۔ تصوف کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ’’برائے شعر گفتن خوب است‘‘۔ الطاف حسین حالی ’یادگار غالب‘‘ میں غالب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالبؔ کو علم تصوّف کی طرف خاص مناسبت تھی حقائق ومعارف کی کتابیں اور رسالے ان کے مطالعے سے گزرے تھے۔ حالانکہ غالبؔ خوداپنے عقیدۂ توحید کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

’’اگرچہ میرے گناہ ایسے ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں۔ ہمیشہ تنہائی اور سلوک کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں: لا الٰہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثّر فی الوجود الی اللہ‘‘۔ ۱

غالبؔ اسلام کی حقیقت پر پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگر چہ عملی طور یا بظاہر ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن ان کی شاعری اور خطوط میں اس طرح کے خیالات جا بجا ملتے ہیں۔ غالبؔ اپنے موحد ہونے کا دعوی بہ بانگ دہل کیا کرتے ہیں ، انہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت بالخصوص حضرت علیؑ سے بہت عقیدت تھی اور مسلک کے لحاظ سے شیعہ تھے۔ الطاف حسین حالیؔ اُن کے عقائد کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

’’اگر چہ غالبؔ کا مذہب صلح کل تھا، مگر زیادہ تر ان کا میلانِ طبع تشیّع کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور جناب امیر کو وہ رسول خدا (صلعم) کے بعد تمام امت سے افضل جانتے تھے۔‘‘ ۲

غالب کا عقیدہ یہ ہے خدا ایک ہے اور اس میں دوئی کا شائبہ تک بھی نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں دکھائی دیتا۔ غالبؔ کا نظریہ وحدت الوجود کا نظریہ ہے۔ان کے مطابق جس طرح ہر قطرہ میں سمندر ہونے کا راز نہاں ہے اسی طرح انسان میں خدا سے نسبت ہونے کے اسرار و موز پوشیدہ ہیں

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

غالب اس زمانے کے شاعر ہیں جب برصغیر میں نظریہ تصوّف لوگوں کے عقائد کے ساتھ ساتھ اصناف شاعری کا جز ولاینفک بن چکا تھا شائد یہی وجہ ہے کہ عشقیہ اور فلسفیانہ مضامین کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی تصوّف کو بھی پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔کلام غالبؔ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ باضابطہ صوفی تھے نہ فلسفی البتہ غالبؔ کے خیالات جتنے صوفیانہ تھے اتنے ہی فلسفیانہ بھی۔وہ ایک طرف جہاں صرف ایک خدا کے وجود کے قائل ہیں وہیں دوسری جانب قدرت خداوندی کے مناظر کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے اور سوالات قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چونکہ غالبؔ میں تفکر کی بے انتہا صلاحیت ودیعت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں فکری عناصر کی بہتات پائی جاتی ہے۔انہوں نے اُردو شاعری کو سوچنے کا سلیقہ اور طریقہ سکھایا ہے۔فلسفیانہ موضوعات کو اردو شاعری سے متعارف کرایا۔غالبؔ اگرچہ تصوّف اور وحدت خداوندی کے قائل ہیں لیکن اس کے باوجود قدرت خداوندی کے تعلق سے کئی سوالات ان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔وہ خالقِ کائنات سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں کہ جب تمہارے بغیر کسی کا وجود نہیں تو پھر دنیا کی رونق اور چہل پہل، یہ حسین اور خوبصورت لوگ، ناز و ادا، خم زلف عنبریں، سرمئ چشم، بادو باراں، گل وبلبل، باغ و بہار میں کس کا وجود پوشیدہ ہے۔یعنی ان کا بھی کوئی وجود ہے یا پھر یہ بھی خدا کے وجود کا ہی حصہ ہیں۔اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ وعشوہ و ادا کیا ہے

غالب کی شاعری میں جہاں عشق و عاشقی اور فلسفہ وفکر کا بیاں ملتا ہے وہیں انسان کی عظمت اور زندگی کی حقیقت کے حوالے سے بھی متعدد اشعار دیکھنے کو ملتے ہیں۔غالبؔ کی شاعری میں زندگی یا حیات کا جو تصور ملتا ہے اس کی بنیاد تصوف یا وحدت الوجود پر ہے۔تصوف اپنے محبوبِ حقیقی سے ملنے کے شدید اشتیاق اور فنا فی اللہ کا دوسرا نام ہے۔اور اس کا مقصد یقین و معرفت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہونا ہے۔وحدت الوجود ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے مطابق حقیقی وجود صرف خدا کا ہے اور باقی مخلوقاتِ

کائنات اس کی پرچھائیاں ہیں۔یعنی انسان اور کائنات کا وجود عارضی اور ناپائیدار ہے اور ہر شے میں اور ہر جگہ پہ خدا موجود ہے۔غالبؔ کے مطابق انسان جب جسد خاکی کی صورت میں روئے زمیں پہ وارد نہ ہوا تھا تو وہ خدا کے وجود کا حصہ تھا۔جب اس نے صورت بشر اختیار کی گویا وہ وجود حقیقی جدا ہو گیا اور یقیناً اگر انسان نہیں ہو ہوتا تو خدا ہوتا۔ان کا ماننا ہے کہ انسان کو وجود خاکی بخشنے کے پیچھے جو راز مضمر تھا وہ یہ کہ حسن ازل وحسن خود بیں کو اپنے حسن کا مشاہدہ یا نظارہ کرنا مقصود تھا۔اس حوالے سے ایک شعر:

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

غالبؔ نے زندگی میں گوناگوں مصائب اور پریشانیاں دیکھی ہیں۔تین دفعہ جیل جانا پڑا، وظیفہ بند ہو گیا،نعمت اولاد سے محروم ہوئے، زمانے کی ناقدری کے شکار ہوئے،معاشی بدحالی سے دوچار ہوئے پھر نا امید کا دامن نہیں چھوڑا اور یاسیت ان کے قریب تک نہ پھٹک پائی۔ان سبھی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے طرز خاص میں معبود حقیقی سے شکوہ کرتے ہیں۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہو

شاید انہیں حالات کے بہ سبب غالبؔ انسان اور دیگر مخلوقاتِ کائنات کو بے بس اور بے اختیار سمجھتے ہیں۔ان کے مطابق ہر تخلیق اپنے مخلوق کی محتاج اور ہر پیکرِ تصویر کا پیرہن ناپائیدار ہے۔ وہ زندگی کو شتر بے مہار سمجھتے ہیں جو بڑی تیز رفتاری سے رواں دواں ہے اور انسان اسے روکنے یا قابو پانے پہ قادر نہیں۔اُن کے مطابق انسان دنیا میں آتے ہی دام سخت میں قید ہو جاتا ہے اور پھر ہر لمحہ موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ بے چارگی کی علامات اس کے چہرے پہ ہر وقت عیاں رہتی ہیں۔ایک شعر ملاحظہ فرمائے:

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

غالبؔ کو بعض اوقات انسان کی تمام کوششیں لاحاصل اور بے سود معلوم ہوتی ہیں۔وہ انسان کو ایک ایسا مرغ اسیر سمجھتا ہے جو پنجرے میں رہتے ہوئے آشیانہ بنانے کے لئے گھاس پھوس جمع کر رہا ہو۔یعنی دنیا کے قید خانے اور موت کی گھات میں رہنے کے باوجود انسان اپنی بود و باش اور رہن سہن کے لئے کوششیں کرتا ہے۔غالبؔ کے نزدیک دنیا اور دنیا کی زندگی مختلف خیالات ونظریات کے جال کا ایسا حلقہ ہے جو کبھی بھی دھوکہ دے کر انسان کو شکار بنا سکتا ہے۔غالب کہتے ہیں کہ دوران زندگی دل کا غموں سے مفر بہت مشکل ہے اگر غم عشق سے نجات ملے تو غم روزگار گلے پڑ

جا تا ہے۔اسی طرح ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں کہ جس طرح شمع کے نصیب میں تا دم صبح جلنا ہوتا ہے اسی طرح انسان کو بھی تا دم مرگ غموں، پریشانیوں اور مصیبتوں کی آگ میں جلنا مقدور ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ　　　عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا ہے کہ غالب قنوطیت پسند تھے بلکہ غالبؔ زندگی کے رنج و آلام سے نہ خود مایوس ہوتے ہیں نہ اوروں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ وہ اپنے خیالات کو اشعار کے سانچے میں پیش کرتے ہوئے دنیا والوں کو حیات و کائنات کی حقیقت سے روشناس کرتے ہیں۔ غالبؔ مصائب و مسائل کے روشن پہلو بھی ملحوظ خاطر رکھتے ہیں۔وہ درد کی انتہا کو دائمی خوشی کا سبب سمجھتے ہیں کیونکہ جب درد کی انتہا ہوتی ہے تو انسان عالم آب و گل سے دوسرے عالم ارواح میں منتقل ہو کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملتا ہے۔غالبؔ کے شاعری میں زندگی کا جو تصور ملتا ہے وہ اقبال اور میرؔ سے قدرے مختلف ہے۔ جہاں کلام اقبال میں رجائیت کے عناصر کی بھر مار ملتی ہے اور کلام میر میں قنوطیت کی پرچھائیاں جا بجا ملتی ہیں ۔ اقبال موت کو ارضی یا عارضی زندگی اور دائمی زندگی کے درمیان محض ایک مختصر وقفہ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے دوام کے قائل ہیں۔وہ زندگی سے متعلق جو تصور رکھتے ہیں اس کی بنیاد ''فلسفہ خودی'' پر ہے۔اقبالؔ ''ساقی نامہ'' کے ایک بند میں فرماتے ہیں کہ زندگی سود و زیاں سے بڑھ ایک ایسی شے کا نام ہے جسے روز شب یا مہینوں یا برسوں کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا ہے۔ ۴ ان کے برعکس میرؔ کے اشعار سے حزن و ملال کی کیفیت دور سے ہی جھلکتی ہے۔میرؔ زندگی سے بیزار نہیں لیکن ان کا غم یاسیت کی سرحد کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔مجنوں گورکھپوری کے بقول وہ درد کو سرور اور الم کو نشاط بنا دیتے ہیں۔لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ میرؔ کے اشعار میں حزنیہ عناصر کی آمیزش ہے۔ ۵

تو اسے پیمانہ امروز فردا سے نہ ناپ　　　جاودان پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی (اقبال)

الٹی ہو گئی سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　　دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا (میر)

اوپر دیئے گئے نمونہ کلام سے معلوم ہوتا ہے اقبالؔ کے کلام میں نشاطیہ عناصر پائے جاتے ہیں جبکہ میرؔ کے کلام میں حزنیہ۔اور غالبؔ اپنی شاعری میں زندگی کے تعلق سے جو نظریہ رکھتے ہیں اس میں ہر دو طرح کے عناصر کا امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔غالبؔ ارضی زندگی کی ناپائیداری کو عین فطرت سمجھتا ہے۔ان کے مطابق جس طرح شبنم کا وجود سورج کی کرن پڑنے تک ہوتا ہے اسی طرح انسانی زندگی کا وجود مالک حقیقی کی نظر عنایت ہونے تک ممکن ہے۔وہ زندگی کو چنگاری کی طرح ناپائیدار سمجھتے

ہیں جو چند لمحوں کے لئے فضا میں رقص کرتی ہے اور گر کر راکھ ہو جاتی ہے۔لیکن اگر دوسرے زوایئے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب زندگی کے دائمی صورت کے بھی قائل ہیں لیکن یہاں انسان کا اپنا انفرادی وجود مقصود نہیں بلکہ خالق حقیقی کے وجود ہے جس میں ایک انسان کا وجود ضم ہو کر دوام پالیتا ہے۔انسان جسد خاکی کی صورت میں کچھ عرصہ تک دنیا میں رہتا ہے اور بعد ازآں اپنے اصلی وجود سے مل کر دائمی صورت اختیار کرتا ہے۔غالبؔ زندگی کی ناپائیداری،مصائب روزگار اور دنیا کی ناقدری کی انتہا جیسے عوامل پر غور کر کے اگر چہ غمگین ہوتے بھی ہیں لیکن اس کا اظہار اپنے اشعار میں صراحت کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ تاویلیں پیش کر کے غموں کو خوبصورت بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غالبؔ اگر چہ ایک طرف زندگی کو مختصر سمجھتے ہیں لیکن مصائب وآلام کی شدّت کی بنا پہ انہیں اس مختصر سی زندگی کو جینا ناگوار گزرتا ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ آدمی سے انسان بننے کا سفر اگر چہ آسان ہے لیکن اس سفر میں بھی انسان کو گوناگوں مشکلات درپیش رہتی ہیں کیونکہ کشمکش بھری زندگی جی کر پرفیکشن لانا،بارش کے قطرے کا سمندر کی موجوں میں پوشیدہ سینکڑوں مگرمچھوں سے اپنا وجود بچا کر موتی بننے کے مترادف ہے۔آخر پہ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ زندگی کے غموں اور مصائب کا علاج موت کے بغیر ممکن نہیں اور موت کو خوش بختی اور درد کی دوا سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

زندگی کے متعلق غالبؔ کا نظریہ قائم ہونے میں تصوّف اور مصائبِ زندگی کا بہت عمل دخل رہا ہے۔لیکن وہ زندگی کے مصائب سے تنگ آکر گوشہ نشینی اختیار نہیں کرتے ہیں بلکہ اُن کا سامنا کرتے ہیں۔وہ زندگی کو محنت ومشقت بھرا سفر سمجھتے ہیں۔اور زندگی اس خیال سے جیتے ہیں کہ شمعِ حیات کو موت کی صبح تک ہر حال میں جلنا ہے اور دائمی سکون اور خوشی اسی وقت نصیب ہوگی جب قطرہ سمندر میں فنا ہو کر اپنی اصل سے مل جائے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا　　درد کا حد سے گزر جانا ہے دوا ہو جانا

کتابیات وحوالہ جات: 1۔ یادگار غالبؔ،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،جامعہ نگر،نئی دہلی،۲۰۱۷ء،ص۔ ۶۴

۲۔ یادگار غالبؔ،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،جامعہ نگر،نئی دہلی ۲۰۱۷ء،۸۶۔۸۵

۳۔شرح دیوان غالب،شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۹ء

۴۔کلیات اقبال مع فرہنگ،مرتبہ خواجہ عبدالحمید یزدانی،کتابی دنیا دہلی،۲۰۱۱ء

۵۔انتخاب کلیات میرؔ،مرتبہ فاروق ارگلی،فرید بکڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، ۲۰۱۴ء☆☆☆

Jammu Kashmir ke Gujjar Bakarwaal tabqe mein Muflisi ke asbab

by 1-Maqsood Ahmed(Research Scholar,Centre for the study of social Exclusion and Inclusive)2-Mohd. Mushtaq(Research Scholar dept.of education & training)MANUU, Hyderabad

مقصود احمد (ریسرچ اسکالر، البیرونی مرکز برائے مطالعات سماجی اخراج وشمولیتی پالیسی)

محمد مشتاق (ریسرچ اسکالر، شعبۂ تعلیم وتربیت) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

جموں وکشمیر کے گوجر بکروال طبقے میں مفلسی کے اسباب

خلاصہ:

تیز رفتار اقتصادی ترقی اور سماجی شعبے کے پروگراموں کے لیے ٹیکنالوجی کے استعمال نے ملک میں انتہائی غربت کو کم کرنے میں مدد کی ہے۔ تیز رفتار ترقی اور ترقی کے باوجود، ہماری آبادی کا ناقابل قبول بڑا حصہ شدید اور کثیر جہتی محرومیوں کا شکار ہے۔ اس طرح، ہندوستان میں غربت کے خاتمے کے لیے ایک زیادہ جامع نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔ اور بالخصوص جموں وکشمیر کے قبائلی طبقے گوجر بکروال پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس مطالعے کا اہم مقصد جموں وکشمیر کے گوجر بکروال طبقہ میں غربت کے اسباب کی جانچ کرنا ہے۔ موجودہ مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ جموں وکشمیر کے خانہ بدوش گوجر اور بکروال قبیلے کے لیے تعلیم حاصل کرنا نہائت ہی ضروری ہوگئی ہے۔ کیونکہ لوگ ترقی کی راہ پر گمزن ہیں لیکن خانہ بدوش گوجر اور بکروال تعلیم کے معاملے میں بہت پسماندہ ہیں۔ بنیادی جانکاری اور اعداد وشمار کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت مخصوص ہو رہی ہے۔ اور ان چیزوں کو سمجھنے کی اشد ضرورت ہے، جوان کے پیشہ وارانہ کرداروں کو متاثر کرتی ہیں جیسے ریاستی اور ملکی سطح پر صحت اور تعلیم پر بنائی گئی بہت سی ایسی پالیسیاں ہیں جن سے قبائیلی لوگ کوسوں دور ہیں۔ اگر جموں وکشمیر کے لوگ تعلیم یافتہ ہوں گے تو وہ بھی ایک اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جموں وکشمیر میں غربت دور کرنے کے لیے تقسیم کاری چینل کو مضبوط ہونا چاہیے۔ بڑے پیمانے پر استعمال کی جانے والی اشیاء اور اناج وغیرہ کو پہلے غریب آبادی میں تقسیم کیا جانا چایئے جو کے غریب طبقہ گوجر اور بکروال تک ابھی بھی نہیں پہنچ پاتی۔ موجودہ عوامی تقسیم کاری کے نظام کو دوبارہ منظم کیا جانا چاہیے اور اسے جموں وکشمیر کے دیہی اور نیم شہری علاقوں تک پھیلایا جانا چاہیے۔ انتظامیہ کو پسماندہ علاقوں میں نجی سرمایہ کاری کو

راغب کرنے کے لیے خصوصی سہولیات اور رعایتیں پیش کرنی چاہئیں۔ حکومت کو غریبوں کی ضروریات کا بھی خیال رکھنا چاہیے، جیسے پینے کا پانی، بنیادی طبی دیکھ بھال، اور بنیادی تعلیم وغیرہ۔ عوامی طبقہ کو غریبوں پر فراخدلی سے خرچ کرنا چاہیے تاکہ کم از کم ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

کلیدی الفاظ: جموں وکشمیر، گوجر بکروال، قبائلی طبقہ، غربت کے اسباب، تعلیمی نظام

تعارف: ہندوستان بے شمار ثقافتوں اور مختلف ذات پات کے لوگوں کی سرزمین ہے جو ملک کے کونے کونے میں رائش پزیر ہیں اور دنیا بھر میں اپنے ملک کی زنیت کو پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک ہندوستان میں ایک قبائلی طبقہ قیام پزیر ہےجو جغرافیائی اور ثقافتی طور پر ملک کے دوسرے طبقوں سےمختلف ہیں اور مختلف سماجی اور معاشی ترقی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ملک میں ان کی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی نشاندہی کے لئے متعدد کمیشن اور کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں ان کمیٹیوں نے قبائلی علاقوں میں موجودہ سماجی ومعاشی عدم توازن کو ختم کرنے کے لئے متعدد اقدامات کی سفارش کی ہے۔ جیسے پانچ سالہ منصوبے سے قبائلی آبادی کو فائدہ پہنچانے کے لئے اور مختلف قسم کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے متعدد پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ ان کوششوں کے باوجود یہ قبائلی طبقہ اپنے معاشی، سماجی، سیاسی، تعلیمی، معیار زندگی اور صحت کے شعبوں کی اصلاح میں امتیازی سلوک کا مظاہرہ کرر ہے ہیں۔ اس بات پر اتفاق رائے پائی جاتی ہے کہ ناخواندگی، علیحدگی، دور درازی، غریبی اور پسماندگی کی وجہ سے قبائلی لوگوں کی نمایاں ترقی کی حالت مسلسل خراب رہی ہے۔ یہ قبائلی لوگ مال مویشی کو پالنے، پہاڑی اور گھنے جنگلات والے علاقوں تک ہی محدود ہیں، جو سماجی ومعاشی طور پر پسماندہ ہیں اور ملک میں جاری ترقیاتی عمل سے متاثر نہیں ہوئے ہیں۔ ملک میں قبائلی لوگوں کے ترقیاتی مسائل کا مطالعہ کرنے کے لئے مختلف محققین کی طرف سے ایک مربوط کثیر الجہتی نقطہ نظر اپنایا گیا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قبائلیوں کی پسماندگی کے مختلف مسائل ہیں، جو بنیادی طور پر کثیر جہتی عوامل جیسے ان کی رہائش گاہ، دور دراز علاقے، ماحولیاتی طور پر متغیر مقامات، ناخواندگی، غربت، تنہائی، توہم پرستی اور لاعلمی پر مشتمل ہیں۔ پورے ہندوستان میں قبائلی معاشرہ سماجی اور معاشی طور پر مرکزی دھارے کے ہندوستانی معاشرے سے الگ تھلگ ہے جب کہ قبائلی علاقوں میں ترقیاتی اور تحفظ کی سرگرمیوں کو زیر بحث نہیں لایا گیا۔

جموں وکشمیر میں گجر اور بکروال قبیلہ: جموں وکشمیر کے گجر اور بکروال نیم خانہ بدوش ہیں اور یونین ٹیریٹری کے لگ بھگ تمام حصوں میں آباد ہیں۔ گوجر اور بکروالوں کی معیشت عام طور پر مال مویشی

پالنے پر منحصر ہے جبکہ کچھ زرعی سرگرمیوں میں بھی شامل ہیں، یہ طبقہ خوراک اور چارے کی تلاش میں موسمی ہجرت کرتے ہیں۔ جو سال میں دو بار اپنے مال مویشیا ور اہل خانہ کے ساتھ ہجرت کر کے سبزا زار جنگلوں میں جاتیہیں جہاں موسم گرما کی چراگاہوں میں وہ اپریل سے اکتوبر کے درمیان پانچ سے چھ مہینے گزارتے ہیں، جس کو یہ لوگ اپنی مادری زبان میں ڈھوک بولتے ہیں۔ سردیوں میں وہ اپنے اپنے گھروں میں میدانی علاقوں میں لوٹاتے ہیں۔ بنیادی طور پر سبھی گجر اور بکروال چرواہے کی معیشت میں مصروف رہتے ہیں لیکن حال ہی میں انہوں نے زراعت میں بھی قدم رکھا ہے۔ جموں و کشمیر کے گوجروں اور بکروالوں کی کئی ذیلی ذاتیں ہیں۔ سماجی سطح پر یونین ٹیراٹری جموں وکشمیر کے گجروں اور بکروالوں نے اپنے آپ کو تین اہم گروہوں میں تقسیم کیا ہوا ہے جیسے۔ ڈیرا (گھرانہ)، دادا پوترہ (نسب) اور ذات (نسل)۔ بنیادی طور یہ خاندانی گھر کو "ڈیرا" یا گھر کہتے ہیں جو شوہر، بیوی، بچوں اور بوڑھے والدین پر مشتمل ہے۔ دادا پوترہ نسبی گروپ ایک خاندانی رشتہ داروں پر مشتمل ہے جو سات نسلوں تک کے مشترکہ آباؤ اجداد سے تعلق رکھتا ہے یہ گوتر یا نسل گوجروں کے درمیان عام عقیدے پر مبنی گروہ ہے۔ گوجر اور بکروال قبائل زیادہ تر جموں صوبے کے ضلع پونچھ، راجوری اور کٹھوعہ میں مرکوز ہیں اور وادی کشمیر میں وہ زیادہ تر اننت ناگ، بارہمولہ، پلوامہ، کولگام اور کپواڑہ اضلاع میں پائے جاتے ہیں۔ یونین ٹیریٹریجموں وکشمیر کے دیگر لوگوں کے مقابلیمیں قبائلی آبادی کی اکثریت بدتر حالات میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ ذریعہ معاش، رہائش، صحت کی دیکھ بھال، تعلیم وترقی وغیرہ جیسی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ دور افتادہ علاقوں میں زیادہ تر قبائلی بستیوں میں ابھی تک بجلی اور سڑک رابطہ جیسی سہولیاتفراہم نہیں ہیں۔ قبائلی ترقی کے نام پر ہر سال کروڑوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں، مختلف پالیسیاں اور پروگرام بنائے جاتے ہیں لیکن بنیادی سطح پر صورتحال تبدیل نہیں ہوتی۔

گجر بکروالوں کے رہن سہن کے حالات معاشرے کے دوسرے طبقوں سے مختلف ہیں۔ انہیں مزید مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنا سامان اور دیگر ضرورت کی اشیاء گھوڑوں پر لاد کر لے جاتے ہیں اور پیدل چل کر دور دراز علاقوں میں جنگلوں اور اونچے پہاڑوں پر پہنچتے ہیں۔ وہ اپنی بھیڑ بکریوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں جو کوئی آسان کام نہیں ہے۔ انہیں جنگلی جانوروں سے بچانے کے لیے بار بار اپنے ریوڑ کی انگلیوں پر گنتی کرنی پڑتی ہے، تاکہ کوئی بھیڑ یا بکری کسی دوسرے جھنڈ میں شامل نہ ہو جائیاور بکھرنے کا بھی خدشہ رہتا ہے۔ مختلف بیماریوں سے بروقت مویشیوں کا

علاج کرنا اور ان لوگوں کے روزانہ کی بنیاد پر کیے جانے والے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ یہ کچھ مشکلات ہیں جن کا انہیں روزانہ سامنا کرنا پڑتا ہے، جو دوسروں طبقے کے لوگوں سے مشکل کام ہے۔ یہ کھلے آسمان تلے ایک ساتھ دن اور رات گزارتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اپنے گھروں میں اپنی آرام دہ زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لہٰذا، یہ واضح ہے کہ جموں وکشمیر کے قبائلی لوگوں کو نہ صرف پائیدار ذریعہ معاش کی ضرورت ہے، بلکہ صحت کے دیکھ بھال کی مناسب سہولیات تک مناسب رسائی کی بھی ضرورت ہے، کیوں کہ، ناخوندگی، لاعلمی، پسماندگی اور بیماری ایک ساتھ مل کر چاروں طرف غربت کا ایک مکروہ چکر پیدا کرتے ہیں۔ غربت کے زیادہ واقعات کی وجہ سے، قبائلی مختلف بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لئے مناسب کیلوری، غذائیت اور وٹامن حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اس میں اضافہ کرنے کے لئے، غربت سال بھر مختلف موسمی اور مقامی بیماریوں کی وجہ سے ان کی آمدنی کی صلاحیت کو مزید کم کر دیتی ہے۔

جموں وکشمیر میں قبائلیوں کیا بادیاتی پروفائل: جموں وکشمیر میں مختلف قسم کے لوگ رہتے ہیں اور سب سے زیادہ قبائلی لوگ دیکھے جا سکتے ہیں۔ جو کشمیری اور ڈوگرہ برادری کے بعد تیسرا بڑا طبقہ ہے اور یونین ٹیریٹری کے مختلف جغرافیائی علاقوں میں پھیلے ہوئےہیں۔ مردم شماری 2011 کے مطابق گجر بکروال قبائلی طبقہ کی مجموعی آبادی 11.9 فیصد ہیں۔ یہاں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کیو نکہ اس طبقہ کے لوگ ترقی کے ہر پہلو میں پسماندہ ہیں۔ چاہے وہ سماجی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی صور تحال کیوں نہ ہو۔ جموں وکشمیر بہت سے قبائلی گروہوں کا ایک ٹھکانا ہے جو دیہاتوں پہاڑوں اور جنگلوں میں آباد ہیں۔ قبائلی عوام اور ان کے مقامات، ان کی روایات، ثقافت اور ان کے مواصلات کا ذریعہ ہیں جو جموں وکشمیر کے قبائلی ابادی کو باقی ہندوستان کے قبائلی لوگوں سے الگ کرتے ہیں۔ جموں وکشمیر کے آئین نے مقرر کردہ قبائلیوں کے طور پر بارہ (12) قبائلی طبقوں کو شامل کیا ہے۔ جس میں آٹھ کمیونٹی جیسے، بالٹی، بوٹ، بیٹی، بروپا، گرارا، چانگپا، موزن، پورگیپلان کو یہ حیثیت 1989 میں دی گئی تھی۔ اور گجر، بکروال، گدی اور سپی قبائلیوں کو مقرر کردہ قبائلیوں کی حیثیت کے طور پر شیڈول شدہ قبائل آرڈر (ترمیم) اور 1991 ایکٹ کے مطابق مطلع کیا گیا تھا۔ مردم شماری 2011 کے مطابق جموں وکشمیر میں شیڈول شدہ قبائلیوں کی مجموعی آبادی لگ بھگ چار لاکھ ہے، جس میں یونین ٹیریٹریکے کل قبائلیوں کی آبادی 11.9 فیصد اور ملک کی مجموعی قبائلی آبادی میں 43.1 فیصد شمولیت ہے۔ گجر اور بکروال قبائلی لوگوں کی زیادہ تر آبادی صوبہ جموں کے ضلع پونچھ، راجوری اور

کٹھوعہ میں پائی جاتی ہے۔ اس فیصد میں سے اکثیریت میں گوجر کمیونٹی سے تعلق رکھنے والی اابادی ہے۔ اور یہ طبقہ یونین ٹیریٹری کے سب سے زیادہ مقبول قبائلی طبقہ ہے۔ گدی اور پسی بھی قبائلی برادری کا ایک اچھا حصہ ہیں یہ تمام طبقہ بعض مخصوص حقوق کے حقدار ہیں۔ جو حکومت کی طرف سے یقینی بنانے کی ضرورت ہے جہاں پر بھی یہ قبائل طبقے زندگی بسر کرتے ہیں۔ (جاوید احمد رائی) کی طرف سے جموں وکشمیر کے قبائلی لوگوں کا جاری کردہ اعداد وشمار سے یہ قبائل مطمین نہیں ہیں انہوں نے حکومت سے بار بار یہ مانگ کی ہے اور کہا ہے کہ ان کی مناسب طریقے سے اعداد وشمار نہیں کی گئی ہے مردم شماری کے دوران تقریبا چھ لاکھ خانہ بدوش آبادی موسمی طور پر اپنے مال مویشی کے ساتھ ہجرت کر کے شمالی مغربی ہمالیہ کی طرف چلے گئے تھے۔ جو مردم شماری کے زمرے سے ابھی تک باہر ہیں۔ راجوری اور پونچھ اضلاع جو گوجر اور بکر والوں کی طرف سے کثیر طور پر آباد ہیں وہ ریاستی قبائلی آبادی کے سب سے زیادہ تناسب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قبائلی باشندے خاص طور پر گوجر اور بکروال ریاست کے ہر ضلع میں کافی تناسب میں رہتے ہیں۔

موجودہ مطالعہ میں متعلقہ ادب کا جائزہ: ہندوستان میں مختلف مذہب، سماج، نسل اور مختلف زبان بولنے والے لوگ رہتے ہیں یعنی رنگ برنگی دنیا قائم ہے۔ اسی طرح اس ملک میں ایک قبائلی طبقہ ہے جو شیڈول ٹرائب (Schedule tribe) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے لوگ معاشی اور سماجی اعتبار سے نہائت ہی غریب اور پسماندہ ہیں۔ ان کی ترقی کے لیے حکومت کی طرف سے مختلف قسم کے پروگرام اور اسکیمیں بنائی گئی تاکہ ان کی معاشی اور سماجی صورتحال میں بہتری کی جائے۔ ان کے مطابق ان پروگرام اور اسکیموں کا ان کو بھرپور فائدہ نہیں ہوا جتنا ہونا چاہئے تھا ان کی ترقی میں کوئی خاصا اضافہ نہیں ہوا۔ مندرجہ زیل جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ Mudasir, Balamurugan, Ghul and M. Ganai کے مطابق تعلیم ایک نہائت ہی کارآمد اساسہ ہے جو کسی بھی ملک کی ترقی کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ کوئی بھی طبقہ اس کی معاشی ترقی، تکنیکی اصلاحات، سماجی تحریک کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ ملک کے اندر رہنے والے لوگوں کی صلاحتوں کا پورا پورا استعمال نہ کرے۔ ماہرین تعلیم اسی لیے ہر ایک ترغیب کا استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے طالب علموں کی ذہنی صلاحتوں کی پوری طرح تشکیل ہو اور ان صلاحتوں سے پورے سماج کی ترقی اور بھلائی ہو سکے۔

Sameena and Jameel, A. (2015) کے مطالعہ کے مطابق ریاست جموں وکشمیر

کے قبائلیوں کی خواندگی کا درجہ ہندوستانی قبائل کے مقابلے بہت کم ہے۔ مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حکومت کی توجہ ان قبائل کی تعلیم و ترقی کی طرف بہت کم ہے۔ ریاست کے گجر بکروال قبائل تعلیم کے ماحول سے غیر متوجہ اور غافل ہیں۔ ان کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے بنیادی سہولیات کی رسائی نہیں اس وجہ سے اس قبیلیکے لوگوں کا رحجان تعلیم کی طرف نہیں ہے۔ Sofi, U. J.(2014) کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کے گوجر اور بکروال طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعلیمی معیار باقی طبقوں کے مقابلے بہت کم ہے۔ ان کے مطابق ریاست کے قبائلیوں کی تعلیمپسماندگی کی وجہ والدین کی غریبی، اساتذہ کا غیر حاضر رہنا، اساتذہ کا رویا، موسمی اعتبار سے قبائلیوں کی ہجرت، والدین کی دلچسپی نہ ہونا، والدین کی طرف سے خوصلہ افزائی کی کمی کا ہونا جوان قبائلیوں کے بچوں کی تعلیممیں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ ان کے پہلے حکومت کی طرف سے جو بھی اسکیمیں قبائلی بچوں کی تعلیم کے لیے نافذ کی گئی تھی ان کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ ان قبائلی لوگوں کی آج بھی وہی صورتحال ہے۔ پرادان اور سنجے کمار 2011 کے مطابق حکومت کی طرف سے کچھ مخصوص اقدامات اٹھانے کے باوجود بھی جیسے کہ آشرم اسکول، بنیادی سطح پر تعلیم اور مادری زبان میں بچوں کی تعلیم کو فروغ دینا پھر بھی شیڈول شدہ قبائل جو ہیں وہ غیر قبائلی لوگوں کے مقابلے تعلیم کے معاملے میں بہت پیچھے ہیں۔ ایسے حالات میں حکومت کو اور پالیسی بنانے والوں کو اچھی کوشش کرنے کی ضرورت ہیجس سے قبائلیوں کے تعلیمی معیار میں بہتری ا؟ سکے۔ Suri, K.(2014). تعلیم ایک بنیادی اور اہم آلہ ہے جو کسی بھی طبقے کو ترقی کی طرف منتقل کرسکتا ہے۔ تعلیم ایک ایسی طاقت ہے جو کہقبائلی لوگوں کی ترقی میں اضافہ کرتی ہے بلکہ یہ قبائلیوں کی باطنی قوت میں بھی اضافہ کرتی ہے جس سے وہ اپنی زندگی میں آنے والی مشکلات کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ وہ سرگرمی ہے جو انسانی صلاحتوں میں بہتری کرتی ہے۔ صرف یہ ایک واحد اور نہائت ہی ضروری ذریعہ ہے جس سےکوئی بھی فرد اور طبقہ اپنی ذاتی قابلیت، جائداد، صلاحیت کی سطح کی تعمیر کرنے، رکاوٹ پر قابو پانے اور مسلسل بہتری کے مواقع کو بڑھانے میں مدد لے سکتا ہے۔ پروفیسر آمرتیا کمار سین نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا کہ تعلیم ایک مفید آلہ ہے جو کسی بھی معشیت کی جامع ترقی میں اضافہ کرتی ہے۔ خواندگی اور تعلیم ہندوستان کے پسماندہ گرہوں کی سماجی اور معاشی ترقی کو حاصل کرنے کے لیے ایک اہم نعمت ہے۔ موجودہ دور میں جموں وکشمیر کے گجر اور بکروال صرف عام آبادی سے تعلیم کے معاملے میں پیچھے نہیں ہیں، بلکہ یہ باقی قبائلی طبقوں کے مقابلے میں بھی کم درجے پر ہیں۔ یہ عدم مساوات خاص کر قبائلی خواتینوں میں

دیکھنے کو زیادہ ملتا ہے۔جن کی شرح خواندگی ملک کے سب سے کم درجے پر ہے۔

(2018)Islam, R. T.&Wani, M., کے مطابق ریاست جموں وکشمیر کے خانہ بدوش گوجراور بکروال قبیلے کے لیے تعلیم حاصل کرنا نہائت ہی ضروری ہوگئی ہے۔کیونکہ لوگ ترقی کی راہ پر گمزن ہیں لیکن خانہ بدوش گوجراور بکروال تعلیم کے معاملے میں بہت پسماندہ ہیں۔بنیادی جانکاری اوراعداد وشمار کے لیے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت مخصوص ہورہی ہے۔اوران چیزوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے جوان کے پیشہ وارانہ کرداروں کومتاثر کرتی ہیں جیسے ریاستی اورملکی سطح پر صحت اورتعلیم پر بنائی گئی بہت سی ایسی پالیسیاں ہیں جن سے قبائیلی لوگ کوسوں دور ہیں۔اس کی بنیادی وجہ تعلیم کی نہ ہونا ہے۔(&Meenaxy.(2017Ahmed, P.,Kheraj, A. A., کے مطابق گوجر اور بکروال قبائل اپنے مال مویشی اور کنبہ خاندان کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں اور پیر پنجال کی پہاڑیوں پر قیام کرتے ہیں ان کے مطابقگو جرنیم خانہ بدوش ہیں ان کے پاس اپنے گھر اورتھوڑی زمینیں بھی ہوتی ہیں۔لیکن بکروال طبقہ کے پاس اپنے گھر اور زمینیں نہیں ہیں یہ خانہ بدوش ہیں۔ان لوگوں کے ہجرت کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کا ذریعہ معاش مال مویشی پر انحصار ہے اس لیے یہ مال مویشی پالنے کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔گوجر کم تعداد میں ہجرت کرتے ہیں یہ کھیتی باڑی کا کاروبار کرتے ہیں اور بکروال طبقہ اکثیریت میں ہجرت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ گوجر طبقہ کے نوجوان مزدوری کرنے کے لیے بیرونی ممالک میں جانے لگے ہیں جس کی وجہ سے ان کے معاشی حالات میں بہتری ہورہی ہے۔اب ان لوگوں کی دلچسپی تعلیم کی طرف بھی رجوع کررہی ہیمطالعہ کے مطابق ان دونوں طبقوں کا ذریعہ معاش مال مویشی،کھیتی باڑی اور مزدوری ہے۔جس سے وہ اپنی معاشی اور سماجیضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

جموں وکشمیر کے قبائلی طبقہ میں غربت کے اسباب: موجودہ مطالعہ میں ادب کے جائزے سے یہ ظاہر ہوتا ہے جموں وکشمیر کا قبائلی طبقہ غربت کا شکار ہے اوراس کے مختلف اسباب ہوسکتے ہیں۔کچھ اسباب مندرجہ زیل نکات میں ہیں جیسے:

1. قبائلی طبقہ میں بڑھتی ہوئی آبادی کی شرح میں اضافہ: پچھلے 45 سالوں میں آبادی میں 2.2 فیصد سالانہ شرح سے اضافہ ہوا ہے۔آبادی میں ہرسال افراد کا اضافہ ہوتا ہے۔اسی طرح جموں وکشمیر کے قبائلی طبقہ بھی بڑھتی ہوئی آبادی کا شکار ہوتی جارہی ہے۔گجر بکروال طبقہ تعلیم سے بھی محروم ہے اورسرکاری پالیسیوں سے بھی کوسوں دور ہے۔

.2 زراعت میں کم پیداواری کی صلاحیت: زراعت میں، پیداواری کی سطح بہت کم ہے جس کی وجہ سیسرمائے کی کمی، کاشت کے روایتی طریقوں کا استعمال، ناخواندگی وغیرہ ہیں۔جموں وکشمیر کے قبائلی طبقے کی ایک وجہ زراعت میں کم پیداواری بھی ہوسکتی ہے۔

.3 وسائل کا کم استعمال: جموں وکشمیر کے قبائلی لوگوں میں بے روزگاری ایک اہم وجہ ہے اور انسانی وسائل کی در پردہ بے روزگاری اور وسائل کے کم استعمال کے نتیجے میں زرعی شعبے میں پیداوار کم ہوتی ہے۔اس سے ان کے معیار زندگی میں گراوٹ آتی ہے۔

.4 اقتصادی ترقی کی مختصر شرح: ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں معاشی ترقی کی شرح بہت کم ہے جو کہ اچھی سطح کے لیے ضروری ہے۔اسی طرح جموں وکشمیر کے قبائلی لوگوں میں بھی اقتصادی ترقی کی شرح نہ کے برابر ہے۔لہذا، سامان اور خدمات کی دستیابی اور ضروریات کی سطح کے درمیان فرق برقرار رہتا ہے۔خالص نتیجہ غربت ہے۔اب ان لوگوں کی دلچسپی تعلیم کی طرف بھی رجوع کر رہی ہے۔مطالعے کے مطابق ان دونوں طبقوں کا ذریعہ معاش مال مویشی، کھیتی باڑی اور مزدوری ہے۔ جس سے وہ اپنی معاشی اور سماجی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور اسی طرح ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔

.5 قیمتوں میں اضافہ: مسلسل مہنگائی کی وجہ سے غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے۔اس سے معاشرے کے چند لوگوں کو فائدہ ہوا ہے اور کم آمدنی والے طبقے کے افراد کو اپنی کم سے کم ضروریات حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا کر رہے ہیں۔ان لوگوں کے ہجرت کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کا ذریعہ معاش مال مویشی پر انحصار ہے۔اس لیے یہ مال مویشی پالنے کے کاروبار کو فروغ دیتے ہیں۔ لگا تار قیمتوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور دن بہ دن غریب طبقہ کے لوگ اور غریب ہوتے جارہے ہیں۔گوجر بکروال لوگ مال مویشی پر گزر بسر کرتے ہیں اور ان کے لیے چارے کی انتظام کرنا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے۔

.6 بے روزگاری: غربت کی ایک بڑی وجہ ہمارے ملک اور بلخصوص جموں وکشمیر میں بے روزگاروں کی مسلسل بڑھتی ہوئی ابادی ہے۔ملازمت کے متلاشیوں کی تعداد میں روزگار کے مواقع میں توسیع سے زیادہ شرح سے اضافہ ہورہا ہے۔۔بکروال قبائل اپنے مال مویشی اور کنبہ خاندان کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں اور پیر پنچال کی پہاڑیوں پر قیام کرتے ہیں، ان کے مقابلے میں گوجر لوگوں کے پاس اپنے گھر اور تھوڑی زمینیں بھی ہوتی ہیں۔لیکن بکروال طبقہ کے پاس اپنے گھر

اور زمینیں نہیں ہیں یہ خانہ بدوش قوم ہے۔اس کے علاوہ گوجر طبقہ کے نوجوان مزدوری کرنے کے لیے بیرونی ممالک میں جانے لگے ہیں جس کی وجہ سے ان کے معاشی حالات میں بہتری ہورہی ہے۔اب ان لوگوں کی دلچسپی تعلیم کی طرف بھی رجوع کررہی ہے۔مطالعہ کے مطابق ان دونوں طبقوں کا ذریعہ معاش مال مویشی، کھیتی باڑی اور مزدوری ہے۔جس سے وہ اپنی معاشی اور سماجی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

.7 **سرمائے کی کمی اور قابل کاروبار:** انتہائی مطلوبہ سرمایہ اور پائیدار انٹر پرینیورشپ ترقی کو تیز کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔لیکن ان کی فراہمی بہت کم ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں نمایاں اضافہ کرنا مشکل ہے۔

.8 **سماجی عوامل:** ہمارے ملک کا سماجی نظام باقی دنیا کے مقابلے میں بہت پسماندہ ہے، اسی طرح جموں وکشمیر میں بھی سماجی نظام باقی ریاستوں کے مقابلے میں بہت پسماندہ اور ترقی کے لیے بالکل سست رفتار ہے۔ذات پات کا نظام، وراثت کا قانون، سخت روایات اور رسوم ورواج تیز رفتار ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں اور غربت کے مسئلے کو اور بڑھا دیا ہے۔

.9 **سیاسی عوامل:** ہم سب جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں یک طرفہ ترقی شروع کی تھی اور ہماری معیشت کو نو آبادیاتی ریاست میں تبدیل کر دیا تھا۔انہوں نے اپنے مفادات کے لیے قدرتی وسائل کا استحصال کیا اور ہندوستانی معیشت کی صنعتی بنیاد کو کمزور کیا۔ ہماری آزادی کے آغاز سے ہی ترقیاتی منصوبوں کی رہنمائی سیاسی مفادات سے ہوتی رہی ہے۔اس لیے تعلیم کا ہونا اشد ضروری ہے۔تعلیم کے زریعے ہم ملک کی معاشی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔

.10 **آمدنی کی غیر مساوی تقسیم:** اگر آپ محض پیداوار بڑھا دیں یا آبادی کا جائزہ لیں تو ہمارے ملک میں غربت ختم نہیں ہوسکتی۔ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آمدنی کی تقسیم اور دولت کے ارتکاز میں عدم مساوات کو جانچنا چاہیے۔حکومت آمدنی کی عدم مساوات کو کم کرسکتی ہے اور مناسب مالیاتی اور قیمت کی پالیسیوں پر عمل کر کے دولت کے ارتکاز کو جانچ سکتی ہے۔اس سے آمدنی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

نتیجہ: غربت کی ایک بڑی وجہ ہمارے ملک اور بلخصوص جموں وکشمیر میں بے روزگاروں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ملازمت تلاش کرنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہورہا ہے۔جموں و کشمیر میں گوجر اور بکروال قبیلے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے مال مویشی اور کنبہ خاندان کو لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے رہتے ہیں اور پیر پنجال کی پہاڑیوں پر قیام کرتے ہیں۔ان

کے مطابق گوجر نیم خانہ بدوش ہیں ان کے پاس اپنے گھر اور تھوڑی زمینیں بھی ہوتی ہیں۔لیکن بکروال طبقہ کے پاس اپنے گھر اور زمینیں نہیں ہیں یہ خانہ بدوش ہیں۔جس کی وجہ سے یہ گوجر اور بکروال قبایل اج تک کثیر جہتی غربت کا شکار ہیں اس کے علاوہ گوجر طبقہ کے نوجوان مزدوری کرنے کے لیے بیرونی مما لک میں جانے لگے ہیں جوان کے معاشی حالات میں تھوڑی بہتری کر سکیں۔اب ان لوگوں کی دلچسپی تعلیم کی طرف بھی رجوع کر رہی ہے۔مطالعہ کے مطابق ان دونوں طبقوں کا ذریعہ معاش مال مویشی، کھیتی باڑی اور مزدوری ہے۔جس سے وہ اپنی معاشی اور سماجی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ اگر اچھی تعلیم سے فیضیاب ہونگے تو غربت جیسی تمام تر بیماریوں سے چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ورلڈ بینک کے مطابق غربت فلاح و بہبود کی ایک واضح محرومی ہے اور یہ کئی جہتوں پر مشتمل ہے۔اس میں کم آمدنی اور وقار کے ساتھ بقا کے لیے ضروری بنیادی اشیا اور خدمات کے حصول میں ناکامی شامل ہے۔غربت میں صحت اور تعلیم کی نچلی سطح، صاف پانی اور صفائی کی ناقص رسائی، ناکافی جسمانی تحفظ اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ناکافی صلاحیت اور مواقع بھی شامل ہیں۔ ہندوستان میں 2011 میں % 21.9 آبادی قومی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔لہٰذا، قبائلی لوگوں کو اور بالخصوص گوجرو بکروال طبقہ کو غربت کے جال سے باہر نکلنے کے قابل بنانے کے لیے، معاشی لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن کے اس دور میں معاش برقرار رکھنے کے اقدامات کے علاوہ، صحت عامہ کی سہولیات کو مضبوط بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس سے بھی بڑھ کر، چونکہ قبائلی عام طور پر بکھری ہوئی انسانی بستیوں کے اندر ماحولیاتی طور پر منفی اور جسمانی طور پر کم قابل رسائی علاقوں میں رہتے ہیں، اس لیے وہ بڑے پیمانے پر غربت، جہالت اور صحت کی دیکھ بھال کے مناسب بنیادی ڈھانچے اور خدمات کی عدم موجودگی کی وجہ سے مختلف قسم کی مقامی، متعدی اور موسمی بیماریوں کا زیادہ شکار ہوتے ہیں۔جموں و کشمیر کی سرکار اور مرکزی سرکار کو بلخصوص گوجر و بکروال طبقہ کی طرف دھیان دینا چاہئے نہ کے نظر انداز کرنا چاہئے۔اس طبقہ کو مین اسٹریم میں لانے کے لیے سرکار کو پالیسیوں پر بھی غور و فکر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

References

A Case of :Kashmir&Educational Status of Tribals of Jammu.(2014)Sofi, U. J. 284.-275,(3)Gujjars and Bakarwals. International Journal of Social Sciences, 3

A Study of :Gender Disparity in Education.(2015)Sameena and Jameel, A.

Poonch district in J&K, EPRA Journal.

Demography, Social and Culture Characteristics of Gujjars .(2014)Tafail, Mohd. and Bakarwals, A Case Study of Jammu and Kashmir. IOSR Journal of .(2014,(1)19,((IOSR-JHSSHumanities and Social Science

An analysis of seasonal :Teaching the nomads in the wild.(2014)Suri, K. educational schools for nomadic populations in Jammu and Kashmir. Asian 33.-29,(3)Journal of Multidisciplinary Studies, 2

Socio-Economic and Educational Status of.(2015)&Israr, A.Jameel, A.Abass, Z., An Overview. The : of Jammu and Kashmir((Gujjar and Bakarwal Tribal 41,-pp 35Issue 4,Social Studies, Volume 3,&International Journal of Humanities 9203–ISSN 2321

Tribal Education System in ((2016 Dr. Javed Ahmad Rahi DailyExceller.com Jammu and Kashmir.

Development of education of scheduled tribes in Jammu and.(2013)Andrabi, A. A. 6.-1,(4)Kashmir. International Journal of Social Science Tomorrow, 2

Educational Status of Tribals of Jammu and .(2018)Islam, R. T.&Wani, M., A Case Study of Gujjars and Bakarwalls in District Pulwama.:Kashmir

Seasonal migration of Gujjar and .(&Meenaxy.(2017 Ahmed, P.,Kheraj, A. A., Bakarwal in Poonch district of Jammu and Kashmir. International Journal of 368.-364,(4)Academic Research and Development, 2

☆☆☆

Shaikh-ul-Alam aur Reshi Silsila by Ajaz Yousuf Malik(Research Scholar,Central Asian Studies,University of Kashmir,Srinagar)

اعجاز یوسف ملک (ریسرچ اسکالر، شعبہ سینٹرل ایشین اسٹڈیز، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر)

شیخ العالم اور ریشی سلسلہ

علم ماہ پوروو پھ کے ہوسے | ژھلس چھو زاگان اکس اکھ
کوچھو گُمان اس چھی خاصے | تتہِ نو مکلو ساسہ منز اکھ (شیخ العالم)

Your education is your instrument of exploitation and you think that makes you great that is your illusion you will finally be caught amidst this superficiality.

مقامی رسم ورواج کے مطابق ریشی کی اصطلاح سنسکرت سے ماخوذ ہے لیکن کچھ مسلمانوں کے رسم ورواج ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ فارسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ لیکن کچھ مسلمانوں کے رسم ورواج ہمیں بتاتے ہیں کی یہ فارسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ ریش یا ریش۔ جس کا مطلب ہے پرندے کے پنکھ ، چوڑا لباس وغیرہ لفظ رشی ہندو میں بھی استعمال ہوتا ہے مذہبی کتابیں مثالے راج ترنگنی ، ویدا ، یہ " گلوکار " کے معنی میں استعمال ہوتا ہے "۔ مقدس ہایمز " (گیت) کچھ کشمیری علما جیسے محمد اعظمی اور پیر حسن سنسکرت لفظ کی اصل کو قبول کرتے ہیں۔ وادی کشمیر کی دلکشی ، جسے اکثر زمین پر جنت کہا جاتا ہے ، کا بڑا حصہ ریشوں کی روایات سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ رشی آڑر ، جس کا نسلی ، ثقافتی اتحاد ، حب الوطنی ، اور مذہبی رواداری پر بڑا اثر پڑا ، اسی نے اسے جنم دیا جسے اب کشمیریت کہا جاتا ہے۔ کشمیر میں ریشی تحریک کے آغاز یا اصل ریشیوں کے ناموں کی نشاندہی کرنا ناممکن ہے تاہم تاریخی ریکاڑوں کا تنقیدی جایزہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ کشمیر نے قدیم زمانے سے ہی ریشی پیدا کیے ہیں۔ ہندوں اور بدھ دور کے دوران ریشوں کا کسی نہ کسی شکل میں وجود تھا ، اور جیسے ہی اسلام کشمیر میں پھیلنا شروع ہوا ریشوں نے آہستہ آہستہ اس کے عقاید کو جزب کیا اور اس کے زیر اثر دوبارہ جنم لیا۔ ریشی تحریک کا آغاز نُند ریشی (1438-1377) نے کیا تھا ، انہوں نے اس ماقبل تاریخی عمل کو معاصر صوفی حکم کے ساتھ ڈالا جس میں مذہب سے قطع نظر خدا کی تمام مخلوقات کے درمیان امن ، ہم آہنگی اور بھایی چارے کی عالمی اقدار پر زور دیا گیا۔

شیخ نورالدین ،جن کو پیار سے اورعقیدت سے نُند ریش کہا جاتا ہے تمام کشمیروں کی سوچ اورثقافت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں عظیم لل یشوری (لل دید) کے ساتھ قرون وسطی کے کشمیر کے جڑواں ستاروں میں سے ایک تھے جن کے ساتھ انہوں نے صوفیانہ تجربے کی شدت کا اشتراک کیا جس کی گہرائی آج تک بے مثال ہے۔لیکن بعد میں ذوالقدر خان کی ہدایت پر ریشی مسلمانوں اور پنڈتوں کوقتل کر دیا گیا،ان کے ساتھ کچھ ریشوں نے غاروں اور پہاڑوں میں پناہ لی۔کشمیری مورخ نے بقیہ آبادی کی حثیت بیان کی ہے،جس کی خصوصیت بُدھ مت کی کثرت اور بالادستی ہے۔اس کے مطابق ،ریشیوں کے گھروں اورمقبروں کے نام اور باقیات مٹ چکے ہیں۔تاہم حضرت شیخ نور الدین نورانی نے صرف چار ریشوں کے نام کا ذکر کیا ہے۔کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کشمیر کی پہلی تاریخ ہے جواس وقت دستیاب ہے،اس کتاب میں اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ کشمیر میں ریشی اپنی تپسیا،عقیدت پرستی اور غاروں اور گپھاوں میں رہتے تھے جواپنی ریاضت وعبادت اور روحانیت کی وجہ سے مانے جاتے تھےاور جن سے بادشاہ بھی متاثر تھے۔تاریخ بڈشاہی از محمد الدین فوق اور تذکرہ اولیاے کشمیر از غلام حسن گامرو اور دیگر مصنیفین نے ریشیت اور رشیان کشمیر کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رشیان کشمیر خدا کی خوشنودی کی خاطر ،غاریں ،جھرمٹ اور جنگلی درختوں کی کھوہوں میں اکیلے بیٹھ کر خدا کی باکمال ذات کاورداور اُس کی بندگی کرتے تھے،انہوں نے لذید چیزیں ،نفسانی خواہشات ،جسمانی اور روحانی ضروریات ترک کر کے جنگلی کاسنی (کشمیری میں اس کو ہند کہتے ہیں)اور جنگلی ساگ (ووپل ہاک)اور نا کھانے جانے والے اناج ،کھٹے پھلوں اور بے ذائقہ اناج کواپنا کرنفس کشی کی اور روحانی طاقت اپنے آپ میں سما گیے۔

انہیں ریشیوں کے نام سے جانا جاتا تھا جو کہ سنسکرت کا نام ہے۔اگر معلوم کیا جایے تو علمدار کشمیر ریشوں کی اسلامی روایت کے خالق ہیں۔یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس وقت کے مورخین اور سرپرست اعلی یا توحضرت شیخ العالم کے مشن کو سمجھ نہ سکے یا پھر انہیں صرف شاہی میز پر بیٹھ کر بادشاہوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ اور ریکارڈ درج کرتا تھا۔یہ بھی ممکن ہے کہ اس دور کے مصنف کے پاس حضرت شیخ العالم اوران کی بہادارانہ کاوش کے بارے میں لکھنے کی آزادی نہ ہو ۔تاہم وجہ کچھ بھی ہو،یہ افسوسناک ہے کہ شیخ العالم کے اہم کارناموں ،حقیقی زندگی کے واقعات اور قابل ذکرحقایق کوان کے دور کے مورخین نے غلط انداز میں پیش کیا ہے۔اگر چہ حضرت شیخ العالم کی زندگی میں ان کے ایک دانشمند دبیر کتی پنڈت (بابا قطب الدین)نے بھوج پطر پر شیخ العالم کے

اشعار لکھے اور تحریر میں لا یا اور یہ معلوم ہوا کہ حضرت علمدار کشمیر اسلامی روایت کے موجد ہیں ۔ جب سلطان زین العابدین کے دربار کا ایک اہم وزیر حضرت شیخ العالم کے شاگردوں کی صف میں شامل ہوا تو اس نے اس کلام کو فارسی رسم الخط میں لکھا اور اپنے الفاظ کا مجموعہ نور نامہ کے نام سے مرتب کیا ،حالانکہ حضرت شیخ العالم کی زندگی میں ہی اس نے یہ کلام لکھا تھا۔ان کے خصوصی دبیر کتی پنڈت (بابا قطب الدین) نے بھوج پطر پر شیخ العالم کی نظمیں لکھی تھیں ،حضرت شیخ العالم کا شیخ شرک (شیخ شلوک) کلام صرف کتی پنڈت کی محنت اور پُرخلوص کاوشوں کا نتیجہ ہے ریشت کی جڑیں کشمیر کے باشندوں کی نفسیات میں گہرایی تک پیوست تھیں اور اسلام کی تبلیغ اس کی مدد کے بغیر تقریباً ناممکن تھی ۔ چستیہ حکم نے اس مقصد کے لیے موسیقی سننے کو نفع بخش طریقے سے اختیار کیا ،اسی طرح شیخ العالم نے ریشیات کو استعمال کیا۔ میر محمد ہمدانی کے ساتھ ریشیات ایک تحریک میں بدل گیے اور انہوں نے ایسے با اخلاق نُمایندوں کی تلاش کی جو کشمیر میں اسلام پھیلا سکیں ۔انہوں نے ذہانت ،طاقت اور کردار کے تمام لوگوں سے رابطہ کیا اور انہیں اپنی روحانی طاقتوں ،انکشافات ،معجزات اور مباحث سے متاثر کیا۔ان کے پیروکار ریشیوں کے نام سے مشہور ہو یے ۔ بابا بام الدین ،بابا زین الدین ،بابا ناصر الدین اور بابا پیام الدین تحریک رشیات کے ریشی تھے اس نے اسے صرف مردوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ عورتوں تک بھی پھیلا دیا۔اس میں شنگہ بی بی ،شیان بی بی ،بہت بی بی ،دِہ بی بی ،دتا بی بی اور سالر بی بی ،یعنی دونوں بڑے اور چھوٹے شامل تھے ۔تحریک ریشیات کے شیخ العالم کے روحانی وارثوں میں سے چند ایک تذکرہ کرنا ضروری ہے ۔ یہ تھے سنگراما گنایی ،سنگراما وید ،بابا قطب الدین ،بابا قیام الدین ،مولانا مانک نایک ،سوزن رشی ،خطی رشی ،لچھم رشی اول ،مجی ریشی دوم ،رویا ریشی ،سدرہ ریشی ،بب یزدریشی ،بابا گلاب ریشی ،سدھ شیر کانتھ ،بابا بدرالدین ،بابا صدرالدین اور روتی ریشی ۔

پندرہویں اور سترہویں صدی کے دوران ریشی تحریک نے وادی کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔اس کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں تقریباً دو ہزار (۲۰۰۰) ریشی اپنے مشن میں سرگرم عمل پایے گیے یہ سچ ہے کہ ریشیوں نے شادی نہیں کی ،گوشت سے پرہیز کیا اور سوکھی روٹی یا پہاڑوں کے جنگلی پھلوں پر گزارہ کیا ،لیکن یہ ایک ایسا حقیقت ہے کی انہوں نے اپنی زندگی انسانوں کی بھلایی کے لیے وقف کردی ۔اس طرح ابوالفضل نے کہا۔۔۔اس ملک (کشمیر) میں سب سے زیادہ قابل احترام طبقہ ریشیوں کا ہے جو روایت اور رسم و رواج کے جھکاو سے آزادی کی ضرورت کے باوجود خدا کے سچے پرستار ہیں ،وہ زبان نہیں کھولتے ۔ان لوگوں کے خلاف جوان کے

عقیدے سے تعلق نہیں رکھتے، نہ ہی بھیک مانگتے ہیں اور نہ ہی دھتکارتے ہیں۔
لوگ ریشی صوفیوں کی طرف نہ صرف ان کی بلند روحانی حثیت کی وجہ سے راغب ہویے بلکہ اس لیے بھی کہ ان کی زندگی عدم تشدد، مذہبی رواداری اور غریبوں اور ضرورت مندوں کے لیے ہمدردی کی اخلاقی اقدار پر مبنی تھی۔ انہوں نے تمام لوگوں کے پرامن بقایے باہمی کے پیغام کو ان کی ذات، طبقے یا مذہبی عقیدے سے قطع نظر پھیلایا اور انہوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی رویت پیدا کرنے میں اپنا حصہ ڈالا، جو صدیوں سے کشمیری ثقافت کا اٹوٹ حصہ بنی ہوی ہے یہ ترتیب تصوف کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے سے پہلے تقریباً دوسو سال تک ایک الگ شناخت کے ساتھ سرگرم رہی اگر چہ یہ اپنی شناخت کے ساتھ کے ایک الگ ترتیب بن کر رہ گیا ہے۔ وادی میں بہت سے صوفی عرفان ریشی صوفیا کی روح کو مجسم کرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی مذہبی رواداری، اور پرامن بقایے باہمی پر یقین رکھتے ہیں تاہم ریشی صوفی کا عالمی نظریہ کشمیری معاشرے میں بڑھتے ہوئے آرتھوڈکس عناصر عناصر کی وجہ سے پوشیدہ یا دبا ہوا تھا۔ ----------------------------

☆☆☆

Novel"Khwab Haqiqat" Kashmir ki tahzeeb-o-saqafat ka tarjuman by

Umm-e-Salma(Res. Scho. Dept.of Persian,Kashmir University,SGR)

ام سلمہ (ریسرچ اسکالر شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسیٹی)

ناول ''خواب حقیقت'' کشمیر کی تہذیب وثقافت کا ترجمان

خواب حقیقت، الفاظ کا یہ مرکب سنتے ہی ذہن میں ایک الجھا وسا پیدا ہوتا ہے کیونکہ خواب اور حقیقت دو متضاد الفاظ ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ خواب کی تعبیر ہی حقیقت ہے جس کی وجہ سے ہم خواب کو حقیقت سے اور حقیقت کو خواب سے الگ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر رخسانہ تبسم کا یہ ناول ''خواب حقیقت'' اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ خواب ہی ہیں جو ہمیں حقیقت سے ملنے کا راستہ دیکھاتے ہیں۔ ''کاش'' کی تلخی کو ''یقینا'' کی مٹھاس میں تبدیل کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کے ناول کو بغور پڑھا اور پایا کہ وہ سماج کو باریک بینی سے پرکھتی ہیں، قلم کو تلوار سے تیز رکھتیں اور الفاظ کے موتیوں کو فصاحت کی لڑیوں میں پروتی ہیں۔ گویا وہ ناول کے ہر میدان میں کامیاب رہی ہیں چاہے کردار نگاری ہو، منظر کشی، مکالمہ نگاری، رسم ورواج ہوں یا پھر ناول کی کہانی ہو۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے ہمیں کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا اور نہ کہیں کہانی میں جھول نظر آتا ہے۔

ناول میں مصنّفہ نے ہر منظر، ہر صورت حال کا ایسا بہترین نقشہ کھینچا ہے کہ سارا نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔ ناول کے آغاز میں بہار کی ایسی منظر کشی کی ہے کہ قاری کو بھی بہار کی صبح کی ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی ہے۔ اسکے علاوہ جاوید بھائی کی شادی کا منظر جو ہمیں ان نظاروں کی سیر کراتا ہے جو ہم نے کشمیر میں ہونے والی شادیوں میں دیکھے ہیں۔ مصنّفہ اس طرح بیان کرتی ہیں ''عزرا بھابی کو ایک بڑے ہال نما کمرے میں مسند پر بٹھایا گیا ہے۔ مسند کے دائیں بائیں گاو تکیے لگے ہوئے تھے تاکہ دلہن آرام سے بیٹھ سکے۔ کمرے کی چھت کو انتہائی سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ بچے، نوعمر لڑکے اور لڑکیاں کمرے میں پہلے ہی سے براجمان تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس لڑکیوں نے گا گا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ بچوں کی تو جیسے عید تھی کیونکہ ہر طرف ڈرائی فروٹس اور مٹھائیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ بچے یہ سب پانے اور سمیٹنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش میں کبھی کبھار ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے تھے۔ کوئی ماں کونے میں بیٹھ کر اپنے بچے کو نئے کپڑے خراب کرنے پر کوس رہی تھی۔ کوئی بچہ ماں سے باپ کے

پاس لے جانے کی ضد کر رہا تھا۔تنگ کرنے پر مائیں بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں اور پھر اپنا سارا غصہ شوہروں پر نکالتی تھیں۔اس پر ساسیں ماتھا ٹھنکا کر اور ہاتھ نچا کر یوں کہتیں، بچوں کو سنبھالنا نہیں آتا تو غصّہ شوہروں پر نکالتی ہو۔بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں، انہی کی بدولت شادیوں میں رنگینیاں پیدا ہوتی ہیں''۔اس کے علاوہ آسیہ کی شادی کا منظر بھی بڑی ماہرانہ انداز میں بیان کیا ہے خاص کر ہال کی سجاوٹ کو اس طرح بیان کرتی ہیں ''ہال انتہائی کاریگری سے سجایا گیا تھا۔پورا ہال رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔اس میں گرمی سے راحت پہنچانے کے لئے دو بڑے سے ائیر کولر لگائے گئے تھے۔پورے ہال میں کرسیاں قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔آسیہ کے بیٹھنے کی جگہ ایک چھوٹا سا سٹیج بنایا گیا تھا، جہاں دو تین کرسیاں اور ایک ٹیبل رکھا ہوا تھا۔ٹیبل پر سادہ پانی اور کولڈ ڈرنک کی چند بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔دو تین ویڈیوگرافر بیچ بیچ میں شاٹ بھی لے رہے تھے۔ہال کے سائیڈ پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کاونٹر سا بنا ہوا تھا جس پر عام سائز سے زیادہ بڑی پلیٹیں لگی ہوئی تھیں اور کم فاصلے پر فلٹر لگے ہوئے تھے''۔ ماتمی منظر کو بیان کرنے میں بھی انہوں نے اپنی مہارت دکھائی ہے چاہے وہ پھر صناع کے ابو کی موت کا منظر ہو، ماں کے وصال کا یا پھر اشفاق کی خودکشی کی خبر کا منظر ہو یا صناع کے بھائیوں سے نوک جھونک کا۔غرض انہوں نے ہر صورت حال کو اس طرح بیان کیا ہے گویا سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو۔مصنّفہ ہمیں بھی ان کے دکھ میں شریک کرتی ہیں اور آہ وزاری کرنے والوں کے ساتھ آنسوں بہانے پر مجبور کرتی ہیں۔

ڈاکٹر رخسانہ تبسّم نے مذکورہ ناول میں ہنرمندی سے کردار نگاری کی ہے۔ہر کردار کو منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔صناع جیسے مضبوط اور باہمّت کردار کو حسن اور نزاکت کی مورت بنا کر پیش کیا۔ انم جو کہ صناع کی سہیلی ہے کا کردار نہایت ہی دلچسپ ہے جس کے اندر ہمیں اپنے غمگسار اور ہمدرد دوست نظر آتے ہیں۔وہ دوست جو ہمیں کبھی بھی دھوپ چھاؤں میں اکیلا نہیں چھوڑتے۔بھائیوں بھابھیوں کا کردار زندہ کردار ہے جو سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور ہمیں تقریباً ہر گھر میں نظر آتے ہیں۔اس ناول کے کرداروں میں ہم کبھی خود کو کبھی اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ناول پڑھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے جیسے یہ ہماری ہی کہانی ہو۔ہم کبھی خود کو صناع میں دیکھتے ہیں کبھی اس کی دوست انم میں تو کبھی محنت کے باوجود ناکام ہو جانے والے اشفاق میں۔صناع کے حسن و سیرت کا گرویدہ فراز جو صناع کی ایک ہی جھلک پر اسے اپنا دل دے بیٹھتا ہے ایک خاص کردار ہے جس کی فہم و فراست، عقل و شعور اور ادب و اخلاق دیکھ کر کوئی بھی لڑکی فریفتہ ہو جائے۔صناع کی

دکھوں بھری زندگی میں فراز کی آمد قاری کے عین توقع اور چاہت کے مطابق ہوتی ہے۔رخسانہ تبسّم کے اس ناول میں ہر چیز سے کشمیریت ٹپکتی ہے۔اس ناول کو پڑھ کر بالکل ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک فرضی کہانی ہے۔ بلکہ جگہ جگہ سچائی اور حقیقت کا احساس ہوتا ہے۔جیسے بجلی کی آنکھ مچولی کا ذکر، گاڑی میں بھیڑ ہونے کے باوجود کنڈکٹر کا سواریوں کو دعوت دینا،صحافیوں کو سچّائی دکھانے پر تشدد کا شکار بنانا۔اس کے علاوہ کشمیری رسم ورواج کو نہایت ہی پر اسلوب انداز سے بیان کیا ہے۔اگر طرز تحریر اور جملہ سازی کی بات جائے تو رخسانہ جی کا انداز اس میں بھی نہایت ہی دلکش ہے۔چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کی ہیں۔جیسے صناع جب بھائی کی شادی کی خوشی میں اپنی سہیلیوں کو کالج میں پارٹی دیتی ہے تو کھانے کے بعد ثمر جو کہ صناع کی دوستوں میں سے ایک تھی شرارتاً کہتی ہے ''لائف بہت فاسٹ ہے۔آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتے اور ویسے بھی کئی دنوں سے ہمارے ہاں زندگی مختصر سی ہوگئی ہے،کوئی بھی اب یہاں پوری عمر نہیں جیتا۔اگر وہ جینا بھی چاہے،نہیں جی سکتا،لہذا جو بھی پل ملے ہنسی خوشی گذارلو'۔ان چند سطور میں ہی مصنّفہ نے کشمیر کے تمام حالات و واقعات بیان کردئے ہیں۔اس سے انداز ہوجاتا ہے کہ وہ دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ایک اور جگہ جب صناع کو ٹریفک جام کی وجہ سے دفتر سے گھر پہنچنے میں دیر ہوجاتی ہے تو وہ ٹریفک جام کو اس طرح بیان کرتی ہیں ''وجہ یہ ہے کشادہ سڑکیں تنگ گلیاں بن گئی ہیں۔جگہ جگہ پر ناجائز تعمیرات بننے سے تنگ گلیاں بھی اب نالیوں کی شکل اختیار کرتی جارہی ہیں''۔پولیس کے ظلم وستم پر وہ اپنے غصّے کو بہترین الفاظ میں ظاہر کرتی ہیں وہ لکھتی ہیں ''ہونٹ سی لینے میں ہی لوگوں کو اپنی عافیت نظر آتی ہے۔اسی طرح کے اور بھی ظلم سہنے کے یہاں کے لوگ عادی ہوچکے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے دلوں میں آتش فشاں پل رہا ہے جس کا لاوا کبھی بھی پھوٹ سکتا ہے''۔اشفاق کی خودکشی پر صناع نصیحت کے لئے بہترین الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہتی ہے ''زندگی سے ہارنا بزدلی ہے،مشکلوں سے نبرد آزما ہونا ہی مشکلوں پر قابو پانا ہوتا ہے اور ہمت ہارنے والے کبھی بھی زندگی کا کوئی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے''۔کہانی میں آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جو ہمارے معاشرے کے دکھ،غم اور پریشانیاں ہیں ان کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔

حواشی:1۔ تبسم،ڈاکٹر رخسانہ،(۲۰۰۱) خواب حقیقت،ہورائزن پبلشنگ ہاؤس،ص ۲2۔ایضاً، ص ۳6۵۔ایضاً،ص ۴۰8۔ایضاً،ص ۱۲5۔ایضاً،ص ۲8 6۔ایضاً،ص 88

☆☆☆

Jammu-o-Kashmir mein Adab-e-Atfaal ki Surat-e-Haal by Sabreena Javid(research scholar,dept.of urdu,Desh Bhagat University,Punjab)

سبرینہ جاوید (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دیش بھگت یونیورسٹی، پنجاب)

جموں و کشمیر میں ادبِ اطفال کی صورت حال

ادبِ اطفال کو دنیا میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ کیونکہ بچے کل کے معمار۔ نگہبان۔ سرمایہ اور ایک قوم کے تعمیر اور ترقی کے بانی ہیں۔ دنیا میں ادبِ اطفال پر تقریباً ہر کسّی Language میں لکھا گیا۔ اور جموں و کشمیر میں خاص کر اُردو ۔ کشمیری اور ڈوگری زبانوں میں لکھا گیا۔ اردو ادبآ کے خیالات سے یہ صاف اور واضع ہو جاتا ہے۔ کہ ادبِ اطفال لکھتے وقت بچوں کے مزاج۔ عمر۔ نفسیات ۔احساسات وجذبات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ جس سے بچے ادبِ اطفال میں دلچسپی لے سکّیں ۔

اور اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ہم کسّ عمر کے بچوں کو مدِ نظر لکھیں۔ اب جبکہ وہ چیزیں بھی ائیں جن سے بچے ادبِ اطفال میں دلچسپی لے سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان عمر کے بچوں نے واقعی ماضی سے لیکر حال تک ادبِ اطفال میں فطری طور دلچسپی لی ہے۔ یا ان کی توجہ اس طرف کسی نہ کسی بہانے مرکوز کرائی گئی ہے۔ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو بچے اس چیز میں دلچسپی لیتے ہیں جو ان کو پیش کی جاتی ہے۔ کیونکہ نافہیم ہونے کی وجہ سے وہ خود کوئی انتخاب تو نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ زمداری ہمارے اساتذہ۔ والدین اور خاص کر ان اصحاب کی بنتی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً درسّی کتابوں کے لیے مواد کا انتخاب کرتے ہیں۔ اب ان ہی پر یہ زمداری عائید ہوتی ہے۔ کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے حسبِ مناسب اور موافق مواد کا انتخاب کریں۔

ماضی کے مقابلے میں حالیہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہلاتا ہے۔ آج کا بچہ ماں کے پیٹ سےّ ہی سائنسی ذہن لیکر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ شروع سےّ ہی اپنی حساسیت اور انوکھے پن کا ثبوت دیتا ہے۔ لہذا اس کے لیے ان ہّی چیزوں کا انتخاب کیا جائے جس سے وہ دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ زمانے کے بدلتے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔ اگر ہم ماضی کے مقابلے میں حال کا ادبِ اطفال کا جایزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ تو آج کا ادبِ اطفال ان بدلتے تقاضوں پہ پورا اترتا ہے۔ جس میں سائنس بھی ہے۔ اخلاقیات بھی ہے۔ تجربات بھی ہیں۔ مشاہدات بھی ہیں۔ اور ان چیزوں سے

انحراف بھی ملتا ہے۔ جو اس کی خیالی دنیاؤں میں لے جا کر حقیقت سے انکھیں ملانے کی حسرت کرنا سکھاتا ہے۔ آج کا ادیب اور شاعر بھی سائنس کی طرح کافی اڈوانس (Advance) ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں کچھ تحریرات کا حوالہ اس بات کا ثبوت فراہم کریں گے کہ آج کا تیز ذہن اور حساس بچہ جسن ادب سے دوچار ہے۔ وہ اس کی سائنسی سوچ کے مطابق ہے۔

جموں وکشمیر میں ادبِ اطفال پر تخلیق کاروں نے جو تحقیق کی ہے۔ اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے۔ کہ ادبِ اطفال کے خدوخال شروع سے ہی سے واضع نظر آتے ہیں۔ موجودہ دور میں اگرچہ جموں وکشمیر میں بہت سارے کلم اور تحقیق کاروں نے ادبِ اطفال پر لکھا ہے لیکن کچھ ایسے کلم کار بھی ہیں۔ جنہوں نے بچوں کے لیئے وقتہً فوقتن لکھا اور قوم کو ایک اہم ترین رہنمائی کی۔ جن میں شبیبؔ رضوی۔ نور شاہ۔ زمان آزردہ۔ حمیدہ شاہ اختر۔ حسن اظہر۔ نشاط کشتواڑی اور پرویز مانوش کے نام قابلِ اہم ہیں ان قلم کاروں نے بہت سارے کہانیاں۔ نغمے ۔ افسانے۔ ناول۔ ڈرامے اور غزلیں درج کی ہیں، جن کا جموں وکشمیر کی تعمیر وترقی میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اور بچوں میں زوق وشوق۔ قوتِ برداشت۔ اخلاق۔ قدرت کی تخلیق۔ علم وادب اور ماں باپ کی اطاعت کو پروان چڑھایا۔ اس مضمون میں شیبؔ رضوی اور نور شاہ کے بچوں کے حوالے سے خدمات پیش کرنے کی کوشش کی جاے گی۔

شبیبؔ رضوی: شبیبؔ رضوی کا شمار جموں وکشمیر کے اہم شعراء و ادباء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑھوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی لکھا ہے۔ سیّد محمد شیب رضوی کا جنم ۲۵ جون ۱۹۳۰ء کو قصبہ زیر پور ضلع بارہ بنکی اُتر پردیش میں ہوا۔ موصوف صرف پانچ سال کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی دینی تعلیم گھر پر ہی اپنی والدہ سے ہی حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف دینی اداروں سے عربی ادب میں فاضل اور ۱۹۵۹ء میں طبیہ کالج لکھنو سے بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں ۱۹۶۳ء میں ان کی تعنیاتی گورنمنٹ طبیہ کالج سرینگر میں ہوئ۔ اور مستقل طور پر سرینگر میں ہی رہائیش پزیر ہوے۔ شبیبؔ رضوی کے ادبی خزانے میں ہمیں بچوں کے لیے بھی ایک کتاب ''بچوں کے مشاعرے'' ملتی ہے۔ ۲۰۷ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں اندرون کاٹھی دروازہ ۔ رعنا واری سرینگر کی جانب سے شائع کی گئی۔ موصوف کی اس کتاب کے بارے میں ارشاد آفاقی رقم طراز ہیں۔

''نغموں کا یہ گلدستہ آٹھ سال سے زائد عمر کے بچوں کے لیئے مفید اور دلچسپ ہے۔ ان موضوعاتی

نظموں کے ذریعے بچوں کے شعری ادب میں ایک نئے انداز کا آغاز ہوا''۔اس کتاب میں شامل سبھی شاعروں میں چھ شعراء شامل کیے گئے ہیں۔اس کتاب میں پہلے چار شاعرے تمثیلی نوعیت کے ہیں۔ کتاب کی آخری تخلیق ایک کہانی ''کوااور لومڑی'' شامل ہے۔

شبیبؔ رضوی تفریحی اور موسمی مشاعروں کے ذریعے اس کتاب میں جہاں کشمیر کے حسن کے دوسرے پہلو پیش کئے ہیں۔وہیں انھوں نے کشمیر کی خوبصورتی کو دوبالا کرنے والی جھیلوں کے حسن کو بھی پیش کیا۔انھوں نے بچوں کو خوش کرنے کے لیے اس کتاب میں ''عید کا چاند'' بھی پیش کیا۔اس مشاعرے میں بچہ کا چاند۔عید مبارک عید منائیں۔جشن مناؤ۔عید ہے آئی۔عید کا نزرانہ۔خوشی مناؤ منظر بھی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شبیبؔ رضوی نے ادبِ اطفال میں ایک نئی صنف کا اضافہ کیا۔ اور انھوں نے کسی ایک مخصوص موضوع پر مشاعرے نہیں لکھے، بلکہ مختلف موضوعات پر شاعرے لکھ کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ کسی بھی جوضوع پر باآسانی شاعرہ لکھ سکتے ہیں۔علاوہ ازین کشمیر کے موسموں پر لکھے گیے شاعروں کی غزلوں اور نغموں میں یکسانیت نظر آتی ہے۔

نورشاہ: نورشاہ کا شمار اردو کے صف اول کے فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ناول اور افسانہ نگاری کی طرح ڈرامہ نگاری بھی نورشاہ کی پسندیدہ صف ہے۔نورشاہ نے بے شمار ڈرامے لکھے ہیں۔اور ان ڈراموں کے مطالعہ کے بعد یہ بات عیاں ہوتی ہے۔کہ انہوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی ڈرامے لکھے۔جو بچوں کے مختلف ادبی رسائیل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔نورشاہ کے بچوں کے لیے تحریر کردہ ان ڈراموں میں ایک اہم ڈرامہ ''بدی اور نیکی'' ہے۔پہلی بار یہ ڈرامہ فروری ۲۰۱۱ ء میں ماہنامہ ''اردو دنیا'' نئی دہلی میں شائع ہوا تھا۔قابل ذکر یہ ہے کہ بعد میں یہ ڈرامہ ''کر بھلا تو ہو بھلا'' کے عنوان سے ماہنامہ ''سبق اردو'' بھدوہی کی جلد ا۔شمارہ ۸ میں شائع ہوا۔ڈرامہ ''بدی اور نیکی '' ایک مختصر یک بابی ڈرامہ ہے۔اس ڈرامے میں ڈرامہ نگار ۹ چھوٹے چھوٹے مناظر کے ذریعے ڈرامہ تشکیل دیا ہے۔ان مناظر کے درمیان میں موسیقی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔اور یہ ڈرامہ ایک سبق آموز کہانی پر مبنی ہے۔یہ کہانی لنگڑے اور ایک انکھ سے اندھے چوزے پر ارد گرد گھومتی ہے۔

ڈرامہ ''ماں'' بھی نورشاہ کا ایک قابل ذکر ڈرامہ ہے۔یہ ایک مختصر یک بابی ڈرامہ غیر مطبوء ہے۔یہ ڈرامہ ایک منظر پر مشتمل ہے۔لیکن اس ایک منظر میں کئی منظر پوشیدہ ہیں۔اس ڈرامے کا منظر نامہ الف لیلیٰ کی کہانیوں کی طرح طلسماتی ہے۔ڈرامہ ''ایک امر کہانی'' بھی نورشاہ کا بچوں کے لے لکھا ایک شاندار اور کامیاب ڈرامہ ہے یہ ریڈیائی ڈرامہ ستمبر ۲۰۰۳ء میں نئی دہلی میں شایع ہوا

تھا۔ یہ معاشرتی ڈرامہ خصوصی طور پر لڑکیوں کے لیے لکھا گیا ہے۔

یہ کچھ ڈرامے نور شاہ کے اہم ترین بچوں کے ڈرامے ہیں۔ اور بلاشبہ نور شاہ نے اپنے ڈراموں کے ذریعے بچوں کے ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

حوالہ:

1۔ سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' نئی دہلی۔ اپریل۔ جون ۲۰۲۰

2۔ بچوں کے مشاعرے۔ شبیبؔ رضوی ۲۰۰۹

3۔ ماہنامہ ''اُردو دنیا'' نئی دہلی فروری ۲۰۱۱

☆☆☆

رضیہ بشیر(کرالہ پورہ کپوارہ)

پروفیسر ابن کنول کی ادبی خدمات

پروفیسر ابن کنول کا اصل نام ناصر محمود کمال ہے۔آپ کے اجداد بادشاہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور قاضی کے عہدے سے نوازے گئے۔انہیں حکومت کی طرف سے جاگیریں دی گئیں۔بعد میں ان کے بزرگ قصبہ ڈبائی میں آکر رہائش پذیر ہوگئے۔ان کا خاندان ہمیشہ سے ہی علمی وادبی سرگرمیوں کے سبب کافی مشہور رہا ہے۔پروفیسر ابن کنول کی ولادت اتر پردیش کے ضلع مرادآباد کے قصبہ بہجوئی میں 15 / اکتوبر/ 1957 کو ایک زمیندار خاندان میں ہوئی تھی۔آپ کے والد کے والد کا نام قاضی شمس الحسن کنول تھا۔آپ کے والد کو شعر وشاعری سے گہرا لگاؤ تھا۔ادب سے گہری دلچسپی ہونے کے سبب بچپن ہی میں اردو کی بیشتر داستانیں پڑھ لی تھیں۔اُن کے شعری مجموعوں کے نام" بساط زیست" اور " سوز وطن" ہیں اس کے علاوہ" مضراب" کے نام سے ان کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔آپ کے والد نے جوانی میں ہی جدوجہد آزادی میں شرکت کی جس کی بنا پر قید وبند کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔آپ کے والد نہایت عبادت گزار تھے اور اکثر وقت ذکر الٰہی میں صرف کرتے تھے۔قرآن شریف کا مطالعہ ہر وقت ترجمہ کے ساتھ کرتے تھے۔

ابن کنول نے اپنی ابتدائی تعلیم ضلع بدایوں کے قصبہ گنور میں ایک اسلامیہ اسکول میں حاصل کی۔ 1962 میں پہلی جماعت میں داخلہ ہوا تھا۔پہلے استاد حاجی صفدر علی تھے۔پانچویں جماعت کے بعد آگے کی تعلیم کے لئے علی گڑھ کا رخ کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منٹو سرکل اسکول (جو سیف الدین طاہر ہائی اسکول کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔1972ء میں ہائی اسکول مکمل کرنے کے بعد پری یونی ورسٹی سائنس میں داخلہ لیا۔1978 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔ علی گڑھ میں آپ نے پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی، پروفیسر نورالحسن نقوی ، پروفیسر شہریار وغیرہ جیسے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ایم۔اے اردو کرنے کے بعد 1978ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کو خیر باد کہہ کر دہلی یونیورسٹی آگئے یہاں سے آپ نے 1979ء میں ایم۔فل کی ڈگری حاصل کی اس دوران آپ کو پروفیسر قمر رئیس اور پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جیسی عظیم شخصیات سے

پڑھنے کا موقع ملا۔ 1984ء میں دہلی یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری" بوستان خیال کا تہذیبی اور لسانی مطالعہ "کے موضوع پر مکمل کیا۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد 1985 میں سی ایس آئی آر کی طرف سے شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسائنٹسٹ کے طور پر آپ نے اپنی ملازمت شروع کی۔ اس کے بعد آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنے صلاحیتوں کے بل پر ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

فکشن کی دنیا میں 1970ء کے بعد لکھنے والوں میں ایک اہم نام پروفیسر ابن کنول کا ہے جنھوں نے اردو کے بیشتر اصناف پر طبع ازمائی کی۔ افسانہ، خاکہ، ڈرامہ، سفر نامہ، انشائیہ، تحقیق، تنقید، شاعری، تدوین متن، اور مضمون کی صورت میں ان کے قلم سے بہت سی قیمتی تحریریں وجود میں اچکی ہیں جو ارباب علم وادب کے نزدیک قدر کی نگاہ سے دیکھی جارہی ہیں۔ ابن کنول نے اسکول ہی کے زمانے سے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ شاعرانہ مزاج ورثہ میں حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ 1969ء میں انسان کی چاند پر اترنے پر پہلی نظم کہی جو رسالہ نور رامپور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی لکھنا شروع کر دیں تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

" جیسا کہ میں نے کہا کہ گھر میں ادبی ماحول تھا۔ پھر بچپن ہی سے کوئی دوست ہی ایسے ملے تھے، اسکول ہی کے زمانے میں شعر موزوں کرنا شروع کر دیا تھا جو چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھیں۔ گنور میں اُس وقت مشاعرے بہت ہوتے تھے۔ علامہ ابراحسنی گنوری اس وقت موجود تھے، والد مرحوم مشاعروں میں شرکت کرتے تھے میں شریک ہوتا تھا، علی گڑھ آنے کے بعد با قاعدہ افسانہ لکھنا شروع کر دیے تھے علی گڑھ کے ماحول کا مجھ پر بہت اثر ہوا"

معروف فکشن نگار اسلم جمشید پوری کا ابن کنول کے اسلوب اور طرز نگارش کے بارے میں کہنا ہے کہ "افسانہ نگاری میں وہ 1970 کے بعد کے اکیلے ایسے افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے انتظار حسین کے اسلوب میں افسانے لکھے۔ داستانوی اسلوب کو آگے بڑھانے کا کام ابن کنول نے کیا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے ان کے اسلوب اور انوکھے پن کے ثبوت کے لیے کافی ہیں'۔

1972ء میں ابن کنول نے با قاعدہ افسانے لکھنا شروع کر دیئے جو ناصر محمود کمال کے نام سے شائع ہوے۔ 1973ء آپ کی ملاقات استاد محترم قاضی عبدالستار سے ہوئی۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں نوجوان افسانہ نگاروں کی ایک جماعت اور کر سامنے آئی جنھوں نے آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں کی نمائندگی کی۔ آپ بھی اس جماعت کے رکن بن گئے۔ اس جماعت کے افسانہ نگاروں کے

سر پرست برصغیر کے معروف فکشن نگار کا قاضی عبدالستار فرما رہے تھے۔ افسانہ اور شاعری پر جو ماہانہ نشستیں ہو کرتی تھی وہ عبدالستار کے مکان پر ہوتی تھی۔ ابن کنول کی تحریروں پر اس ماہانہ نشستیں کا بہت گہرا اثر ہوا۔ چنانچہ وہ خود ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

" دیکھیئے مجاز نے تو تقریباً سبھی کو متاثر کیا۔ میرے اوپر رشید احمد صدیقی اور قاضی عبدالستار کا بہت اثر رہا۔ رشید احمد صدیقی تو واقعتاً قابل تقلید ادیب تھے اور عبدالستار کے قدموں میں بیٹھ کر میں نے تو افسانہ لکھنا سیکھا۔ مجھے قاضی صاحب کے اسلوب اور موضوع نے بہت متاثر کیا۔ میرے زمانے کے علی گڑھ کے میرے ہم عمر تقریباً سبھی افسانہ نگار نے قاضی صاحب کا اثر قبول کیا"

1975ء میں آپ نے ابن کنول کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا۔ ان کے افسانے طالب علم کے زمانے ہی سے ادبی رسالوں میں چھپنے شروع ہو گئی تھی وہ بتاتے ہیں۔

" طالب علمی کے زمانے سے اردو کے مختلف رسائل میں افسانے چھپنے شروع ہو گئے تھے، شاعر، عصری ادب آہنگ جیسے رسائل میں اشاعت سے میرا کافی حوصلہ بڑھا اور اس کے علاوہ علی گڑھ میں جو ادبی محفلیں منعقد ہوئی تھیں اُن میں اکثر میں بھی افسانے سنایا کرتا تھا۔"

ابن کنول کا پہلا افسانوی مجموعہ " تیسری دنیا کے لوگ" 1984 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں۔ جس میں انہوں نے داستانی اسلوب و محرکات کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنا ہے۔ یہ مجموعے دنیا میں ہونے والے مظالم کی طرف سے اشارہ کرتا ہے کہ دنیا میں بڑی طاقتیں اپنے سے کمزور لوگوں کا کس طرح استحصال کرتی ہیں اور ان پر طرح طرح کے مظالم مصائب کے پہاڑ توڑتی ہیں۔ ابن کنول کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "بند راستے" 2000ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ چھبیس افسانوں پر مشتمل ہے جس میں زیادہ تر ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے دور حاضر میں دہشتگر دی، بدعنوانی، مہنگائی اور عصمت دری جیسے مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں انہوں نے داستانوی اسلوب سے انحراف کرتے ہوئے نئے اسلوب و جدید تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ابن کنول کا تیسرا افسانوی مجموعہ" پچاس افسانے" جو 2014 میں شائع ہوا۔ ان افسانوں میں جاگیردارنہ نظام کو بیان کیا گیا ہیں۔ ابن کنول خود ایک جاگیردارنہ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ موضوع ان کے افسانوں میں خود بہ خود سرایت کر گیا ہے۔ ابن کنول نے زیادہ تر زمینداری نظام کا خاتمہ، اس نظام کیبعد کے حالات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے افسانوں میں جہاں مذہبی رواداری، انسان

دوستی ،غریبوں اور مزدوروں کے معاشی ، معاشرتی اور مذہبی مسائل کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے وہیں شہری زندگی کے مسائل کی بھی خوب عکاسی کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ابن کنول کے افسانوں کی اس امتیازی جہت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

"میں افسانے کی اس بحالی میں بعض ممتاز ادیبوں کے علاوہ آٹھویں دہائی کے جن نوعمر نوجوان ادیبوں کا حصہ رہا اُن میں ڈاکٹر ابن کنول کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو کی داستانوں کی تہذیبی کردار پر ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ اس لئے اردو افسانے کی روایت سے شعور وہ اپنے سنون سے کچھ زیادہ ہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے متعدد کہانیوں میں تکنیک کے تجربے کئے ہیں۔ ان میں داستانی اثرات کی نشاندہی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔"

مجموعی طور پر ایک نئی کاوش کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام و مرتبہ کے مالک ہے۔ پروفیسر ابن کنول کی اہم کتابوں میں :۔
'' ہندستانی تہذیب بوستان خیال کے تناظر میں'' 1988، '' ریاض دلربا'' (تحقیق) 1990، '' آؤ اردو سیکھیں'' (قاعدہ) 1993، '' داستان سے ناول تک'' (تنقید) 2001، '' انتخاب سخن'' (اردو شاعری کا انتخاب) 2005، '' منتخب غزلیات'' 2005، '' اصناف پارینہ'' (قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ) 2005، '' منتخب نظمیں'' 2005، '' تنقید و تحسین'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) 2006، '' تحقیق و تدوین'' (ترتیب) 2007، '' میر امن'' (مونوگراف) 2007، '' باغ و بہار'' (مقدمہ ومتن) 2008، '' پہلے آپ'' (ڈرامہ) 2008، '' نظیر اکبر آبادی کی شاعری'' 2008، '' مضراب'' (کنول ڈبائیوی کا کلیات مع مقدمہ) 2010، '' اردو افسانہ'' (افسانوی تنقید) 2011، '' پچاس افسانے'' (افسانوی مجموعہ) 2014 '' تنقیدی اظہار'' (تنقید) 2015، '' فسانہ عجائب'' (مرتبہ) 2016، '' اردو لوک ناٹک روایت اور اسالیب'' (ڈبائیوی) مرتبہ ,2014، '' اھل الکھف '' (افسانے) عربی مترجم: احمد قاضی، مصر، 2018، '' اردو شاعری'' (تنقید) 2019، '' داستان کی جمالیات'' 2020، بساط نشاط دل (انشائیے) اور تبریک (تقاریظ) شامل ہیں۔

پروفیسر ابن کنول کو بہت سارے انعامات ملے جن میں افسانہ بند راستے پر 1979 میں دہلی یونی ورسٹی نے کتھا پالیا گولڈ میڈل دیا۔ جسے سابق نائب صدر جمہوریہ جناب بی۔ ڈی۔ جتی نے اپنے ہاتھوں پیش کیا۔ 2001ء میں 'سرسید ملینیم ایوارڈ' فکشن کی بہترین پیش کش کے لیے ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ہاتھوں ملا۔ ادبی خدمات پر ہریانہ اردو اکادمی سے 2007ء میں کنور مہیندر سنگھ

ایوارڈ گورنر ہریانہ اخلاق الرحمان قدوائی کے ہاتھوں سے ملا۔ 2014ء میں مغربی بنگال اردو اکادمی نے عبدالغفور نساخ ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ اسی طرح بہار، بنگال، دہلی اور اتر پردیش کے اکادمیاں اور مختلف اداروں نے آپ کی کتابوں پر انعامات سے بھی نوازا ہے۔ نثری خدمات پر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی نے 2023ء غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ سنگم تنظیم لکھنو نے حالیہ میں اودھ رتن ایوارڈ سے نوازا۔

حوالہ جات:۔

۱۔ پروفیسر عبدالحق، داستان سے ناول تک

۲۔ داستان سے ناول تک، ابن کنول

۳۔ ابن کنول بحیثیت افسانہ نگار عزیز احمد

۴۔ ادبی میراث

۵۔ اردو ریسرچ جرنل

☆☆☆

Qazi Abdul Sattar:Bahaisiyat Tarikhi Novel Nigar by Shahnavaz Ansari(Research Scholar,dept.of Urdu, BHU Varanasi)

شاہنواز انصاری (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

قاضی عبدالستار بحیثیت تاریخی ناول نگار

اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسا فن کار بھی موجود ہے جو دور سے پہچان لیا جاتا ہے اس لئے کی اس نے اپنے ناولوں کی عمارت نئے رنگ و روغن سے تیار کی ہے اس کی چمک دمک دوسرے ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ ناول نگار ہے جس نے ''شب گزیدہ'' لکھا۔ ''صلاح الدین ایوبی'' تحریر کیا، ''داراشکوہ'' پیش کیا ''غالب'' کو موضوع افسانہ بنایا، میری مراد قاضی عبدالستار سے ہے۔ قاضی عبدالستار کے ناول دور سے ہی پہچان لئے جاتے ہیں اور ان کا اہنگ اوروں سے مختلف نظر اتا ہے۔ ان کا رنگ ڈھنگ سب سے جدا ہوتا ہے۔ اس نئے پن کا سبب قاضی عبدالستار کی وہ شخصیت ہے جو زمیندارانہ ماحول میں پروان چڑھی اور جس نے زمیندارانہ زندگی کو سن کر نہیں بلکہ اپنی انکھوں سے دیکھ کر جانا اور سمجھا۔ اس لئے ان کے ناولوں میں اس ماحول سے اٹھائے گئے کردار سچے اور فطری نظر اتے ہیں اور جن کے باہری چکا چوندھ کے ساتھ ان کی باطنی کرب دیکھائی پڑتی ہیں۔ قاضی عبد الستار نے اپنے موضوعات کے اظہار کے لئے اپنی زبان استعمال کی جو ان سے پہلے کبھی استعمال نہیں کی گئی۔ ایسا اسلوب اختیار کیا جو اردو فکشن میں پہلی بار نظر ایا۔ ڈاکٹر احمد خاں رقمطراز ہیں:

''قاضی عبدالستار کے بیشتر معاشرتی ناول، جن نکات کا احاطہ کرتے ہیں ان میں مشترکہ تہذیبی قدریں، ماضی سے لامتناہی جذباتی لگاؤ اور جاگیردارانہ نظام کے ٹوٹتے بکھرتے اخری نقوش نمایا حیثیت رکھتے ہیں ان کے بیشتر ناولوں میں اودھ کے اس پاس کی تہذیبی فضا، تعلقدار کنبے کی ان بان اور جاگیردارانہ شان وشوکت اور ان کی بدحالی، معاشرتی رہن سہن اور ان کے اداب واطوار کی عکاسی ملتی ہے''۔1ے

ناول نگاری کا یہ سارا طلسم قاضی عبدالستار کے بلیغ ونفیس طرزِ تحریر نے قائم کیا۔ زبان و بیان پر ان کی بے پناہ قدرت نے ان کی داستاں سرائی میں سحر طرازی پیدا کی ہے۔ موقع ومحل کے اعتبار اور تناسب سے ان کا اسلوبِ نگارش سلاست وفصاحت کے گل بوٹے کھلاتا ہے۔ ان کے

چھوٹے چھوٹے، سادہ ومختصر جملے اور فقرے بڑے تیکھے، انوکھے اور تیز وتند ہوتے ہیں۔ ان میں موجِ دریا کی روانی ہے۔ طنز وتعریض کی چاشنی بھی ہے۔ یہ خاصیت ایک خصوصیت ہے، جو باعثِ امتیاز وانفرادیت ہے۔ باذوق قارئین اس سے بہ طورِ خاص لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔

یہ ہیں بحیثیت ناول نگار قاضی عبد الستار کے فن کے پیچ وخم۔ تاریخی ناول نگاری میں یقیناً ان کا ایک خاص مقام ہے اور اس جہت سے ان کا شمار صف اول کے ناول نگاروں میں ہونا چاہئے۔ انھیں اپنے فن اور اس کی مخصوص صنف میں وہ روایت ملی جس کے قابلِ ذکر بانی عبدالحلیم شرر ؟ اور اس کو وسیع طور پر ترویج دینے والے صادق سردھنوی ؟ ،لیکن نسیم حجازی ؟ نے اس روایت میں توسیع و اضافہ کر کے اس کو عظیم فن کا اعتبار ومعیار بخشا۔ اسلم راہی ؟ اور عنایت اللہ التمش ؟ اسی راہ پر چلے جو نسیم حجازی نے روشن کی لیکن قاضی عبد الستار اپنی فن کاری میں کسی کے مقلد نہیں کہے جاسکتے اور ان کو اسلامی تاریخی ناول نگار کہنا بھی شاید معقول نہیں ہوگا۔ وہ بس ایک اعلیٰ پایے کے ناول نگار ہیں جن کے موضوعات بیش تر مسلم تاریخ سے ماخوذ ہیں، مگر ان موضوعات کو انھوں نے اپنے طور پر برتا ہے اور اس برتاو ؟ میں فن کاری کا کمال دکھایا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ''ناول کیا ہے'' میں ناول اور زندگی کے باب میں لکھتے ہیں:

''ہر ناول زندگی کا ایک تجربہ پیش کرتا ہے یہ تجربہ ہی ناول کا مواد ہے مگر یہ مواد یا تجربہ ناول نگار کی ہستی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ تجربہ ناول نگار کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدات ،تجربات کو یکجا کر کے ہی ناول بناتا ہے۔ زندگی جو ناول میں پیش کی جاتی ہے وہ اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتی ہے مگر خود مصنف کی شخصیت اس تجربہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی ہستی خالق کی ہستی کی طرح اس تخلیق کردہ دنیا کے ہر کونے میں آشکار یا پنہاں ہوتی ہے اور اگر ہم اس تک پہنچ سکیں تو اس کی تخلیق کردہ دنیا کی سیر بیکار ہوگی''۔ ۲

قاضی عبد الستار کی سب سے اہم صفت ان کے اسٹائل کی دل اویزی اور انفرادیت تھی۔ انھوں نے تقلیدی کی روش سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا اور ناول نگاری کے میدان میں اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی۔ یہ صفت بجائے خود ایک نمایاں اور امتیازی وصف کا درجہ رکھتی ہے۔ ترقی پسند تحریک نے جاگیردار، زمین دار اور طبقہ ؟ امرا کے ہر فرد کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے انھیں مردود مطعون قرار دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے فیشن کے طور پر ہر قلمکار ان کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھنا اپنا حق سمجھتا تھا اور ان کے معاشرے کے مسائل اور ان کے طبقے کی الجھنوں اور پریشانیوں کو نظرانداز کرنا ایک عام

بات تھی۔ پہلی مرتبہ قاضی عبدالستار نے اس طبقے کو مجموعی طور پر اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اوران کے جبر وظلم کے ساتھ ان کی مجبوریوں اور مظلومیوں کو بھی فن کارانہ احتیاط وضبط کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے اسلوب کی دلکشی اور تازگی نے ان کے ناولوں کی معاشرہ نگاری کو جادو اثر بنا دیا۔

شب گزیدہ: ''شب گزیدہ'' قاضی عبدالستار کے سب سے کامیاب ناولوں میں سے ایک ہے۔جس میں انھوں نے زمینداروں کے اپسی تصادم اور ہندوستان کی ازادی سے قبل کی جاگیردارانہ تہذیب اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متحرک شکل میں بڑی خوبصورتی اورفن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔یعنی بہ طور خاص باپ بیٹے کے درمیان قدامت پسندی اور رجعت پسندی کی جنگ کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔قصہّ گوئی ، واقعات نگاری بہترین کرداروں کی معرکہ نگاری کے ساتھ ایک خوبصورت اسلوب میں لکھے گئے۔

قاضی عبدالستار نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق موضوع کی حد تک ایک خاص محدود دائرے سے ہے۔یعنی مشرقی یوپی (اودھ)، میں زمیندارانہ نظام کے خاتمے سے پیدا ہونے والے مسائل اورخود زمینداروں کی معاشی خستہ حالی اور بربادی کے غم ناک مناظر۔قاضی عبدالستار اس معنیٰ میں پریم چند اور قرۃ العین حیدر کے مسلک پر گامزن ہیں۔ہندوستان کے گاؤں اور دیہات ان کی فکر کا محور ہیں اوران کے مسائل کا جیسا گہرا سچا اورصحیح ادراک ان کے ہاں موجود ہے وہ بہت کم کہیں دیکھنے کو ملتا ہے۔قاضی عبدالستار کو اس محدود دائرے میں یہ سہولت بھی میسر رہی ہے چونکہ وہ خود زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور جس زمانی ومکانی حصار میں رہ کر اپنی کہانیوں کا خاکہ تیار کرتے ہیں ،اس ذرے ذرے سے انھیں ایک جذباتی لگاو اور اشنائی ہے اس لئے وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ متعلقہ سچائیوں کو قلم بند کرسکتے ہیں۔ڈاکٹر ہارون ایوب کے مطابق:

''شب گزیدہ پہلا ناول ہے جس میں زمینداراورکسان ترقی پسند تحریک کے بنائے ہوئے خانوں کو توڑ کر نکل ائے ہیں یہاں تک کہ کسان مجبور اور مظلوم ہونے کے علاوہ ایک فرد بھی ہے، زندہ، ازاد اور طاقت ور بھی ہے۔جاگیردار ایک جابر وظالم طاقت ور ہونے کے علاوہ دکھی اور شکست خوردہ بھی ہے۔ اس لئے مطالعے کے دوران اس سے نفرت نہیں ہوتی ہے اور ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ٹائپ کردار نہیں بلکہ زندہ، جیتے جاگتے اور ہماری طرح سانس لینے والے انسان ہیں۔ ۳؎

یہ کہانی اترپردیش کے عبوری دور کے گاوں قصبوں کی کہانی ہے جب انگریزوں کی حکومت کا خاتمہ عنقریب تھا اور یہ افواہ گرم تھی کہ ازادی کے بعد زمینداری کا خاتمہ کردیا جائے گا مگر بزرگانِ

عالی خاندان اپنی وضعداری، عزت شہری اور دولت سے اس قدر وابستہ تھے کہ ان کے لئے سوچنا بھی محال تھا اسی لئے جمی کے والد اس حقیقت سے انجان ہیں، مگر نئی نسل کا نمائندہ تعلیم یافتہ باشعور، ذمہ دار ،عقل منداور ہوشیار جمی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی دولت کو مناسب جگہ لگانا چاہتا تھا اور اس کے اس کام میں گاوں کے نوجوان شامل تھے۔اس طرح 'شب گزیدہ' میں دو طبقے، دونظریے اور دو پیڑھی کی کشمکش نظراتی ہے اور انھیں کے ذریعے وہ قصباتی زندگی کی ،قصبائی سماج کی چھوٹی بڑی باتوں کو ، رسم و رواج کو ، مذہبی عقیدے وغیرہ کو پوری جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ابو یہ بات میں نے اس لئے گوش گزار کی تھی کہ ائے دن اخباروں میں یہ اتا رہتا ہے کہ ہندوستان ازاد ہونے والا ہے اور ہندوستان ازاد ہونے کے بعد کانگریسی حکومت جو کام سب سے پہلے کرے گی وہ یہ کرے گی کہ زمینداری ختم کردے گی۔'' ؎۴

غرض ایک رجعت پسند زمیندار جس نے اپنی پوری زندگی زمینداری کو ایک نہ ختم ہونے والی ملکیت سمجھا اور زمیندارانہ شان وشوکت کو زندگی کا حاصل سمجھا اس زمیندار نے حقیقت کا ائینہ دیکھنے کے بجائے اپنے بیٹے کو خود ہی اپنے نظروں سے دور کر دیا۔جمی جب اپنے باپ بڑے سرکار سے یہ بات کہتا اور انھیں سمجھا تا ہے کہ بیکار کے شوق اور ساز وسامان کو گھر سے نکال دیا جائے اورانے والے وقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو انھیں اپنے بیٹے پہ حکمت امیز بات بہت بری لگتی ہے۔ کیونکہ ایک زمیندار جس نے بچپن سے بڑھاپے تک زمیندارانہ ان بان اور شان کے ساتھ عمر گزاری ہو جسے صرف احکام صادر کرنے کی عادت ہو انھیں یہ بات بھی برداشت نہیں ہوگی کہ جس زمینداری کی بدولت انھیں یہ عزت واحترام حاصل ہے اور پورے قصبے اور پورے علاقے پر ان کا حکم چلتا ہو اسے نئے قانون کے مطابق زندگی جینے کے لئے مجبور ہونا پڑے اس شکست خودہ ذہنیت اورانے والے وقت سے نظریں چرا کر جینے کے لئے انھوں نے بیٹے کی اس بات کو ٹھوکرا دیا اور اس سے نہایت زور سے گرجتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ابو اتنی زور سے گرجے کہ جمی پریشان ہوگیا۔

''میری زمینداری چٹائی ہے؟ دری ہے؟ جام ہے؟ اخر کیا ہے؟ زمینداری ختم ہو جائے گی اور ہم تماشا دیکھا کریں گے؟''۵

اس مرکزی کہانی کے علاوہ ناول نگار نے کئی دوسرے چھوٹے بڑے واقعات وحادثات کو

ناول کا حصہ بنایا ہے جن سے ناول کے پلاٹ میں وسعت اور اودھ کے زمین دار طبقے کی زندگی کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کی بھی مکمل عکاسی ہوتی ہے ناول نگار نے اسی طبقے سے تعلق رکھنے والے دوسرے خاندانوں کو بھی اجمالی طور پر بیان کیا ہے جو زمین و جائداد پر اتنا انحصار کرتے ہیں کہ ان کی اولاد سرکاری نوکری کو عیب اور مزدوری کو خلافِ شان سمجھتے ہیں۔قاضی عبد الستار نے زمینداروں کی ذہنیت کا مکمل نقشہ کھینچا ہے۔شب گزیدہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

''شب گزیدہ میرا دوسرا ناول ہے خالص معاشرتی ناول ہے۔ پہلے ناول میں پوری بات پورا دیہات اور دیہات کے وہ بڑے بڑے کردار جو میں نے دیکھے تھے یا جنھیں میں جانتا تھا وہ نہیں اسکے تھے،'' شب گزیدہ''میں میں نے کوشش کی وہ تمام باتیں ا? جائیں جو بحیثیت تخلیق کار مجھے اندر سے بے چین کر رہی تھی اس ناول میں میں نے زمیندارانہ نظام کے کھو کھلے پن کو نمایا کیا ہے۔دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمیندار ہے۔وہ اپنی زمینداری پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے اپنے بیٹے،باپ، کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔اگر اس کو کسی کا ہاتھی یا گھوڑا پسند ا? گیا تو اس کے حصول کے لئے گھر کو اجاڑ سکتا ہے لیکن اپنے ہاتھ سے نظام اقتدار کو نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔''شب گزیدہ'' میں میں نے قدیم تصورات کے حامل زمین اور نئی قدروں کے حامل اس کے اکلوتے بیٹے کے تکراو? کی کہانی پیش کی ہے۔۶ے

''شب گزیدہ'' کا قصہ ایک دوسرے سے منسلک اور جاندار ہے۔ناول میں قاری کی دلچسپی اغاز تا انجام تک بنی رہتی ہے دوسری خاص اودھ کے اس پاس کے مناظر کو خوبصورتی کے ساتھ پیوست کرنے کی کوشش کی گئی اودھی بولی کے ذریعے قصہ میں حقیقی رنگ نظر اتا ہے۔جاگیردارانہ سماج ایک ایسا سماج تھا جو اپنے ظلم و زیادتی کے لئے مشہور تھا اس سماج اور معاشرے کی خاندانی اور گھریلو زندگی کو قاضی عبد الستار نے اتنے قریب سے دیکھا اور پیش کیا ہے کہ طبقہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے ا? جاتا ہے۔اس کے علاوہ اس ناول میں کچھ مکار،لالچی اور خود پرست لوگوں کی داستان بھی لوگوں کے سامنے نظر اتی ہے۔جس میں رحمت علی خاں دولت کے لالچ کے لئے اپنی بیوی اور سالی اور بڑے سرکار کے اگے گروی رکھ دیتا ہے۔زمیندارانہ ذہنیت کی خوبصورت مثال اس ناول میں نظر اتی ہے۔

حواشی:

(۱) قاضی عبد الستار:فکر فن اور فن کار۔ڈاکٹر احمد خاں۔ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی۔ 2005

ص:38۔37
(۲) ناول کیا ہے؟ ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔ اشاعت 2011ص: ۴۴
(۳) اردو ناول پریم چند کے بعد،ص: ۲۲۲
(۴) شب گزیدہ،(ناول) قاضی عبدالستار۔اجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔1988ص:115
(۵) شب گزیدہ۔(ناول) قاضی عبدالستار۔اجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ۔1988ص:۱۱۱
(۶) قاضی عبدالستار اسرار و گفتار۔گفتگو کی شکل میں میں سوانح عمری، راشد انور راشد عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی۔ص:253

☆☆☆

Analytical study of disaster management content in secondary school syllabus of Telangana by dr. Md.Tabrez Alam(Asst.Prof.(con.) MANUU college of teacher education Bhopal)cell-6200982748

ڈاکٹر محمد تبریز عالم (اسسٹنٹ پروفیسر، مانو کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، بھوپال)

تلنگانہ کے ثانوی اسکولی نصاب میں آفاتی انتظام کے مواد کا تجزیاتی مطالعہ

تعارف: عصر حاضر میں مختلف علوم وفنون منظر عام پر آ چکے ہیں۔کسی بھی قوم وملک کی ترقی و برتری کا راز اس قوم وملک کے افرادی قوت، تعلیمی معیار اور زیادہ سے زیادہ افراد کے تعلیم یافتہ ہونے پر منحصر ہے۔اسی طرح صحیح تعلیم وتربیت کے لیے قوم وملک کے سماجی، سیاسی، معاشی اور افرادی قوت کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیمی عمل میں ایک اچھا نصاب کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ایک ایسا نصاب جس میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، وغیرہ مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہو۔اس ترقی یافتہ دور میں جہاں انسان نے بہت ساری چیزوں ومسائل پر قابو پالیا ہے اس کے باوجود بھی کچھ ایسے مسائل ہیں جس پر انسان کا مکمل دسترس حاصل نہیں ہوسکا ہے ،مثلا؛ زلزلہ، سیلاب، سنامی اور کوہ آتش فشاں وغیرہ۔ہندوستان دنیا کے سب سے زیادہ آفات کا شکار ممالک میں سے ایک ہے۔اس کا 55 فیصد سے زیادہ رقبہ زلزلوں کا شکار ہے۔زیر کاشت زمین کا 70 فیصد خشک سالی، 12 فیصد سیلاب اور 8 فیصد سمندری طوفانوں کا شکار ہے۔حکومت اور امدادی ایجنسیاں ہر سال امداد اور بحالی کے اقدامات میں ایک بڑی رقم خرچ کرتی ہیں۔یہ اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ آفات کی تیاری میں سرمایہ کاری ہزاروں جانوں، اہم اقتصادی اثاثوں، ذریعہ معاش کو بچاسکتی ہے اور مجموعی امدادی لاگت کو کم کرسکتی ہے۔

تجزیاتی مشاہدہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان آفات کے اثرات کو آج بنی نوع انسان کم کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔اس تناظر میں مزید بہتری کی گنجائش بھی برقرار ہے۔مزید ان آفات پر قابو پانے کے لیے زمینی سطح پر کام کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔اس میں نظریاتی مواد و عملی مظاہرے کے ساتھ ساتھ اسکولی نصاب میں بھی آفاتی انتظام کو بھی شامل کیا گیا ہے تا کہ طلبا میں اس کے تعلق سے بیداری لائی جائے اور ان آفات کے نقصانات کو مزید کمتر کیا

جا سکے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ نصابی کتب میں شامل آفاتی انتظام سے متعلق مواد کس حد تک معیاری ہے اس بات کا بھی تعین کرنا بے حد ضروری ہے۔

مطالعہ کی ضرورت و اہمیت: ہندوستان ایک وسیع و عریض، کثیر لسانی، ثقافتی و تہذیبی جمہوری ملک ہے۔ یہاں مختلف مذاہب و ادیان کے لوگ رہتے ہیں اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق صرف ہندوستان میں ہی ہر سال 80 ہزار لوگ حادثات میں مارے جاتے ہیں، جو ساری دنیا میں ہونے والے سڑک حادثات کے اموات کا 13 فیصد ہیں۔ ان حادثات میں مرنے والوں کی نصف تعداد 15 - 44 سال کے جوان لوگوں پر مشتمل ہے۔ 2000ء کے اعداد وشمار کے مطابق حادثات کی وجہ سے خام گھریلوں پیداوار (GDP) کا 3 فیصد نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ نصاب میں شامل ان آفاتی انتظام کے مواد کا وقتاً فوقتاً تجزیہ کیا جاتا رہے جس سے کہ نصاب میں شامل آفاتی انتظام سے متعلق مواد کو مزید معیاری بنایا جا سکے۔ اسی لئے ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ 2005 کو بنایا گیا جو ہندوستان میں ڈیزاسٹر مینجمنٹ کے لیے قومی، ریاستی اور ضلعی سطح پر قانونی اور ادارہ جاتی فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے محقق نے تلنگانہ کے سکنڈری اسکولی نصاب میں شامل آفاتی انتظام کے مواد کا تجزیاتی مطالعہ کا انتخاب کیا ہے نیز اس مقالہ کے ذریعے ریاست تلنگانہ کے ثانوی اسکولی نصاب کی خامیوں وہ خوبیوں کے ساتھ - ساتھ اسے مزید بہتر بنانے کے لئے موزوں و مناسب تجاویز کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

مطالعہ کے مقاصد: مطالعہ کے مقصد درج یہ ہیں:

1۔ ریاست تلنگانہ کے ثانوی اسکولی نصاب میں شامل آفاتی انتظام کے مواد کی خامیوں و خوبیوں کی نشاندہی کرنا۔

2۔ ریاست تلنگانہ کے ثانوی اسکولی نصاب میں شامل آفاتی انتظام کے مواد کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کرنا۔

مطالعہ کے حدود:

وقت اور وسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تجزیاتی مطالعہ ریاست تلنگانہ کے ایس.سی.ای.آر.ٹی. کے سماجی علوم کے آفاتی انتظام کے مواد تک محدود ہے۔ اس مطالعہ میں صرف جماعت نہم کے سماجی علوم مضمون میں شامل آفاتی انتظام کے مواد کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

تحقیقی طریقۂ کار: آفاتی انتظام کے مواد کا تجزیہ کرنے کے لئے "معیاری طریقۂ کار (Qualitative

Methodology) کا استعمال کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔
خوبیاں: 1۔ آفاتی انتظام کے متعلق بیداری پیدا کرنے کے لئے اساتذہ و بچوں کے ساتھ - ساتھ والدین کو بھی سرگرمیوں میں شامل کیا گیا ہے۔
2۔ انسان ساختہ آفات کے تحت ہوائی حادثات، فائر حادثات، دہشت گردی کے خطرات اور روزمرہ حادثات کو بخوبی واضح کیا گیا ہے اور ان سے ہونے والے خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔
3۔ اسی طرح آفاتی حالات کے پیدا ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے؟ کن چیزوں سے بچا جائے؟ دونوں پہلوؤں کو بحسن وخوبی اجاگر کیا گیا ہے۔
4۔ ہر ایک پیراگراف کے اختتام پر بچوں کی شمولیت کو یقینی بنانے کے لئے مختلف سرگرمیوں کو شامل کیا گیا ہے۔
5۔ تصور کی بہتر سمجھ کے لئے رنگین تصاویر کا استعمال کیا گیا ہے۔
6۔ حقائق و موزوں مثالوں کے ذریعہ مختلف تصاویر کی بہترین وضاحت کی گئی ہے۔
7۔ افواہوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہیں۔
8۔ آفاتی حالات میں سرکاری عملہ اور حکام کے تعاون کی بات کہی گئی ہے۔
9۔ مشتبہ چیزوں کو نہ چھونے اور اس کے قریب نہ جانے کی ہدایت دی گئی ہیں۔
10۔ مشتبہ چیزوں کو دیکھنے یا نظر آنے پر متعلقہ حکام کو اس کی اطلاع دینے کی بات کہی گئی ہے۔
خامیاں:۔ 1۔ آفاتی انتظام کے تعلق سے طلباء میں بیداری لانے کے لئے درسی کتب کے مواد میں ایسی سرگرمیوں کا فقدان ہے جس سے طلباء میں 'رول پلے' کے ذریعہ آفاتی انتظام کی بہتر سمجھ بوجھ پیدا کر سکے۔
2۔ نفس مضمون میں قدرتی آفات اور اس کے بچاؤ کا تذکرہ بہت کم کیا گیا ہے۔
3۔ آفاتی انتظام کے تحت آفات کی وجوہات میں صرف ایک پہلو؛ انسان ساختہ آفات کا ہی ذکر کیا گیا ہے۔
4۔ آفاتی انتظام سے متعلق نصاب میں شامل عنوانات کی وضاحت اور صراحت میں کمی پائی گئی۔
5۔ آفاتی انتظام سے متعلق نصاب میں مزید مضامین شامل کرنے کی گنجائش ہے۔ 6۔ آفاتی انتظام سے متعلق نصاب میں شامل مضامین میں عصر حاضر کے حادثات سے متعلق معطیات مطلوب ہیں۔
سفارشات/تجاویز: 1۔ آفاتی انتظام کے تعلق سے کچھ مواد کو مزید مؤثر بنانے کے لئے نظر ثانی کرنی

چاہئے۔

2۔انسانی ساختہ آفات کے ساتھ-ساتھ قدرتی آفات سے متعلق مواد شامل کیا جانا چاہئے۔

3۔ریاست تلنگانہ کے جماعت نہم کے علاوہ دوسری سطح کی نصابی کتب میں شامل آفاتی انتظام کے مضمون سے متعلق تحقیق کی ضرورت ہے۔

4۔آفاتی انتظام خصوصاً انسان ساختہ آفات کی وجوہات، اس کی روک تھام وان کے خطرات کو کم کرنے کی غرض سے مثبت انسانی رویہ کے فروغ کے لئے نصاب میں مواد کی شمولیت ہونی چاہئے۔

5۔نصاب میں خطرے اوراس کی تشخیص کا مناسب وموزوں نقشہ فراہم کرنا چاہئے۔

6۔نصاب میں انجینئرز اور آرکیٹیکٹس کے زلزلہ مزاحمت کی تعمیر کے بارے میں پیشہ ورانہ تربیت کے کردار کوواضح کرنا چاہئے۔

7۔فیکٹریوں کے قریب رہنے والی کمیونٹیز کے لیے کمیونٹی بیداری پروگراموں کے اہتمام سے متعلق اور صنعتی تباہی کی صورت میں لوگوں کو کیا کرنا ہے؟ اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟ اس سے متعلق بیداری کو نصاب میں شامل کرنا چاہئے۔

References

1. Aggarwal,J.C.(2009).Essentials of Educational Technology New Delhi: Vikas Publishing House Pvt. Ltd.

2. Ahuja,Ram.(2003).ResearchMethods.NewDelhi.:Rawat Publications.PP.193-210.

3. Sing, A.K. (2015) Research Methods in Psychology Sociology and Education, Motilal Banarasidash, Patna

4. Social Studies Class ix (SCERT Telangana) P.284-291

☆☆☆

Asad Badayuni ke Sheri Majmue"Dhoop ki Sarhad"ka Mauzuati Mutala by Shaista Sharif(Research Scholar,Dept.of Urdu, University of Jammu,Jammu)

شائستہ شریف (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں)

اسعدؔ بدایونی کے شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' کا موضوعاتی مطالعہ

اسعدؔ بدایونی کا اصلی نام اسعدؔ احمد تھا۔ان کا جنم ۲۵ فروری ۱۹۵۲ء کو یوپی کے شہر بدایوں کے قصبہ سہوان میں ہوا تھا۔والد کا نام حاجی محمد اور دادا کا نام حاجی عبدالرزاق تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ بعد میں حافظ صدیق اسلامیہ انٹر کالج سے ہائی سکول کی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں ۱۹۸۰ء میں حاصل کی۔یہیں سے انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اُردو سے منسلک رہے۔ان کی وفات ۵ مارچ ۲۰۰۳ء کو علی گڑھ میں ہوئی اور ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں انجام دی گئی۔

اسعدؔ بدایونی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنا پہلا شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' سے کیا۔ ان کے کل چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ''دھوپ کی سرحد'' (۱۹۷۷ء)، ''خیمہء خواب'' (۱۹۸۶ء)، ''جنونِ کنارہ'' (۱۹۹۲ء) اور ''نئی پرانی غزلیں'' (۱۹۹۷ء) قابلِ ذکر ہیں۔

اسعدؔ بدایونی جدید شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔اس شعری مجموعے میں خالص غزلیہ شاعری پائی جاتی ہے۔اسعدؔ بدایونی نے اپنی غزل کے ذریعے اُردو شاعری میں نئے نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔جہاں تک شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد کی بات کی جائے تو اس میں موضوعات کا خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔اسعدؔ بدایونی نے خود کو محدود دائرے میں قید نہیں کیا بلکہ وسیع فضاؤں میں پھیلا دیا۔انہوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات کی ترجمانی نہایت مستحکم انداز سے کی اسعدؔ نے اپنے تخلیقی سفر کی شروعات ''دھوپ کی سرحد'' لکھ کر کی۔اس مجموعے کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جو چیز سب سے پہلے متاثر کرتی ہے وہ ان کی غزلوں کا حزنیہ اور پرسوز لب ولہجہ ہے۔یہ ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ان کی شعری جہات کا

اعتراف کرتے ہوئے راشد انور راشد لکھتے ہیں:۔

''غزل کے موجودہ منظرنامے میں اسعدؔ کے اشعار منفرد لہجے کی بنا پر صاف پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے موضوعات کی سطح پر جہاں غزل کو بدلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بنایا۔ وہیں پیش کش کی سطح پر کلاسکیت کے اعلیٰ قدروں کی آمیزش کی۔ اس طرح ان کے یہاں غزل کا ایک نکھرا ہوا انداز سامنے آیا جو اسلوب کی سطح پر قاری کو متاثر کرنے میں کامیاب تھا۔ روایت اور جدیدیت کا مشترکہ رنگ، لفظیات کی سطح پر اسعدؔ کی غزلوں میں اپنا جادو جگاتا ہے۔ ان کے اشعار میں عصری زندگی کے نت نئے مسائل کے ساتھ تہذیب معاشرت اور تاریخی تسلسل کی انوکھی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔'' [۱]

اسعدؔ بدایونی نے شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' میں جن اہم موضوعات کو اپنے منفرد انداز میں بیان کیا ہے ان میں حیات و کائنات، بے حسی، بہترین زندگی کی آرزو، شہر اور گاؤں کی زندگی، فطری مناجات، ہجر و وصال، لاحاصلی، انانیت، تصورِ عشق، جدید دور میں رونما ہونے والا غیر متوقع تبدیلیاں، اعلیٰ انسانی اقدار کی پامالی، خوف و دہشت کا ماحول ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنا وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسعدؔ بدایونی کا نام جدید شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ ''دھوپ کی سرحد'' کا شاعر کم عمر ہے۔ لیکن اُن کی شاعری میں موضوع اور زبان و بیان کے حوالے سے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی غزلوں میں عشق کا موضوع بہت کم اشعار میں پایا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں عشق کا تصور بدلا ہوا ملتا ہے۔ جو بالکل روایتی معلوم نہیں ہوتا۔ نمونے کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں:

تیری رفتار سمجھتے ہیں صبا کا چلنا　　　پھولوں کا کھلنا تیری جنبشِ لب جانتے ہیں

اسعدؔ بدایونی نے اپنی غزلوں میں عشق کے موضوع کے بعد ہجر و وصال کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میرے لئے وہ بدن ترض خواب آور تھا　　　مگر وصال نہ ہونا مرا مقدر تھا

ہجر کے موسم کی یادیں وصال کی راتوں میں ہیں　　　کچھ گلے شکوے یقیناً سب مناجاتوں میں ہیں

یہ درد ہجر تو ہے ٹوٹتے نشے کی طرح　　　وہ قربتوں کا زمانہ شراب جیسا تھا

مذکورہ اشعار کو ہجر و وصال کے مختلف کیفیات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ہجر و وصال کے تعلق سے اسعدؔ کا ایک فلسفیانہ بیان ملتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعری پوری طرح سے ان کیفیات سے واتضیت نہیں رکھتا۔ اسعدؔ نے اپنی تنہائی کا ذکر بھی اشعار میں کیا ہے۔ اس تنہائی میں رہ

کر بھی وہ ہجر و وصال کی باتیں نہیں بھولتے۔عمران عظیم ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

''اسعدؔ بدایونی نے ہجر و وصال کی کیفیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے شعری منظرنامے کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے یہاں ہجر و وصال کی سطحوں پر بننے والے شعری پیکر کیفیات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی خط کوتصور کرتے ہیں۔اسعدؔ نے ہجر و وصال کے توسط سے عصری صورت حال کی تصویر کشی میں بیان کی شگفتگی کا اظہار کیا ہے۔''۲؎

اسعدؔ بدایونی نے اپنی غزلوں میں غم کی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے۔ان کے یہاں خاص طور پر غم جاناں اور غم دوراں سے متعلق اشعار ملتے ہیں۔زندگی میں آنے والی تکلیفوں اور غموں کو برداشت کرنے کا حوصلہ ان کے اشعار کو پڑھ کر ملتا ہے۔غم کے موضوع کو منفرد انداز میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

اس غم نے ہی عطا کی ہے بلندی مجھ پر　　　جس کو سب میری تباہی کا سبب جانتے ہیں
بچھڑنے والوں کی یادوں سے دل ہی دُکھتا ہے　　　گذشتہ لمحوں کو کرنا شمار بے معنی

اسعدؔ بدایونی کے یہاں ''انا'' ایک بیش بہا چیز ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کی ڈگر ہموار کرتا ہے۔ یہاں غزل گو اپنی انا کر مختلف مفاہیم عطا کر کے ایک حسین پیرایہ اظہار کے طور پر کچھ اس طرح پیش کرتا ہے۔

میں سائباں تھا ہر قسم کے لئے اسعدؔ　　　ہر ایک دھوپ سے جھلسا میری نجات کے بعد
ٹوٹ جاؤں گا مگر سر نہ جھکاؤں گا کبھی　　　مجھ میں ہر لحظہ شجر کی سی انا پاؤ کے

اسعدؔ بدایونی کی غزلوں میں انانیت کے پہلو کے سلسلے میں راشد انور راشد اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:۔

اسعدؔ بدایونی نے اپنی غزلوں میں اپنے گرد و پیش کے حالات اور روح عصر کی ترجمانی نہایت مستحکم انداز سے کی ہے۔ وہ اپنے آس پاس کے ماحول میں رونما ہونے والی تبدیلی کو نہایت سیدھی سادی تراکیب اور لفظیات کے استعمال سے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

یہ راستے جو دھوپ سے تپتے ہیں آج کل　　　ان سے وہ سایہ دار شجر کون لے گیا
میں نے سمجھا تا کہ ہر سمت صدائیں ہونگی　　　اس نئے شہر میں ہر شخص ہی چپ چاپ نکلا

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' کی غزلوں میں موضوعات کا خاصہ تنوں ملتا ہے۔ اسعدؔ بدایونی نے بھی دوسرے جدید غزل گو شعراء کی طرح سائنسی اور صنعتی

انقلاب سے پیدا ہونے والے مسائل، کرب، سماجی آسودگی جسے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ شعری مجموعہ ''دھوپ کی سرحد'' میں پیش کئے گئے ہیں موضوعات دراصل جدیدیت رجحان ہی کی دین ہے۔ اسعدؔ نے اس مجموعے میں حُسن وعشق اور ہجر ووصال کے موضوعات کو بھی برتا ہے۔

حوالہ جات:

(۱) : راشد انور راشد، بعنوان: اسعدؔ بدایونی کی شعری کائنات، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۹۳

(۲) : عمران عظیم، بعنوان، اسعدؔ بدایونی: ایک ممتاز غزل گو، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء، ص: ۳۱۴

(۳) : راشد انور راشد، بعنوان: اسعدؔ بدایونی کی شعری کائنات، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، ۲۰۰۴ء، ص: ۹۲-۲۹۱

☆☆☆

Drama "Anarkali" Jadid Tanqeed-o-Tajziyati Mutala by Aftab Hussain Shah (Research Scholar dept.of Urdu,Banaras Hindu University,Varanasi)

آفتاب حسین شاہ (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

ڈراما ’’آنارکلی‘‘ جدید تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

ڈراما انارکلی ایک طویل ڈراما ہے جو تین باب (ایکٹ) اور تیرہ مناظر (سین) پر مشتمل ہے۔ باب اول (آغاز) عشق چار مناظر، باب دوم (وسط) رقص چار مناظر اور باب سوم (انجام) موت میں پانچ مناظر ہیں۔ ڈراما انارکلی ایک سچا واقعہ ہے یا پھر فرضی کہانی اس بارے میں کوئی پختہ ثبوت موصول نہیں ہوتے۔ اگر چہ کئی محققین اور ادب شناس لوگوں نے اسے فرضی قصہ تصور کیا ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ فرضی قصہ ہے تو کس کے ذہن کی تخلیق ہے، کس صدی سے رائج ہے۔ اس بارے میں کسی محقق نے رائے قائم نہیں کی۔ وہیں اگر ڈراما انارکلی کا قصہ حقیقت پر مبنی ہے تو مورخین نے اس بارے میں سرسری طور پر بھی کچھ رقم نہیں کیا۔ لاہور میں انارکلی کا مقبرہ آج بھی سیاحوں کی زینت بنا ہوا ہے۔ قبر کے تعویذ کی فنکارانہ سنگ تراشی اور تعویذ پر شہزادہ سلیم کے شعر کا کندہ ہونا اور مقبرے کی تکمیل کی تاریخ ایسے شواہد ہیں جن سے یہ قصہ حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ قصے میں مغل سلطنت، شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر، شہزادہ سلیم اور رانی جیسے باوقار کرداروں کو مرکز بنایا گیا ہے جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ قصہ شہنشاہ اکبر کے عہد کا ہے اور ممکن ہے کہ حقیقی بھی ہو جسے اکبر نے سلطنت، قوم اور عوام کے چلتے پسِ پردہ رکھنے کا حکم دے کر پابندی عائد کر دی ہو جو ان کی وفات کے بعد ایک قصہ کی شکل میں لوگوں کے سینے میں دفن ہو کر زبانی روایات میں ارتقا کا سفر طے کرتا رہا جسے بعد میں فرضی کہانی کا نام دیا گیا جس کا انکشاف امتیاز علی تاج خود کتاب کے دیباچے میں بھی کرتے ہیں کہ:۔

’’میرے ڈرامے کا تعلق محض روایت سے ہے۔ بچپن سے انارکلی کی فرضی کہانی سنتے رہنے سے حسن اور ناکامی و نامرادی کا جو ڈراما میرے تخیل نے مغلیہ حرم کی شوکت و تجمل میں دیکھا تھا اُس کا اظہار ہے‘‘۔ (دیباچہ انارکلی، مرتب ڈاکٹر محمود الٰہی۔ ص۔ ۲۳)

پلاٹ:۔ ڈراما ’’انارکلی‘‘ کا پلاٹ شہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت پر مبنی ہے۔ جس کا انجام ایک المیہ ہے۔ یہ دو دلوں کی محبت کی داستان ہے جسے تاج نے آغاز، ارتقا اور انجام کی تقسیم سے ظاہر کیا ہے

چنانچہ انھوں نے ابتدا کو' عشق' ارتقا کو' رقص' اور انجام کو' موت' سے ظاہر کیا ہے۔ ڈرامے کے ابتدائی حصے یعنی عشق میں چار مناظر ہیں۔ پہلے منظر میں انارکلی اور دل آرام کا مختصر تعارف اور رقابت کو دیکھایا گیا ہے۔ دوسرے منظر میں شہنشاہ اکبر کی پدرانہ شفقت کے علاوہ شہزادہ سلیم اور انارکلی کے درمیان محبت کا اظہار ہے۔ تیسرے منظر میں انارکلی، اس کی بہن ثریا، بختیار، ستارہ اور زعفران نیز تمام کرداروں کا تعارف اور ذکر ہے۔ چوتھے منظر میں سلیم اور انارکلی کی پائیں باغ میں ملاقات کو دیکھایا گیا ہے۔ ڈرامے کے ارتقائی حصے یعنی رقص کے بھی چار مناظر ہیں۔ پہلے منظر میں سلیم کا ایوان ہے جہاں سلیم اور بختیار رازِ عشق پر محوِ گفتگو ہیں۔ وہیں سلیم دل آرام کو طلب کر کے اپنی محبت اور انارکلی سے باغ میں ہوئی ملاقات کی رازداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ دل آرام بھی اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے اور افشائے راز کی دھمکی دے کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے لیکن اس گفتگو کے درمیان بختیار آ کر دل آرام کے ارادوں پر پانی پھیر دیتا ہے اور اُسے مجبوراً معافی مانگنی پڑتی ہے۔ دوسرے منظر میں انارکلی کے حجرے کی تصویر کشی کی گئی ہے تیسرے اور چوتھے منظر میں قلعہ لاہور اور شیش محل کے تمام مناظر کو دیکھایا گیا ہے۔ جہاں جشن نوروز، رقص و موسیقی، مکر و فریب، رازِ عشق کا فاش ہونا اور انارکلی کا زنداں میں قید کروانا جیسے مناظر کو بڑی ہنرمندی اور شائستگی سے پیش کیا ہے۔ واقعات پہ در پہ پیچیدہ ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپسی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت شدید ہوتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے یعنی ڈرامے کا نقطہ عروج، تصادم یا کلائمیکس اس حصے میں ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا ڈراما انجام یعنی موت کی طرف بڑھتا ہے۔ اس حصے کے پانچ مناظر ہیں پہلے اور دوسرے منظر میں سلیم کا ایوان اور زنداں کے منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جہاں سلیم کا زنداں میں انارکلی سے ملنا اور داروغۂ زنداں کی چالاکیوں کو دیکھایا گیا ہے۔ منظر سوم میں اکبر کی خواب گاہ، سلیم کو نشہ آور عرق سے بے حوش کرنا اور داروغہ کی دروغ گوئی و غلط بیانی کی منظر کشی کی گئی ہے۔ منظر چہارم اور پنچم میں زنداں کا بیرونی منظر، انارکلی کا قتل اور اُسے دیوار میں زندہ چنوانا، سلیم کا حوش میں آنا اور دیوانگی کی حالت میں دل آرام کا گلہ گھونٹ کر مارنا اور سلطنت سے بغاوت کا علان کرنا، اکبر کا رنجیدہ ہونا وغیرہ مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔

کردار نگاری:۔ ڈراما انارکلی کے اہم کردار شہنشاہ اکبر، شہزادہ سلیم، انارکلی دل آرام، ثریا، بختیار، مروارید اور عنبر (دل آرام کی رازدار سہیلیاں)، ستارا اور زعفران (شوخ کنیزیں) اور رانی اہم ہیں۔ ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں اکبر اور سلیم کے درمیان ڈرامائی ٹکراؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکبر

دوراندیش اور روایات کا قائل ہے۔مگر جذبات پدری سے عاری نہیں ہے۔وہ ایک شفیق باپ، اچھا شوہر، بہترین سیاست دان اور پُروقار شہنشاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔اپنے اکلوتے بیٹے سلیم کی تربیت کا ہر لحاظ سے خیال رکھتا ہے۔مغلیہ سلطنت کو مضبوط و مستحکم بنانے کے ہر منصوبے پر غور وفکر کرتا ہے۔ان کی نظر میں مغلیہ سلطنت کا مستقبل شہزادہ سلیم سے روشن ہے اس لئے وہ شہزادے سے بظاہر سخت رویہ بھی اختیار کرتا ہے لیکن پدرانا شفقت اکثر حاوی نظر آتی ہے۔اکبر کے کردار میں ایک باپ کی شفقت، بیٹے کی تربیت اور مغلیہ سلطنت کے لئے سنجیدگی ان سب کے درمیان کشمکش ،ٹکراؤ اور تصادم تو دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان سے ڈرامے میں خوبیاں بھی پیدا ہوئی ہیں جو فنی نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔شہزادہ سلیم اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور مغلیہ سلطنت کا ولیِ عہد ہے۔ماں باپ کی بے پناہ شفقت اور لاڈ پیار سے جوان ہوا ہے وہ ایک جذباتی، سادہ لوح اور شاعرانہ مزاج کا حامل ہے۔محل کی ایک خوبصورت کنیز ’’انارکلی‘‘ سے محبت کرتا ہے لیکن محبت میں رازداری پر مکمل شعور حاصل نہیں ،دوسروں کے جزبات کو سمجھنے میں قاصر نظر آتا ہے انارکلی سے قبل دل آرام کے جزبۂ عشق سے ناواقف رہتا ہے وہیں باغ میں پہلی ملاقات کے دوران انارکلی سے اقرارِ محبت چاہتا ہے۔محبت میں ثابت قدم کے علاوہ جزباتی بھی نظر آتا ہے اظہارِ محبت کے بعد وہ تذبذب میں پڑھ جاتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کا تخت وتاج سنبھالے یا انارکلی کی محبت اور آخر جزبات میں بہہ کر انارکلی کے لیے بغاوت پر امادہ ہو جاتا ہے لیکن حالات سے عاری ہوتا ہے۔پہلے دل آرام کی دھمکیوں سے مرعوب ہوتا ہے پھر اُس کی شاطرانہ اور منافقانہ چالوں سے بے خبر رہتا ہے اور بار بار نقصان اٹھانے کے باوجود داروغہ زنداں کے مکروفریب میں آجاتا ہے۔حتیٰ کے انارکلی کی موت کے بعد بھی حوصلہ اور جُرات دیکھائی نہیں دیتی بلکہ آہ وپکار اور گریہ ذاری نظر آتی ہے۔مجموعی طور پر شہزادہ سلیم میں شعوری اور فکری عمل کی کمی دکھائی دیتی ہے۔بختیار کا کردار ڈرامہ کے کرداروں میں گرچہ ثانوی درجہ رکھتا ہے لیکن سب سے اہم اور متحرک رہنے والا کردار ہے۔ شہزادہ سلیم کا بچپن کا مخلص دوست ہے۔بے حد ذہین، دوراندیش اور بہترین تصورات وخیالات کا حامی ہے۔دربارِ مغلیہ کے نشیب وفراز ،شہنشاہ اکبر کے ذہن ،سلیم کے مزاج یعنی ہر اُس چیز سے واقف ہے جس سے خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔لہٰذا وہ سلیم کو موقع بہ موقع متوجہ کرتا رہتا ہے۔سلیم جب شاعری کرتا ہے تو اُسے حقیقت سے اگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ’’مغلوں کو مدبّر بادشاہوں کی ضرورت ہے وہ شاعر بادشاہ نہیں چاہتے‘‘۔اسی طرح سلیم جب انارکلی سے ملنے باغ میں جاتا ہے تو بختیار اُسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ یہ راز کھل جانے پر

آفت برپا ہوگی، دل آرام جب سلیم کو انارکلی سے محبت اور ملاقات کے راز سے آشنا کرتی ہے اور اپنے عشق کا علان کر کے دھمکی دیتی ہے تو اُس وقت بختیار آ کر دل آرام کو اس کی سازش سے ناکام کرتا ہے، وہ شہزادے کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیتا ہے ایک سچے اور وفادار دوست کی طرح اپنا حق ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول محمود الٰہی:

''تاج نے ایک ایسے کردار کی تخلیق کی ہے جس پر کبھی زوال نہ آئے گا۔ انارکلی سے بڑھ کر آج تک اُردو ڈرامے کو کوئی کردار نہ ملا۔ کردار وہی اچھا ہوتا ہے جو ہر زمانے کا ساتھ دے۔ جس کی دل کشی انقلابِ زمانہ کے باوجود کم نہ ہو۔ جس کے نقوش تاریخ کے ہر ورق پر ثبت ہوں۔ جس کی حرکت وعمل پر لوگ فخر بھی کریں اور رشک بھی۔ انارکلی کے کردار میں یہ خصوصیات پورے طور پر ملتی ہیں''۔

(انارکلی، سید امتیاز علی تاج، محمود الٰہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۹۷ء ص۔ ۷)

امتیاز علی تاج نے انارکلی کے ذریعے بہترین شخصیت، محبت وخلوص، جزبہِ سرشاری، ضبط واحتیاط اور ایثار وقربانی کا درس دیا ہے۔ بلاشبہ انارکلی کا کردار اس ڈرامے میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈرامہ انارکلی میں دل آرام کا کردار بھی کافی اہمیت کا حامل ہے گرچہ دل آرام نے ایک چالاک اور حاسد کردار کا کام انجام دیا ہے اور ایک خاموش اور حسین انتقام لیا ہے اس کے باوجود ڈراما انارکلی کا سب سے زیادہ متحرک کردار یہی ہے۔ دل آرام انارکلی سے قبل مغلیہ حرم کی حسین وجمیل، باوقار اور تمام کنیزوں میں ممتاز کنیز ہے۔ وہیں ایک ذہین، چالاک، حاسد اور ہوس پرست عورت بھی ہے۔ نادرہ کنیز کو شہنشاہ اکبر جب انارکلی کے خطاب سے نوازتا ہے تو اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے وہیں آگے چل کر جب انارکلی اور شہزادہ سلیم کو آپس میں ملتے دیکھتی ہے تو اپنے جذبہِ عشق کے اظہار کے علاوہ انتقام لینے کی سوچتی ہے۔ سلیم کے صاف انکار کے باوجود سہم نہیں جاتی بلکہ نڈر ہو کر افشائے راز کی دھمکی دیتی ہے، اس دوران بختیار کی وجہ سے معافی مانگ لیتی ہے لیکن اپنی خفیہ اور حریفانہ چال چلنے سے پیچھے نہیں ہٹتی اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے۔ دل آرام نہ صرف حرم سرا کے تمام کرداروں کے مزاج سے واقف ہے بلکہ اُن کی کمزوریوں اور نقل وحرکت پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔ اس کا مقصد نہ صرف سلیم کو حاصل کرنا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ ہندوستان کی ملکہ بننے کا خواب بھی دیکھتی ہے۔ ڈرامہ انارکلی میں اس کردار سے اگر چہ شدید نفرت کا احساس تو ہوتا ہے کہ دل آرام نے اپنے انتقام کے لئے وہ تمام مراحل طے کئے جس سے انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوا دیا گیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دل آرام جس کو دربارِ مغلیہ میں انارکلی سے قبل ایک کنیز کی حیثیت

سے جو مرتبہ حاصل تھا وہ انارکلی کی آمد سے جاتا رہا۔ ڈراما انارکلی میں ثریا کا کردار فعال نہ سہی لیکن حرکت وعمل کی فضا کو قائم رکھنے اور بہن کے تیں جوش وجزبہ، ہمدردی وانکساری رکھنے کی غرض سے اہمیت کا حامل ضرور ہے۔ ثریا انارکلی کی چھوٹی بہن ہونے کے علاوہ خوش باش اور چنچل مزاج کی بھی ہے۔ دربارِ مغلیہ میں رہ کر درباری شان وشوکت، جاوجلال اور آدابِ محفل سے باخوبی واقف ہے۔ شاہی رکھ رکھاؤ کی بدولت کافی ذہین تو ہے لیکن تجُربے سے خالی ہے۔ شہزادہ سلیم اور انارکلی کی محبت کی ہم راز اور ملاقات کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہن کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین رہتی ہے۔ وہ دل آرام کے مکروفریب سے واقف ہی نہیں بلکہ اُسے تنبیہہ بھی کرتی ہے کہ:

''دل آرام! تم آپا کو باتوں میں لے آؤ لیکن یاد رکھنا انارکلی کے ساتھ تم کو مجھ سے بھی نپٹنا ہوگا اور اگر تم شعلہ ہو تو میں بجلی ہوں۔ اگر مجھے شُبہ بھی ہو گیا کہ تم کوئی چال چل رہی ہو۔ کسی اُدھیڑ بُن میں لگی ہو تو تم جانتی ہو مجھے کیا کچھ معلوم ہے۔ یہ بجلی تمہیں پھونک کر راکھ کر دے گی'' (انارکلی باب دوم منظر دوم، مرتب ڈاکٹر قمر رئیس۔ سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۶۹ء: ص۔ ۱۰۲/)

مکالمہ نگاری: ۔ ڈرامے کے ارتقا کے سفر کو جاری رکھنے کے لئے مکالموں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مکالموں سے نہ صرف کرداروں کے زبان وبیان کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ڈرامے میں کش مکش، تذبذب اور تصادم بھی رونما ہوتا ہے۔ مکالمہ نگاری ڈرامے کا سب سے اہم جز ہوتا ہے۔ دراصل ڈراما میں عمل کے علاوہ کرداروں کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں مکالمے ہی کی شکل میں ڈراما کو آگے بڑھاتی ہیں۔ ڈراما انارکلی کے مکالمے طوالت کے لحاظ سے درمیانہ درجے کے ہیں۔ کرداروں کی زبان صاف سادہ، آسان اور عام فہم ہونے کے باوجود ادبی اور معیاری بھی ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ مختلف تراکیب کے ساتھ موقع ومناسبت کے لحاظ سے استعمال ہوئے ہیں۔ ڈراما کا ہر کردار موقع اور محل کے مطابق مغلیہ شان وشوکت اور شاہی محل کے آداب کا خیال رکھتے ہوئے گفتگو کرتا ہے۔ شہنشاہ اکبر کی باتوں سے ڈراما میں ادبی ماحول نظر آتا ہے پورے ڈراما میں ایک عالمانہ سنجیدگی چھائی ہوئی ہے۔ ڈراما انارکلی کی فضا رومانی بھی ہے انارکلی اور سلیم کی محبت کی یہ داستان اپنے اندر المیہ کے علاوہ رومانیت کی عکاسی بھی کرتی ہے۔ اس روایتی قصے میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہے کہ قاری سچ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ڈراما نگار نے مکالمہ نگاری کے مرحلے کو بڑی ہنر مندی اور کامیابی سے طے کیا ہے۔ ان کے مکالموں میں متعلقہ کرداروں کے طبقے، مزاج، مبلغ علم اور افکار واعمال کی جھلک نمایاں ہے۔ تاجؔ نے کرداروں کے طبقاتی فرق، حفظ مراتب اور شاہی محل کے آداب کا خاص خیال رکھا ہے۔ کرداروں

کے جذبات،احساسات، اُن کی نفسیات اور عمل و ردِعمل کی کیفیات کے اظہار کے لیے مناسب و موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ڈراما نگار نے روز مرہ الفاظ اور محاوروں کے استعمال سے ڈراما کے مکالموں میں روانی پیدا کی ہے اور معیاری لب ولہجہ قائم رکھا ہے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

وحدتیں:۔ فنی صلاحیتوں کے مدِنظر ڈراما "انارکلی ایک مکمل ڈراما ہے۔فنِ ڈراما کی تمام پابندیوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ڈراما میں موجود وحدتوں میں وحدت زمان، وحدت مکان، وحدت عمل اور وحدت تاثر موجود ہے۔ یہ ڈراما کوئی دو، چار، آٹھ گھنٹے یا دو چار دن میں ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کو کئی دن لگتے ہیں۔آغاز سے انجام تک جتنے بھی واقعات اس ڈراما میں رونما ہوئے ہیں تمام میں وقت کا تصور جا بجا دیکھائی دیتا ہے۔وہیں وحدتِ مکان بھی اس ڈرامے میں موجود ہے۔ڈراما انارکلی کا ماحول لاہور کا قلعہ اور شہنشاہ اکبر کا محل سرا ہے۔جہاں مغلیہ شان وشوکت، جاہ وحشمت اور جمال وجلال قائم ہے۔شہانہ عادات واطوار اور آداب وحفظِ مراتب کا خاص خیال رکھا گیا ہے وقتیہ رسم و رواج اور اصول وضوابط کی پوری پابندی کی گئی ہے۔تمام واقعات قلعہ لاہور میں دکھائے گے ہیں۔ڈراما انارکلی میں وحدتِ عمل بھی موجود ہے وہ اس لئے کہ اس ڈراما کا پلاٹ بے حد مضبوط اور مربوط ہے۔ڈراما میں شامل تمام ضمنی واقعات اور کردار یکجا ہیں اور اصل قصے سے براہ راست منسلک ہیں جس سے ڈراما میں اول تا آخر ایک ہی ماحول اور فضا یعنی داستانِ عشق ومحبت قائم ہے۔اس ڈراما کا انجام انارکلی کی موت، دل آرام کی موت شہزادہ سلیم کا دیوانہ پن اور مغلیہ سلطنت سے بغاوت، شہنشاہ اکبر کا رنج وملال اور شہزادہ سلیم وانارکلی کی محبت میں ناکامی ونامرادی ڈراما میں مکمل تاثر قائم کرتی ہے جس سے عام قاری کے دل میں بھی شدید احساس پیدا ہوتا ہے یہی احساس اس ڈرامے کا مجموعی تاثر ہے۔

موضوع اور زبان وبیان:۔ ڈراما انارکلی کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تاج نے اس ڈراما میں کوئی جدت اختیار نہیں کی لیکن اپنے جادوئی قلم سے وہ کام کیا جس کا وقت مطالبہ کر رہا تھا۔انھوں نے اپنے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر ماضی بعید کے معاشرے کو ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا ہے جس کے مطالعے سے قاری کے فکر وفن میں اضافہ ہوتا ہے۔موضوع کے اعتبار سے امتیاز علی تاج کا یہ ڈراما تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔تاج کی ڈراما نگاری سے اردو ڈرامے کی روایت کو جو فن حاصل ہوا وہ اعلا درجے کا ہے۔ڈراما انارکلی کی زبان جہاں صاف، سادہ، آسان اور عام فہم ہے وہیں ادبی اور معیاری بھی ہے۔عام الفاظ کے علاوہ عربی وفارسی کے الفاظ اور خوبصورت ترکیبوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔جن سے ڈراما کے حُسن میں مزید اضافہ ہوا ہے۔بقول رشید احمد صدیقی کہ مغلوں نے

ہمیں تین چیزیں دی ہیں ''غالبؔ، اردو اور تاج محل''۔ امتیاز علی تاجؔ نے اس بیان کی تعید میں مغلیہ شان وشوکت اور شاہی محل کے آداب والقاب کو حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے۔ چونکہ اردو کی نسبت اگر مغلوں سے ہے تو پھر اس نسبت سے ڈراما انارکلی میں اعلا اور معیاری زبان کا استعمال ہونا ڈرامے کی فنی خوبوں کو دوبالا کرتا ہے۔ بقول شمیم طارق:۔

''تاجؔ نے اس ڈرامے کے سارے پہلوؤں مثلاً ماحول، محل وقوع، جزئیات، کرداروں کے انداز وادا کے بیان، نفسیات اور زبان پر خصوصی توجہ دی ہے اور جس کردار کو جہاں پیش کردیا یا جس سے جو بات کہلوادی وہ پوری طرح موزوں اور حسبِ حال ہے۔'' (انارکلی، ایک ٹریجڈی تین باب میں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ ۱۹۴۱ء۔ ص۔۸)

ڈراما انارکلی کا پلاٹ فن کاری کا اعلا نمونہ ہے فنی اعتبار سے یہ ایک مکمل ڈراما ہے۔ پلاٹ کی مربوطی وتسلسل، حسنِ ترتیب، فنی کردار نگاری، ماحول کی عکاسی، وحدت مکاں، صاف ستھری زبان اور مجموعی تاثر اس ڈراما کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ تاجؔ نے اس ڈرامے کے فنی تقاضوں کو ترتیب وار، واقعات، زبان اور کرداروں کا اضافہ کر کے اسے ایک شاہکار کی حیثیت عطا کی ہے۔ مناظر اور مکالموں میں نرم لب ولہجہ، روانی اور تسلسل قائم ہے۔ پوری کہانی نہایت شستہ زبان اور پُرکشش ماحول کے ساتھ استعمال ہوئی ہے۔ وہیں کہیں کہیں لغزش بھی دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن ان لغزشوں سے ڈراما کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ ڈراما میں بوجھل الفاظ کا استعمال بھی کبھی کبھی طور پر دیکھنے میں آتا ہے لیکن یہ معمولی خامیاں ہیں جو خوبیوں میں دب جاتی ہیں۔ ڈراما انارکلی کی تخلیق سے امتیاز علی تاجؔ کے شاہانہ ذوق کا باخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈراما نگاری کی صنف کو بہترین انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے، ڈرامے کی عرق ریزی میں نیا رنگ اور ادائیگی میں دلچسپ ڈھنگ پیدا کیا ہے جس سے صنفِ ڈراما کو مزید ترقی حاصل ہوئی ہے۔

☆☆☆

Hamidi Kashmiri: Bahaisiyat Naqqad by Asra Bano(Research Scholar dept.of Urdu Banaras Hindu University Varanasi)

اسریٰ بانو (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

حامدی کاشمیری: بحیثیت نقاد

جموں وکشمیر قدرتی مناظر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔اس کی دلفریب خوبصورتی کے سبب اس کو آرضی جنت بھی کہا جاتا ہے۔ایک طرف قدرت نے جہاں اس کو حسین وجمیل مناظر عطا کئے وہیں دوسری جانب اس میں اعلیٰ پائے کے ادبا اور شعراء بھی گزرے۔جنھوں نے اپنی خدمات کے ذریعے جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو ترقی کی طرف متوجہ کیا۔اسی سرزمین سے ادب کا ایک اور درخشاں ستارہ طلوع ہوا جس نے اردو ادب کی دنیا میں حامدی کاشمیری کے نام سے شہرت و مقبولیت حاصل کی گرچہ حامدی کاشمیری نے اپنی زندگی کا سفر شعروشاعری سے شروع کیا جس کے بعد انہوں نے افسانہ اور ناول بھی لکھے۔تاہم ان کو شہرت ومقبولیت ایک نقاد کے حیثیت سے حاصل ہوئی۔بقول عبدالمنان طرزی۔

سنبلستان ادب کی ہے بہار اس سے فکروفن نے پایا ہے وقار
فن افسانہ ہو یا پھر شاعری اعتبار افزا ہے اس کی آگہی
نقد فن ہیں انکشفات جمیل ہیں دلیل ودعویٰ باہم اک فصیل

حامدی کاشمیری 29 جنوری 1933ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے ان کا حقیقی نام حبیب اللہ بٹ اور قلمی نام حامدی کاشمیری تھا۔عام رواج کے مطابق انہوں نے بھی شعروشاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا شاعری میں تخلص حامدی اختیار کیا۔جس کا اعتراف خود انہوں نے کچھ اس انداز میں کیا۔

''فارسی شعراء سعدی اور رومی کے تخلصوں کے زیر اثر میں نے اپنے لئے حامدی تخلص اختیار کیا اوراس کے انتخاب میں میں نے قران حکیم سے فال نکالا اور ''حامدون'' سے استفادہ کیا۔کچھ مدت کے بعد میں نے حامدی کے ساتھ کاشمیری بڑھایا۔'' (ص۔55)

حامدی کاشمیری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے شعروشاعری کے ساتھ ساتھ نثر وتنقید کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔حامدی کاشمیری نے اپنے تنقیدی کا آغاز 1960ء کے بعد کیا۔ابتدا میں انھوں نے چند تنقیدی مضامین لکھے۔لیکن باضابطہ طور پر ایک

نقاد کی حیثیت سے ان کی پہلی مستند تنقیدی تصانیف ''جدید اردو نظم پر یورپی اثرات'' ہے۔ جو دراصل ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا جسے انھوں نے عبدالقادر سروری کے زیر نگرانی تحریر کیا۔اس مقالے کی تیاری کے درمیان انھوں نے مغرب کے نئے افکار ونظریات کو قریب سے دیکھا پرکھا اور محسوس کیا جسنے ان کے اندر پوشیدہ تنقیدی صلاحیت کو جلا بخشی۔ ''جدید اردو نظم پر یورپی اثرات'' 12 ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں انھوں نے نظم کے معنی ومفہوم ،اس کی روایت کے ساتھ ساتھ زمانے کی تبدیلی نے کس طرح اردو نظم کو متاثر کیا اور پھر کس طرح اردو نظم نے مغربی اثرات کو کیا۔اس پر تفصیل کے ساتھ اپنے ہیتی نظریہ تنقید کو پیش کیا۔جدید اردو نظم پر یورپی اثرات حامدی کاشمیری کے تنقیدی سفر میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔حامدی کاشمیری جس وقت اپنے پی ایچ ڈی کا مقالہ جدید اردو نظم پر یورپی اثرات کی تیاری میں مشغول تھے یہ وہ دور تھا جب ترقی پسند ادبی تحریک کا زوال شروع ہو چکا تھا اور آہستہ آہستہ جدیدیت کا سورج طلوع ہو رہا۔جس کے سبب دنیا کے تمام ادب کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی نئے زاویہ نگاہ سے آگاہ ہو رہی تھی۔جس کا اثر حامدی کاشمیری پر بھی پڑا اور انہوں نے جدیدیت کے نقطۂ نظر سے معاصر اردو شاعری کا ایک تجزیاتی مطالعہ ''نئی حسیت اور عصری اردو شاعری'' کے عنوان سے کتاب لکھ کر پیش کیا۔جیسے جدید حسیت اور معاصر اردو شاعری کے حوالے سے اردو کی پہلی تنقیدی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔بقول کوثر مظہری:

''انھوں نے (حامدی کاشمیری) نے جدیدیت کے نقطۂ نظر سے معاصر اردو شاعری کا ایک تجزیاتی مطالعہ اپنی تنقیدی کتاب ''نئی حسیت اور عصری اردو شاعری'' میں پیش کیا۔اس کتاب میں انھوں نے جدیدیت کے تشکیلی عناصر سے بحث کی...اس کتاب میں انہوں نے نئی حسیت کو Define کرتے ہوئے ملکی اور عالمی سطح پر تمام تر تہذیبی رویوں اور سماجی قدروں میں ہو رہی تبدیلیوں کا احاطہ کیا۔'' کارگہہ شیشہ گری۔(ص۔17۔18)

حامدی کاشمیری کا تنقیدی سفر طویل رہا۔جس میں انھوں نے مختلف تنقیدی دبستانوں سے استفادہ کیا۔''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' جو کہ ان کی ایک مایہ ناز تصنیف ہے اس میں انھوں نے نفسیاتی طریق نقد کا استعمال کرتے ہوئے ''مرزا اسداللہ خان غالب'' کے شخصیت اور ان کے کلام کا مطالعہ کیا۔مرزا غالب اردو ادب کے ایک ایسے شاعر گزرے جن کے کلام میں روزانہ نئی جہتوں کی تلاش کی جا رہی ہے۔یوتو مرزا غالب پر بہت سے اہل فن اپنے نظریات کو پیش کر چکے ہیں۔لیکن حامدی کاشمیری کو اس بات کا دکھ تھا کہ کسی نے بھی مرزا غالب کے کلام کا مطالعہ شعور اور لاشعور کے زاویے

سے کیا۔ کتاب کی تحریر کی وجہ بیان کرتے ہوئے حامدی کاشمیری ''غالب کے تخلیقی سرچشمے'' کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

''غالب کی شاعری شخصیت اوران فن محض تحسین وستائش کے دایرے میں اسیر رہا یا زیادہ سے زیادہ پہلے سے طے شدہ نقطۂ نظران کے کلام پر منطق کر کے ساجی عوامل اور تاریخی حالات کے تجزیہ یں تشریح پر سارا زور صرف کیا گیا۔ یہ تشریحی عمل تنقید کی غرض وغایت یعنی تخلیقی تجزیہ وتحلیل کے عمل سے بہت دور تھا۔ اور ہمیں غالب کو روح میں اتار کران متنوع اور نادر تجربات کے قیمتی دفینوں تک لے جانے سے قاصر تھا جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ اور جو اردو شاعری کے لئے سرمایہ افتخار ہیں''

(دیباچہ غالب کے تخلیقی سرچشمے)

مارچ 1982ء میں جب حامدی کاشمیری کی تصنیف ''کارگہہ شیشہ گری'' شائع ہوئی۔ جس میں انھوں نے کلام میر کا مطالعہ ایک نئے طرز فکر میں پیش کیا جیسے انہوں نے ''اکتشافی تنقید'' کا نام دیا۔ اور میر کے متعلق ان گراں قدر حقائق کو پیش کیا جو اب تک تاریکی میں گمشدہ تھے۔ کارگہہ شیشہ گری حامدی کاشمیری کی ایک مایہ ناز تصنیف ہے جس میں انھوں نے میر فہمی کا ثبوت پیش کیا۔ اس کتاب کا عنوان بھی میر کے ایک مشہور شعر سے ماخوذ ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

اس کتاب میں حامدی کاشمیری نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ میر خاص طور پر ایک تخلیقی فنکار ہیں اوران کے شعری کمالات تمام تر وہبی ہیں۔ اکتسابی نہیں۔ جس کا اعتراف ان کے بعد آنے والے تمام شعرا نے کیا۔ اس کے باوجود میر کو علامہ اقبال اور مرزا غالب کے مقابلے میں کم لکھا گیا۔ حالانکہ چند اہل قلم نے میر کی شاعرانہ عظمت کو پیش کرنے کی کوشش کی تاہم یہ میر کی انفرادیت کو بیان کرنے کے لئے کافی نہ تھے۔ اپنے اس تصنیف میں حامدی کاشمیری نے اکتشافی نظریہ نقد کے تحت میر کی افتادطبع 'شخصیت' اورنفسیاتی کیفیات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انھوں نے میر کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے پہلے اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ کی کہ میر کا خارجی حقیقت کے تعین کیا رویہ تھا۔ وہ اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ میر کے تخلیقی شعور کا کوئی مطالعہ اس وقت تک جامع نہیں ہوگا جب تک کہ ان کے ذہنی رویوں کو ان کے عہد کے تناظر میں نہ دیکھا پرکھا جائے۔ ان کے خیال میں میر کے یہاں عصری شعور کی شدت اور گہرائی ان کی تخلیقات کے لئے اہم محرک رہی ہے۔ لیکن میر کے بیشتر نقادوں نے ان کی شاعری کو ان کے عہد کے تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کے سلسلے میں ان کی

تمام شعری کائنات کو ان کے عصری شعور سے منسوب کیا ہے۔ بقول شمس الرحمن فاروقی :

’’ کارگہہ شیشہ گری میر کی شاعری کو اندر سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ یہ میر کے لغوی معنی سے زیادہ اس کے داخلی منظر اور اس داخلی منظر کی علامتی اور بعد الطبیعیاتی جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔‘‘

(جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں مشمولہ انداز گفتگو کیا ہے۔ از شمس الرحمن فاروقی مکتبہ جامع لیمٹڈ ن ء دہلی۔1933 (ص۔89)

حامدی کاشمیری تنقید میں اس کشف کو مرکزی مقام دیتے تھے۔ جو شاعر الفاظ کے نئے رابطوں کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ جس کا تعلق براہ راست فنکار کی ذات و داخلی کیفیت سے ہوتی ہے۔ نیز ان کی نشاندہی بھی عقلی منطق اور استدلالی اصولوں کے ذریعہ ممکن نہیں کیونکہ حامدی کاشمیری کے خیال میں وہ عقل کے بجائے دھڑکتے ہوئے دل کے زیادہ قریب ہے۔ ان کی ہر تنقیدی تصنیف ایک منفرد نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے۔ جس نے ان کے ناقدانہ وقار کو بڑھایا۔ غالب اور میر کے ساتھ ساتھ انہوں نے علامہ اقبال اور ناصر کاظمی کے کلام کا بھی جائزہ لیا اور اس پر اپنی رائے پیش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے نظیر اکبر آبادی، حسرت موہانی، فانی بدایونی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض اختر الایمان، مظہر امام، شہریار، خلیل الرحمن آعظمی، ن۔م۔ راشد وغیرہ کے کلام کا لسانی اور ہیتی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں کہ:

’’ ڈاکٹر حامدی کاشمیری ان معدودے چند ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے اپنی منفرد سوچ کو بروئے کار لاکر اپنے طور پر نتائج مرتب کئے۔‘‘ (اکتشافی تنقید کی شعریات، وزیر آغا، مشمولہ کتاب نما خصوصی شمارہ، حامدی کاشمیری شخصیت اور ادبی خدمات (ص۔42)

حامدی کاشمیری ایک جدت پسند ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے جس بھی موضوع پر قلم اٹھایا اس کو پوری مہارت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کی تنقید نے اردو تنقید کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ انہوں نے جہاں میر و غالب کی شاعری کی دنیا کو جدیدیت کے عینک سے دیکھنے اور جانچنے، پرکھنے کی کوشش کی وہیں علامہ اقبال جیسے مایہ ناز شاعر کے شاعری میں پوشیدہ پیغام کو بھی سمجھنے کی سعی کی۔ انہوں نے اپنی تنقید کے لئے آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کیا جو اس کے لئے موزوں تھی۔ بحیثیت مجموعی حامدی کاشمیری ایک اعلیٰ پائے کے نقاد تھے انھوں نے اکتشافی تصور نقد پیش کر کے اردو تنقید کے میدان میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ انہوں نے اردو تنقید کو وسعت بخشی اور جدید تصور نقد سے اردو ادب کو روشناس کرایا۔ ☆☆☆

Hindustan mein siyasi shirkat ke zariye Khawateen ki khudmukhtari

by Dr.Shabana Kesar(Asst.Prof.dept.of women education MANUU

(Hyderabad)cell-9392303545

ڈاکٹر شبانہ کیسر (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ مطالعات نسواں، مانو، حیدر آباد)

ہندوستان میں سیاسی شرکت کے ذریعے خواتین کی خودمختاری

ہندوستان میں سیاسی شرکت کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانے سے مراد سیاست میں خواتین کی شرکت کو بڑھانے اور حکومت میں ان کی نمائندگی کو یقینی بنانے کی کوششیں ہیں تاکہ صنفی مساوات کو فروغ دیا جا سکے اور خواتین کو بااختیار بنایا جا سکے۔ سیاسی شرکت خواتین کو بااختیار بنانے کا ایک اہم پہلو ہے، کیونکہ یہ انہیں فیصلہ سازی کے عمل میں آواز اٹھانے، ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والی پالیسیوں کو تشکیل دینے اور رہنماؤں کو جوابدہ ٹھہرانے کے قابل بناتی ہے۔

ہندوستانی حکومت نے سیاست میں خواتین کی شمولیت کو بڑھانے کے مقصد سے کئی پالیسیاں نافذ کی ہیں، جن میں مقامی حکومتوں کے انتخابات میں خواتین کے لیے 33% نشستیں محفوظ کرنا اور خواتین امیدواروں کو مالی مدد فراہم کرنا شامل ہے۔ اس اقدام سے مقامی طرز حکمرانی میں حصہ لینے والی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے جس سے خواتین کی نمائندگی میں بہتری آئی ہے۔

مزید برآں، صنفی مساوات کو فروغ دینے اور سیاست میں خواتین کی حصہ داری بڑھانے کے لیے کئی تحریکیں چلائی جا رہی ہے، جس میں نچلی سطح کی کئی تنظیمیں خواتین کی سیاسی امنگوں کی حمایت کے لیے کام کر رہی ہیں۔ خواتین کے حقوق کے بہت سے کارکنوں کا یہ بھی ماننا ہے کہ بھارتی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کے طور پر کئی خواتین کے حالیہ انتخاب، اور قومی سیاست میں کئی خواتین رہنماؤں کے ابھرنے سے سیاسی منظرنامے میں خواتین کی شرکت میں اضافہ ہوگا۔ مزید یہ کہ سیاست میں خواتین کی تعداد میں اضافہ صنفی مسائل سے متعلق پالیسیوں اور قانون سازی پر مثبت اثر ڈال سکتا ہے۔ جب خواتین کو سیاسی قیادت کے عہدوں پر نمائندگی دی جاتی ہے، تو زچگی کی صحت، خواتین کے خلاف تشدد، اور خواتین کے لیے تعلیم اور روزگار کے مواقع تک رسائی جیسے مسائل کو ترجیح اور حل کیے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ موثر پالیسیاں اور پروگرام بن سکتے ہیں جو خواتین کی ضروریات

کو پورا کرتے ہیں اور صنفی مساوات کو فروغ دیتے ہیں۔مزید برآں، جب خواتین کو سیاسی طور پر بااختیار بنایا جاتا ہے،تو وہ رول ماڈل کے طور پر کام کرسکتی ہیں اور دوسری خواتین کو سیاست میں شامل ہونے کی ترغیب دے سکتی ہیں،اس طرح ایک مزید جامع اور نمائندہ سیاسی منظرنامہ بنانے میں مدد ملتی ہے۔

ایسا گمان ہے کہ امریکہ اور چین کے بعد ہندوستان 2030 تک دنیا کی تیسری سب سے بڑی معیشت بن جائے گا۔انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ) آئی ایم ایف (کے مطابق، ہندوستان کی معیشت امریکہ کی 1.6 فیصد کے مقابلے میں 6.8 فیصد بڑھے گی۔ معاشی ترقی کے باوجود ملکی معیشت، سیاست اور معاشرت میں خواتین کی شرکت اس رفتار سے نہیں بڑھ پا رہی ہے۔ہندوستان میں حالیہ دنوں میں انتخابات میں زبردست تضاد دیکھنے میں آیا ہے۔ ملک میں خواتین ووٹرٹرن آؤٹ میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ 2022 کے انتخابات میں حصہ لینے والی آٹھ ریاستوں میں سے سات میں خواتین ووٹرٹرن آؤٹ میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔

اگر چہ یہ امید افزا لگتا ہے،لیکن مقامی، ریاستی اور عام انتخابات میں خواتین ووٹروں کی تعداد کے لحاظ سے انتخابات میں خواتین کی نمائندگی کا تناسب نہیں بڑھا ہے۔لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ سیاست میں خواتین کی نمائندگی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ صنفی مساوات کے حصول اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ خواتین کو سیاست میں شرکت کے مساوی مواقع میسر ہوں،اس کے لئے پالیسی سازوں،سول سوسائٹی کی تنظیموں اور عام لوگوں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔

سیاست اور بیوروکریسی میں خواتین کا کیا حال ہے؟ سیاست میں 17 انٹر پارلیمنٹری یونین) آئی پی یو(کے مرتب کردہ اعداد وشمار کے مطابق، ہندوستان میں لوک سبھا میں خواتین کی تعداد 14.44 فیصد ہے۔الیکشن کمیشن آف انڈیا کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق، اکتوبر 2021 تک تمام اراکین پارلیمنٹ میں خواتین کی نمائندگی 10.5% ہے۔تمام ریاستی اسمبلیوں میں خواتین ایم ایل ایز کی نمائندگی اوسطاً 9% ہے۔اس سلسلے میں ہندوستان کی رینک پچھلے کچھ سالوں میں کافی نیچے گر گئی ہے۔ اس وقت یہ پاکستان، بنگلہ دیش اور نیپال سے بھی پیچھے ہے۔بیوروکریسی میں خواتین امیدواروں کے لیے مفت درخواستوں کی سہولت مرکز اور ریاستوں میں سول سروسز کی متعدد ملازمتوں میں خواتین کی شرکت کافی کم ہے۔

اس کے باوجود، انڈین ایڈمنسٹریٹو سروسز) آئی اے ایس (کے اعداد وشمار اور 2011 کی

مرکزی حکومت کے روزگار کی مردم شماری کے مطابق، اس کے کل ملازمین میں سے 11 فیصد سے بھی کم خواتین تھیں، جو 2020 میں صرف 13 فیصد تک پہنچ پائی ہے۔ مزید یہ کہ 2022 میں آئی اے ایس میں صرف 14% سکریٹریز خواتین تھیں۔ ہندوستانی ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام مناصب میں صرف تین خواتین چیف سکریٹریز ہیں۔ بھارت میں کبھی بھی کوئی خاتون کابینہ سیکرٹری نہیں رہی۔ وزارت داخلہ، خزانہ، دفاع یا عملہ کی بھی کوئی خاتون سیکریٹری نہیں ہیں۔

دیگر شعبے: مائیکرو، سمال اینڈ میڈیم انٹر پرائزز کی صرف 20.37% مالکان خواتین ہیں، 10% اسٹارٹ اپس کی بنیاد خواتین نے رکھی ہے، اور 23.3% خواتین لیبر فورس میں ہیں۔ سیاست اور بیوروکریسی میں خواتین کی نمائندگی کیوں کم ہے؟

پدرشاہی ذہنیت: ہندوستان بنیادی طور پر ایک پدرشاہی معاشرہ ہے، اور خواتین کو اکثر مردوں سے کمتر سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت معاشرے میں گہرائی سے جڑی ہوئی ہے اور اس پر اثر انداز ہوتی ہے کہ لوگ خواتین کی قیادت اور سیاسی شرکت کی صلاحیتوں کو کس طرح سمجھتے ہیں۔

سماجی اصول اور دقیانوسی تصورات: ہندوستان میں، خواتین سے اکثر روایتی صنفی کرداروں کے مطابق ہونے کی توقع کی جاتی ہے اور سماجی اصولوں اور دقیانوسی تصورات کی وجہ سے سیاست میں کیریئر بنانے کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ خواتین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بیویوں اور ماؤں کے طور پر اپنے کردار کو ترجیح دیں، اور سماجی اصولوں اور دقیانوسی تصورات کے مطابق سیاست کو عام طور پر مرد کا ڈومین سمجھا جاتا ہے۔

تعلیم تک رسائی کا فقدان: ہندوستان میں خواتین کو تاریخی طور پر تعلیم تک محدود رسائی حاصل ہے جس کی وجہ سے ان کی سیاست میں حصہ لینے کی صلاحیت میں رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں بہتری آئی ہے، لیکن بہت سی خواتین اب بھی سیاسی عہدہ کے لیے انتخاب لڑنے کے لیے ضروری تعلیم اور مہارت سے محروم ہیں۔ اینول اسٹیٹس آف ایجوکیشن رپورٹ)2020(کے مطابق، 6 سے 10 سال کی عمر کے 5.5% بچے اور 11 سے 14 سال کی عمر کے 15.9% بچے اسکول میں داخل نہیں ہوئے۔

سیاسی جماعتوں میں محدود نمائندگی: سیاسی جماعتوں میں خواتین کی اکثر نمائندگی کم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ان کے لیے پارٹی میں آگے بڑھنا اور انتخابات کے لیے پارٹی نامزدگی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ کم نمائندگی سیاسی جماعتوں کے اندر صنفی تعصب اور اس کے اثر کا نتیجہ ہے کہ خواتین

مردوں کے مقابلے میں کم منتخب ہوتی ہیں۔

تشدد اور ہراساں کرنا: سیاست میں خواتین کو اکثر جسمانی اور آن لائن تشدد اور ایذا رسانی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جو انہیں سیاست میں آنے یا مسائل پر بات کرنے سے روکتا ہے۔ محفوظ اور خوش آئند سیاسی جگہوں کی عدم موجودگی خواتین کی سیاسی شرکت میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔

غیر مساوی مواقع: سیاست میں خواتین کو اکثر غیر مساوی مواقع کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کم تنخواہ، وسائل تک کم رسائی، اور نیٹ ورکنگ کے کم مواقع۔ یہ عدم مساوات خواتین کے لیے سیاست میں جگہ بنانے اور مرد امیدواروں کا مقابلہ کرنے میں مشکل کا سبب بنتی ہے۔

ساختی بندشیں: خواتین کو بااختیار بنانے میں ساختی بندشیں، عمومی طور پر، بنیادی مسائل ہیں جو ان کے لیے سروسز کا حصہ بننا مشکل بنا دیتی ہیں۔ سروس کی شرائط جن میں دور دراز کے کیڈرز میں پوسٹنگ شامل ہے اور اس ملازمت کے تقاضوں کے ساتھ خاندانی وابستگیوں میں توازن کچھ ایسے سماجی عوامل ہیں جو خواتین کو سول سروسز سے دور کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ مزید برآں، ایک عام خیال ہے کہ سماجی بہبود، ثقافت، خواتین اور بچوں کی ترقی جیسی صافٹوز ارتوں کے لیے خواتین کو ترجیح دی جانی چاہیے۔ سیاست میں خواتین کی زیادہ مؤثر نمائندگی کیسے کی جا سکتی ہے؟

سیٹ ریزرویشن: سیاست میں خواتین کی نمائندگی بڑھانے کا ایک مؤثر ترین طریقہ قانون ساز اداروں میں خواتین کے لیے نشستیں محفوظ کرنا ہے۔ یہ کچھ ریاستوں جیسے بہار، اڈیشہ اور مغربی بنگال میں لاگو کیا گیا ہے، جہاں مقامی اداروں میں خواتین کے لیے مخصوص فیصد نشستیں محفوظ ہیں۔

سیاسی جماعتیں خواتین کی نمائندگی کو یقینی بنائیں: سیاسی جماعتوں کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے کہ انتخابات کے لیے امیدواروں کے انتخاب میں خواتین کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ انہیں خواتین امیدواروں کو بھرتی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور انہیں جیتنے کے قابل نشستوں پر ترجیح دینی چاہیے۔

تعلیم اور تربیت: خواتین کی سیاسی شرکت کی حوصلہ افزائی کے لیے تعلیم اور تربیتی پروگرام نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس سے خواتین کو اعتماد اور مہارت حاصل کرنے کے ساتھ سیاست کی پیچیدگیوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مقامی خواتین رہنماؤں کی شرکت کی حوصلہ افزائی کریں: خواتین کی سیاسی نمائندگی کو مقامی خواتین رہنماؤں کی شرکت کی حوصلہ افزائی اور حمایت سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ رہنمائی کے پروگرام اور دیگر

امدادی اقدامات اس مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔
سیاست میں خواتین کے خلاف تشدد کا ازالہ: سیاست میں خواتین کے خلاف تشدد ان کی موثر نمائندگی کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے اور سیاست میں خواتین کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے بیداری پیدا کرنا، محفوظ ماحول پیدا کرنا وغیرہ جیسے اقدامات کیے جائیں۔
سماجی اور ثقافتی رکاوٹوں کو دور کریں: پدرشاہی نظام اور صنفی تعصب سماجی اور ثقافتی رکاوٹوں کی مثالیں ہیں جو سیاست میں خواتین کی موثر نمائندگی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے تعلیم اور بیداری کے پروگراموں اور بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ اسکیم اور سوکنیا سمردھی یوجنا جیسے سماجی اصلاحی اقدامات کا استعمال کیا جانا چاہیے۔
کام اور زندگی کے توازن کے لیے مدد فراہم کریں: بہت سی خواتین اپنی سیاسی ذمہ داریوں کو اپنی ذاتی اور خاندانی ذمہ داریوں کے ساتھ متوازن کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ اس مسئلے کے لیے مدد فراہم کر کے حل کیا جا سکتا ہے، جیسے لچکدار نظام الاوقات، بچوں کی دیکھ بھال، اور والدین کی چھٹی وغیرہ اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد کر سکتے ہے۔
مرئیت اور شناخت میں اضافہ: سیاست میں خواتین کو ان کے کارناموں کے لئے زیادہ سے زیادہ نمائش اور پہچان دی جانی چاہئے۔ اس سے دوسری خواتین کو سیاست میں شامل ہونے کی ترغیب دینے اور سیاست میں زیادہ صنفی مساوات کا کلچر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔
خلاصہ: خواتین کی سیاسی شرکت اور خود مختاری ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور باہمی طور پر ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ ہندوستان میں خواتین کی سیاسی شرکت میں اضافہ صنفی مساوات کو فروغ دینے، نمائندگی اور فیصلہ سازی کو بہتر بنانے اور ملک کی ترقی اور پیشرفت میں اپنا کردار نبھانے میں مدد دے گا۔

☆☆☆

Aurangabad mein working class aur non working class Khawateen ka Izdwaji Adjustment by Chaudhry Qaisar Jahan|(Asst.Prof.DSR College of education,Aurangabad,M.S.)cell-9225317139

چوہدری قیصر جہاں (اسسٹنٹ پروفیسر: ڈی ایس آر کالج آف ایجوکیشن اورنگ آباد مہاراشٹر)

اورنگ آباد میں ورکنگ کلاس اور نان ورکنگ کلاس خواتین کا ازدواجی ایڈجسٹمنٹ

اس مقالے میں اورنگ آباد میں محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سروے کے تحقیقی ڈیزائن کو مطالعہ کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یہ نمونہ اورنگ آباد کے چار منتخب علاقوں جوبلی پارک، روضہ باغ، روشن گیٹ، نور کالونی، سے ملٹی اسٹیج بے ترتیب نمونے لینے کے طریقہ کار کے ذریعے منتخب کردہ تین سو (300) مضامین پر مشتمل تھا۔ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سوالنامے کا استعمال کرتے ہوئے ڈیٹا اکٹھا کیا گیا تھا جو محققین نے بنایا تھا۔ پہلے اور دوسرے مفروضے کو جانچنے کے لیے آزاد ٹی ٹیسٹ کے اعداد و شمار کا استعمال کیا گیا تھا جبکہ تغیر کا تجزیہ (ANOVA) تیسرے مفروضے کو اہمیت کی 0.05 سطح پر جانچنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین دونوں اپنی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی واضح فرق نہیں دکھاتی ہیں۔ خواتین کی تعلیمی کامیابی ان کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو متاثر نہیں کرتی ہے۔ وہ خواتین جو کم آمدنی والی حیثیت کی حامل ہیں وہ اسی حد تک ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا مظاہرہ کرتی ہیں جو کہ زیادہ آمدنی والی حیثیت کی حامل ہیں۔ نتائج کے مضمرات پر تبادلہ خیال کیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: اورنگ آباد، محنت کش طبقے کی خواتین، ازدواجی ایڈجسٹمنٹ، تعلیمی حصول۔

تعارف: اورنگ آباد ایک شہر کے طور پر سال 2023 تک اپنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے، اس طرح سماجی، اقتصادی، ثقافتی، سائنسی اور تعلیمی میدانوں کے ساتھ ساتھ خواتین کے روایتی کرداروں میں تبدیلیوں کے سلسلے سے گزر رہا ہے۔ اس تبدیلی نے خواتین کے روایتی کردار کو متاثر کیا ہے۔ اورنگ آباد کی خواتین سے گزشتہ برسوں میں متوقع روایتی کردار بچے پیدا کرنے والے اور گھریلو کردار رہے ہیں۔ اورنگ آباد خواتین مزدور قوت میں کاشتکاری، تجارت،

بُنائی جیسے پیشوں میں شامل رہی ہیں۔ دوسرے جنہوں نے شادی سے پہلے تربیتیا اپرنٹس شپ کے ذریعے کچھ مہارتیں حاصل کی تھیں، ان مہارتوں کے استعمال سے وہ روزی کماتے ہیں جس سے ان کے خاندانوں کی مدد ہوتی ہے، جب وہ شادی کر لیتے ہیں۔ وہ خود روزگار بن جاتی ہیں یا اپنے شوہروں کے ساتھ شراکت میں داخل ہوتی ہیں(Ordu and Igbude, 2006)۔ وودری (2010) نے زور دے کر کہا کہ متوسط طبقے کے کچھ معاشروں میں کثیر ازدواجی خاندانوں کی ایک وجہ یہ تھی بیویوں اور بچوں کی خواہش جو سب سے سستا کام کریں گے۔

گھر میں ذمہ داریوں اور مطالبات میں محنت کی شکل۔لڑکیاں کھانا پکانا اور چھوٹوں کی دیکھ بھال کرنا سیکھتی ہیں اور گھریلو ہنر بھی اپنی ماؤں سے حاصل کرتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ خاندان کے روایتی سیٹ اپ سے کہ معاشی سرگرمیاں گھر سے گہرا تعلق رکھتی تھیں، حالیہ دنوں میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں جس سے خاندان کا انتظام متاثر ہوا ہے۔خواہ خواتین کسان ہوں یا تاجر یا تنخواہ دار روزگار، خاندان میں ان کا معاشی اور انتظامی کردار ان کی خودساختہ تصویر کا ایک اہم حصہ ہے۔ وہ اب صرف " گھریلو خواتین " یا" مائیں" نہیں ہیں بلکہ مخصوص معاشی سرگرمیوں سے منسلک ہیں جو انہیں تحفظ اور خودمختاری دیتی ہیں۔ ان تبدیلیوں نے خواتین کے لیے نئے معاشی مواقع پیدا کیے ہیں، اس طرح خواتین کی حیثیت متاثر ہوئی ہے اور اب عالمی سطح پر تیزی سے توجہ حاصل کر رہی ہے (Ordu and Igbude, 2006)۔ Adegoke1987 نے زور دے کر کہا کہ ادب میں کافی ثبوت موجود ہیں کہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ترقی پذیر ممالک میں خواتین کی لیبر فورس کی شمولیت میں زبردست تبدیلیاں آ رہی ہیں، بشمول ہندوستان۔ 2020 میں خواتین کے تعلیمی پروگرام کے آغاز سے NPE نے خواتین کے مساوی حقوق کے لیے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا ہے۔

ان کی تعلیمی اور قومی امنگوں میں مواقع: تعلیم نئی اقدار اور نظریات کے حصول کا باعث بنی ہے، جس کے نتیجے میں خاندانی ڈھانچے اور سماجی نظام دونوں میں تبدیلی آئی ہے اس لیے وہ فائدہ مند ملازمت کرنے کے قابل بناتی ہیں اور بعدازاں آمدنی حاصل کرنے والی بنتی ہیں اور اس طرح اپنے شوہروں کی مالی مدد کرتی ہیں، باہر کی مختلف کوششوں میں حصہ لیتی ہیں۔ گھر اور آخر میں ان کے خاندانوں کی منصوبہ بندی میں مدد کرتے ہیں۔ 1991 کی مردم شماری کے تخمینے کے مطابق اورنگ آباد کی کم از کم 25% خواتین ورک فورس میں شامل ہیں خواتین اب انسانی کوششوں کے مختلف پہلوؤں جیسے کہ تدریس، نرسنگ، بینکنگ، ہیلتھ ورکرز، ڈاکٹروں اور دیگر بہت سے لوگوں میں شامل ہیں۔ تعلیمی

حصول کا نتیجہ سمارٹ اینڈ اسمارٹ (1980) نے مختلف تعلیمی سطحوں والے جوڑوں کے بارے میں اپنے مطالعے میں پایا کہ تعلیمیافتہ جوڑے اپنے شریک حیات اور بچوں کے ساتھ بات کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، وہ میاں بیوی اور بچوں کے جذبات اور رائے کے اظہار اور قبول کرنے کی اہمیت پر یقین رکھتے ہیں۔ Orden and Bradbum 1968) کا نظریہ مختلف تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ کم تعلیمیافتہ افراد میں تناؤ اور اجتماعیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

زیادہ تر غیر کام کرنے والی مائیں کل وقتی گھریلو خواتین ہیں جو اپنا زیادہ تر وقت گھر میں اپنے بچوں، شوہر اور گھریلو کام کاج میں گزارتی ہیں، انہیں آزادی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے دن گزاریں اور جب بھی وہ اپنے گھر جانا چاہیں گھر آ سکتی ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں وہ محنت کش طبقے کی خواتین/ ماؤں سے مختلف ہیں جو کام پر باس کے اختیار میں ہیں، اس لیے اپنی مرضی سے گھر نہیں جا سکتیں۔ روجرز اور مئی (2003) کے مطابق، شادی اور ملازمت کی اطمینان کا معیار ایک دوسرے سے متعلق ہے؛ ازدواجی خوشی میں اضافہ کام کی اطمینان میں اضافہ اور ازدواجی خوشی میں اضافے کا تعلق ملازمت کی اطمینان میں کمی سے نمایاں طور پر ہے۔ نتھاوت اور ماتھر (1993) نے پایا کہ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے سلسلے میں، کام کرنے والی خواتین نے گھریلو خواتین کے مقابلے میں نمایاں طور پر بہتر ازدواجی ایڈجسٹمنٹ اور ذہنی صحت کی اطلاع دی۔ انہوں نے عام صحت، زندگی کی تسکین اور خود اعتمادی کے اقدامات میں گھریلو خواتین سے بھی زیادہ اسکور حاصل کیا۔ lloyd1980) جس نے پایا کہ سماجی و اقتصادی حیثیت ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا ایک اہم عنصر ہے، ان کا خیال تھا کہ آمدنی جتنی زیادہ ہوگی، طلاق کا امکان اتنا ہی کم ہوگا۔ محنت کش طبقے کی خواتین کے اندر، کوثر (2003) نے کام کرنے والی خواتین میں ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے پیشینوں کے طور پر شخصیت کی خصوصیات اور سماجی و اقتصادی حیثیت کے مطالعہ میں دریافت کیا کہ کم، متوسط اور اعلیٰ سماجی اقتصادی پس منظر کی کام کرنے والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے درمیان فرق اعداد و شمار کے لحاظ سے اہم نہیں تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ ان کے سماجی و اقتصادی پس منظر پر منحصر نہیں تھی، بلکہ اس کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں عورت کیشخصیت کی خاصیت ایک عنصر تھی۔

خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو بڑھانے اور تحفظ فراہم کرنے کے لیے بہت کچھ نہیں کیا گیا، چاہے وہ محنت کش طبقہ ہو یا نہیں، اس طرح خاندانی ڈھانچے اور پرامن خاندانی وجود کو

خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ نائیجیریا کے آگے بڑھنے کے لیے، اس کی بنیادی اقدار خاندانوں میں ہیں، اس لیے کمیونٹیز کو محفوظ اور محفوظ رکھنا چاہیے۔ اس پس منظر کے خلاف ہے کہ محققین نے یہ مطالعہ ایک عورت کی مختلف سطحوں کی تعلیم اور اس کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ پر اس کے گھر سے باہر کام کرنے کے مضمرات کی تحقیقات کے لیے کیا ہے۔ اس کام کے مقصد کے لیے محنت کش طبقے کی خواتین ان خواتین کو کہتے ہیں جنھوں نے گھر سے باہر ملازمت کی ادائیگی کی ہو جبکہ غیر محنت کش طبقے کی خواتین ان خواتین کو کہتے ہیں جو کل وقتی گھریلو خواتین ہیں۔

مفروضے: مطالعہ کی رہنمائی کے لیے درج ذیل کالعدم مفروضے وضع کیے گئے ہیں۔ HO1: محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

Ho2: کم یا زیادہ آمدنی والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ Ho3: مختلف تعلیمی سطحوں والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

طریقہ کار: ڈیزائن: محنت کش طبقے اور نان ورکنگ کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا اندازہ لگانے کے لیے مطالعہ کے لیے ایک سروے ریسرچ ڈیزائن کا استعمال کیا گیا۔

آبادی: اورنگ آباد (مقامی حکومت کی آبادی اور مردم شماری بیورو) میں آبادی 96,000 محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین پر مشتمل تھی۔

نمونہ: آبادی سے، اورنگ آباد شہر کے چار علاقوں جوبلی پارک، روضہ باغ، روشن گیٹ، عارف کالونی سے متعدد مراحل کے نمونے لینے کے طریقہ کار کے ذریعے تصادفی طور پر تین سو (300) مضامین کا نمونہ منتخب کیا گیا۔

آلہ سازی: محققین نے مطالعہ کے لیے ڈیٹا اکٹھا کرنے کے لیے ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا سوالنامہ تیار کیا، اس آلے کا پائلٹ طور پر شہر کے مختلف علاقوں میں تجربہ کیا گیا۔ ٹیسٹ ریسٹ کی وشوسنیتا 0.86 اور مواد کی درستگی 0.88 تھی۔ سوالنامے میں 30 آئٹمز ہیں، اس کا چار نکاتی پیمانہ ہے جس میں سختی سے اتفاق، اتفاق، اختلاف، سختی سے اختلاف ہے۔

انتظامیہ: سوالنامے جواب دہندگان کے بھرنے کے بعد محققین کے ذریعہ زیر انتظام اور جمع کیے گئے تھے۔

ڈیٹا کا تجزیہ: ڈیٹا کا تجزیہ آزاد ٹی ٹیسٹ اور تغیرات کے تجزیہ (ANOVA) شماریاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے کیا گیا۔

نتائج: حسابی ٹی ویلیو (3.16-) اہمیت کی 0.05 سطح پر اہم قدر (1.96) سے کم ہے، df= 298۔اس طرح کا لعدم مفروضہ قبول کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔حسابی ٹی ویلیو (10.32-)اہمیت کی 0.05 سطح پر اہم قدر(1.96) سے کم ہے df=298۔اس طرح کا لعدم مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس لیے کم اور زیادہ آمدنی والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں گروپ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی اعلیٰ ڈگری ظاہر کرتے ہیں۔حسابی f قدر (1.795) اہم f قدر (1.85) سے کم ہے۔نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ مختلف تعلیمی سطحوں والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔اس طرح باطل مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔

بحث: پہلے تحقیقی مفروضے (ٹیبل 1) کے نتیجے سے معلوم ہوا کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سوالنامے کے ذریعے ماپا جاتا ہے۔رائٹ (1978) نے اپنی تحقیق میں اس تلاش کی تائید کی۔اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین اور کل وقتی گھریلو خواتین دونوں کے فوائد اور اخراجات ان سے منسلک ہیں۔تاہم، Adegoke (1987)، Nathawat اور Mathur 1993)) اور Rogers and May 2003) کا خیال ہے کہ محنت کش طبقے کی خواتین عام طور پر غیر کام کرنے والی خواتین کی نسبت اپنی زندگی اور شادی سے زیادہ مطمئن ہوتی ہیں۔ان نتائج کے درمیان فرق ثقافتی اختلافات سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے مفروضے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ آیا کم اور زیادہ آمدنی والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی فرق ہے۔نتائج (ٹیبل 2) نے انکشاف کیا کہ خواتین کے دونوں زمروں کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔کوثر (2003) کے کام سے معلوم ہوا کہ محنت کش طبقے کی خواتین کے اندر، سماجی و اقتصادی پس منظر ان کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں شماریاتی لحاظ سے اہم عنصر نہیں تھا۔اس مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت کی خصوصیات نے ان کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں ان کے سماجی و اقتصادی پس منظر سے زیادہ کردار ادا کیا۔ یہ تلاش متفق نہیں ہے۔جدول 3۔مختلف تعلیمی قابلیت کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں تغیر کا یکطرفہ تجزیہ۔

انتظامیہ: سوالنامے جواب دہندگان کے بھرنے کے بعد محققین کے ذریعہ زیرانتظام اور جمع کیے گئے تھے۔

ڈیٹا کا تجزیہ: ڈیٹا کا تجزیہ آزاد ٹی ٹیسٹ اور تغیرات کے تجزیہ (ANOVA) شماریاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے کیا گیا۔

نتائج: حسابی ٹی ویلیو (3.16-) اہمیت کی 0.05 سطح پر اہم قدر (1.96) سے کم ہے، df= 298۔ اس طرح کالعدم مفروضہ قبول کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ حسابی ٹی ویلیو (10.32-) اہمیت کی 0.05 سطح پر اہم قدر (1.96) سے کم ہے، df= 298۔ اس طرح کالعدم مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔ اس لیے کم اور زیادہ آمدنی والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ دونوں گروپ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی اعلیٰ ڈگری ظاہر کرتے ہیں۔ حسابی f قدر (1.795) اہم f قدر (1.85) سے کم ہے۔ نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ مختلف تعلیمی سطحوں والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس طرح باطل مفروضہ کو قبول کیا جاتا ہے۔

بحث: پہلے تحقیقی مفروضے (ٹیبل 1) کے نتیجے سے معلوم ہوا کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سوالنامے سے ماپا جاتا ہے۔ رائٹ (1978) نے اپنی تحقیق میں اس تلاش کی تائید کی۔ اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گھر سے باہر کام کرنے والی خواتین اور کل وقتی گھریلو خواتین دونوں کے فوائد اور اخراجات ان سے منسلک ہیں۔ تاہم، Adegoke (1987)، Nathawat اور Mathur (1993) اور Rogers and May (2003) کا خیال ہے کہ محنت کش طبقے کی خواتین عام طور پر غیر کام کرنے والی خواتین کی نسبت اپنی زندگی اور شادی سے زیادہ مطمئن ہوتی ہیں۔ ان نتائج کے درمیان فرق ثقافتی اختلافات سے منسوب کیا جاسکتا ہے.

دوسرے مفروضے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ آیا کم اور زیادہ آمدنی والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی فرق ہے۔ نتائج (ٹیبل 2) نے انکشاف کیا کہ خواتین کے دونوں زمروں کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ کوثر (2003) کے کام سے معلوم ہوا کہ محنت کش طبقے کی خواتین کے اندر، سماجی و اقتصادی پس منظر ان کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں

شماریاتی طور پر اہم عنصر نہیں تھا۔اس مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کی شخصیت کی خصوصیات نے ان کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں ان کے سماجی واقتصادی پس منظر سے زیادہ کردار ادا کیا۔ یہ تلاش متفق نہیں ہے۔(Iloyd 1980) کے مطالعے سے پتہ چلا ہے کہ سماجی واقتصادی حیثیت ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا ایک اہم عنصر ہے۔ان کا خیال تھا کہ آمدنی جتنی زیادہ ہوگی، طلاق کا امکان اتنا ہی کم ہوگا۔ایک عورت جو گھر کی ذمہ داریاں اپنے شوہر کے ساتھ بانٹتی ہے اس کے لیے زندگی کا فلسفہ تیار کرنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے جو سوچ، اظہار، عمل اور سماجی تعلقات کی ذاتی آزادی کی اعلیٰ ڈگریوں کی حمایت کرتا ہے۔

تیسرے مفروضے کا جائزہ لیا گیا کہ آیا مختلف تعلیمی سطحوں والی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ خواتین اپنی تعلیمی قابلیت سے قطع نظر مساوی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سے لطف اندوز ہوتی ہیں (ٹیبل 3)۔اس طرح اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تعلیمیافتہ خواتین، محنت کش طبقہ یا غیر ازدواجی معاملات میں یکساں طور پر مستحکم ہیں۔ یہ سمارٹ اینڈ اسمارٹ (1980) کے مطالعہ سے اتفاق کرتا ہے کہ تعلیمیافتہ جوڑے اپنے شریک حیات کے ساتھ بات کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور آرڈین اور راڈبرن (1968) کے اس کھوج سے متفق نہیں ہیں کہ کم تعلیمیافتہ افراد میں تناؤ اور سماجیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

نتیجہ: اس مطالعے کے نتائج مفید معلومات ہیں جو ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی اہم جہتوں کی نشاندہی کر سکتی ہیں کیونکہیہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین، ان کی تعلیم کی سطح اور ان کی آمدنی کی حیثیت کو متاثر کرتی ہے۔اس مطالعے کے نتائج محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین، ان کے شوہروں، والدین، مشیروں اور معاشرے پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔اس تحقیق کے نتائج میں سے ایکیہ ہے کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتینیکساں ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاریا پرائیویٹ سیکٹر میں تنخواہ دار ملازمت، کاروباری شخص یا کل وقتی ہاؤس وائف ہونا کسی عورت کے خاندان میں خلل نہیں ڈالتا ہے۔اس طرح ایک عورت کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی ڈگری اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے خاندان کو کیسے ہینڈل کرتی ہے جیسے کہ اپنے شوہر، اپنے بچوں اور گھر اور معاشرے میں بات چیت/تعامل۔ ورکنگ کلاس یا نان ورکنگ کلاس خواتین گھر میں ماحولیاتی دباؤ کے باوجود اپنی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے لیے ہمیشہ اچھا ماحول بنا سکتی ہیں۔

یہ پایا گیا کہ مختلف تعلیمی قابلیت حاصل کرنے والی خواتین مساوی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو بڑھاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خواندگی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو بڑھاتی ہے، یہ ان کی بات چیت کی مہارت کو بڑھاتی ہے جس سے وہ اپنے مسائل/تنازعات کے ذرائع پر بات کر سکتے ہیں، ان کی استدلال کی صلاحیت اور تنازعات کے منطقی حل تک پہنچنے کی صلاحیت کو بڑھاتے ہیں۔ مشیر اس معلومات کو ازدواجی مشکلات میں مبتلا جوڑوں کی مدد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس مطالعے کے نتائج مفید معلومات ہیں جو ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی اہم جہتوں کی نشاندہی کر سکتی ہیں کیونکہ یہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین، ان کی تعلیم کی سطح اور ان کی آمدنی کی حیثیت کو متاثر کرتی ہے۔ اس مطالعے کے نتائج محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین، ان کے شوہروں، والدین، مشیروں اور معاشرے پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔
اس تحقیق کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین یکساں ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری یا پرائیویٹ سیکٹر میں تنخواہ دار ملازمت، کاروباری شخص یا کل وقتی ہاؤس وائف ہونا کسی عورت کے خاندان میں خلل نہیں ڈالتا ہے۔
اس طرح ایک عورت کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کی ڈگری اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اپنے خاندان کو کیسے ہینڈل کرتی ہے جیسے کہ اپنے شوہر، اپنے بچوں اور گھر اور معاشرے میں بات چیت/تعامل۔
ورکنگ کلاس یا نان ورکنگ کلاس خواتین گھر میں ماحولیاتی دباؤ کے باوجود اپنی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے لیے ہمیشہ اچھا ماحول بنا سکتی ہیں۔

یہ پایا گیا کہ مختلف تعلیمی قابلیت حاصل کرنے والی خواتین مساوی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو بڑھاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ خواندگی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیم ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کو بڑھاتی ہے، یہ ان کی بات چیت کی مہارت کو بڑھاتی ہے جس سے وہ اپنے مسائل/تنازعات کے ذرائع پر بات کر سکتے ہیں، ان کی استدلال کی صلاحیت اور تنازعات کے منطقی حل تک پہنچنے کی صلاحیت کو بڑھاتے ہیں۔ مشیر اس معلومات کو ازدواجی مشکلات میں مبتلا جوڑوں کی مدد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

Adegoke AA (1987)۔ خواتین لیبر فورس کی شرکت اور شادی کی خوشی: Ilorin اور Ibadan میں منتخب خواتین کا مطالعہ۔ نگ جے گائیڈ۔ کاؤنس 3(1):132-140۔ بارٹلی ایس جے، جج ڈبلیو، جج ایس (2007)۔ ازدواجی خوشی اور کیریئر کی اطمینان کے سابقہ: دوہری کیریئر مینیجرز کا تجرباتی مطالعہ۔ بزنس اینڈ پبلک افیئرز، 1(1) 27 اگست 2010 کو http://www.scientificjournals.org/journals2007/articles/1059.htm سے حاصل کیا گیا۔ چکزی ای ایس (1992)۔ اویری لوکل گورنمنٹ ایریا میں محنت کش طبقے اور غیر محنت کش طبقے کی خواتین کی ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کا مطالعہ: شادی کی مشاورت کے لیے مضمرات۔ غیر مطبوعہ M. ایڈ کا مقالہ شعبہ تعلیمی نفسیات، رہنمائی اور مشاورت، فیکلٹی آف ایجوکیشن، یونیورسٹی میں جمع کرایا گیا۔ پورٹ ہارکورٹ۔

Lloyd S (1980)۔ انفرادی شادی اور خاندان۔ کیلیفورنیا: واڈس ورتھ پبلشنگ کمپنی۔ کوثر اے (2003)۔ کام کرنے والی خواتین میں ازدواجی ایڈجسٹمنٹ کے پیش گو کے طور پر شخصیت کی خصوصیات اور سماجی و اقتصادی حیثیت۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ جامعہ کراچی، کراچی میں جمع کرایا۔ مقامی حکومت کی آبادی اور مردم شماری بیورو (2009)۔ ورکنگ کلاس اور نان ورکنگ کلاس خواتین۔ PH: پورٹ ہارکورٹ سٹی کونسل۔ نتھاوت ایس ایس، ماتھرا ے (1993)۔ ہندوستانی تعلیمیافتہ گھریلو خواتین اور کام کرنے والی خواتین میں ازدواجی ایڈجسٹمنٹ اور سائیکش فلاح و بہبود۔ جے سائیکول۔ 127(3):353-358۔

Orden SR، Rradburn NM (1968)۔ کام کرنے والی بیویاں اور شادی کی خوشی۔ جے سوشل۔ 74:392-407۔

Ordu SN، Igbude MA (2006)۔ پورٹ ہارکورٹ لوکل گورنمنٹ ایریا آف ریورز اسٹیٹ میں محنت کش طبقے اور نان ورکنگ کلاس خواتین کا خاندانی استحکام: مشاورت کے لیے مضمرات۔ مشیر 22:67-74۔

Osiruemu E (2004a)۔ نائیجیریا میں ٹریڈ یونین تحریک میں خواتین: رکاوٹیں۔ 27 اگست 2010 کو http://www.jendajournal.com/issue6/osiruemu.html سے حاصل کیا گیا۔

Osiruemu E (2004b)۔ "نائیجیریا میں ٹریڈ یونین تحریک میں خواتین: رکاوٹیں،" JENDA: A J. Culture and African Women Studies, 6. 27 اگست 2010 کو http://eprints.hec.gov.pk/1270 سے حاصل کیا گیا۔

راجرز ایس جے، مئی ڈی سی (2003)۔ ازدواجی معیار اور ملازمت کی اطمینان کے درمیان پھیلاؤ: طویل مدتی پیٹرن اور صنفی اختلافات۔ جے میرج فیم۔ 65(2):482-496۔ اسمارٹ ایل ایس، اسمارٹ ایم ایس (1980)۔ تعلقات کو فروغ دینے والے خاندان 2nd Ed. USA: میکملن پبلشنگ کمپنی۔ ودری پی (2010)۔ تین بیویاں اور بچوں کا سکور، افریقی طریقہ... حاصل کردہ 7 اگست (n.d.) http: html. سے۔ رائٹ جے ڈی (1978)۔ کیا کام کرنے والی خواتین واقعی مطمئن ہیں؟ کئی قومی سروے سے ثبوت۔ جے میرج فیم۔ 40:311-313۔

☆☆☆

Malikzada Manzoor Ahmad ki Novel Nigari (College Girl ke Hawale se)by Mohammad FaizSiddiqui(Research Scholar dept.of Urdu Khwaja Moinuddin ChishtiLanguage University Lucknow)

محمد فیض صدیقی (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنوء)

ملک زادہ منظور احمد کی ناول نگاری

(کالج گرل کے حوالے سے)

ملک زادہ منظور احمد کو اردو دنیا میں شاعر اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی ۔لیکن انھوں نے اپنے قلم کے جوہر اردو کی دیگر اصناف سخن میں بھی دکھائے ہیں۔ چنانچہ وہ افسانہ نگار ،خاکہ نگار، خودنوشتنگار، سفرنامہ نگار، محقق اور ناقد کے ساتھ ساتھ ناول نگار بھی ہیں اور انھوں نے اپنا واحد ناول" کالج گرل" لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنے فکروفن کے نقوش ثبت کئے ہیں۔

دار اصل بات یہ ہے کہ ملک زادہ منظور احمد نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو انھیں اپنے خیالات میں جو تبدیلیاں محسوس ہوئیں اور ان تخیلاتی تبدیلیوں کے باعث جو نئے جذبات ان کے دل میں جاگے انھیں ملک زادہ نے الفاظ میں تبدیل کرنا شروع کر دیا، بقول ملک زادہ:۔

" میں نے قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری ، نیاز فتحپوری اور انھیں کی قبیل کے دیگر رومانی افسانہ نگاروں کی کہانیاں پڑھی تھیں ، اور خود کو انھیں کے کرداروں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا تھا، راتوں کو جاگنا، بغیر کسی وعدے کے انتظار کرنا، نامرادانہ زندگی گزارنا، اپنے اوپر ایک حزنیہ اور سوگوار کیفیت طاری رکھنا، ان دنوں میرے معمولات میں شامل تھا۔" دیوداس" اور" انداز" جیسی فلمیں مجھے بہت اچھی لگتی تھیں، مگر یہ انھیں جاگتی راتون اور انتظار کرتے ہوئے دنوں کا فیض تھا کہ میں اپنے تجربات اور اپنی نا آسودہ خواہشات کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگا اور افسانہ نگار بن گیا۔" (رقص شرر: ص،514)

بہت جلد ملک زادہ منظور احمد کی افسانہ نگاری ناول نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور وہ 1950ء میں ناول لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ملک زادہ منظور احمد جہاں ایک طرف مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری اور قاضی عبدالغفار کی کہانیاں پڑھا کرتے تھے تو وہیں عصمت اور منٹو کے افسانے اور ناول بھی ان کے مطالعے میں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول میں رومانیت کے ساتھ ساتھ جنسیت کی جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ بقول شفیق احمد باغبان:۔

کالج گرل کی لڑکیاں کہیں عصمت چغتائی کی" آشا" ہیں ،تو کوئی صالحہ عابد حسین کی" عذرا" ہے ۔" (اردو کا ایک عظیم مجاہد: پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: ص،76)

ملک زادہ منظور احمد نے اپنا ناول اس وقت لکھنا شروع کر دیا تھا جب وہ سینٹ اینڈ ریوز کالج گورکھپور میں ایم ۔اے کے طالب علم تھے ۔ملک زادہ نے اپنے ناول میں طلبہ وطالبات کے رہن سہن، عادات واطوار اور مسائل کو پیش کیا ہے اسی وجہ سے ناول کی فضا شہر گورکھپور اور کالج کی چہار دیواری تک محدود ہے۔بقول شفیق احمد باغبان :۔

" ناول کا معاشرہ جو کہ گورکھپور کی گلیوں اور سینٹ اینڈ ریوز کالج کے برآمدے کے حصار میں قید ہے، حیات اللہ انصاری کے" لہو کے پھول" کے متعدد شہروں کے ارد گرد گھومتا نظر آتا ہے۔"

(اردو کا ایک عظیم مجاہد: پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: ص،76)

ناول لکھنے کے محرکات کیا تھے؟ اور اس کا پلاٹ ملک زادہ کو کہاں سے دستیاب ہوا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

" سینٹ اینڈ ریوز کالج نے اگر ایک طرف میرے لئے فکر ونظر کی نئی راہیں کھولیں تو دوسری جانب اس نے آہ سحر گاہی اور نالہ نیم شبی سے بھی آشنا کیا، اور رسوائی و بدنامی کے کچھ گل بوٹے بھی میرے دامن میں ڈال دیئے ۔مگر اسی کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کا بھی احساس واعتراف ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید شعروادب کے حوالے سے میں آج جو ہوں وہ نہ ہوتا۔اسی کالج نے مجھے فریاد کو لے اور آتشکدہ کو گلزار میں تبدیل کرنے کا ہنر سکھایا۔یہیں میرا دل پہلی بار اس طرح دھڑکا کہ آج بھی اس کی یادیں اور اس کی لذت مجھے محسوس ہو رہی ہے۔ ماہ وسال کی گردش اور صبح وشام کے چکر نے یہ بھی خبر نہ دی کہ اب وہ کہاں ہے، زندہ ہے یا مرگئی ۔مگر وہ مجھے میرا پہلا اور آخری ناول دے گئی، جس کا نام تھا" دیوار دبستاں پر" اور جسے مکتبہ کلیاں ،لکھنؤ نے" کالج گرل" کے نام سے شائع کیا۔ یہ ناول واقعات کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اس افلاطونی محبت کی یادگار ہے جس میں میں گرفتار ہوا، اور جس میں مرکزی کردار میں نے ادا کیا۔" (رقص شرر: ص56)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات مستنبط ہوتی ہے کہ اس ناول کو تحریر کرتے وقت ملک زاہ کے ذہن میں محض اپنے دل کے زخم دھونا اور اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرنا ہی تھا، اسی وجہ سے انھوں نے اس ناول کا اختتام دوران طالب علمی میں نہیں لکھا بلکہ آٹھ سال کے بعد لکھا تھا، جس کی تفصیل ملک زادہ نے اپنے ناول کے پیش لفظ میں ذکر کی ہے۔

واقعہ دراصل یہ ہے کہ ملک زادہ نے محبت میں ناکامی کے بعد ناول لکھنا شروع تو کر دیا تھا اوراس کے کچھ ابواب لکھ بھی لئے تھے، لیکن مکمل نہیں کر پائے تھے، اس لئے کہ وہ حقیقی دنیا میں ایسے مصروف ہو گئے تھے کہ آٹھ سال تک اپنی افسانوی دنیا کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملا۔لیکن جب ان کے کالج میں جہاں وہ پڑھا رہے تھے مخلوط تعلیم کا آغاز ہوا تب انھیں اپنا ادھورا ناول یاد آیا اوراب وہ طالب علم سے استاد بن چکے تھے۔بقول ملک زادہ:۔

" یادش بخیر اس ناول کی ابتدا میں نے 17 / اپریل 1950ء کو کی تھی، جب میں خود ایم۔اے۔کا طالب علم تھا۔مگر ابتدائی چند ابواب لکھنے کے بعد میں نے اس ناول کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔۔۔۔گذشتہ سال جب میرے کالج میں مخلوط تعلیم رائج ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ نوخیز طلباء و طالبات کے مسائل آج بھی وہی ہیں جو میری طالب علمی کے زمانے میں ہوا کرتے تھے۔اس وقت مجھے اپنی بھولی بسری ہوئی ناول کی یاد آئی۔" (کالج گرل۔پیش لفظ)

مگراس آٹھ سال کے عرصے میں ملک زادہ منظور احمد کی فکر ونظر میں کافی تبدیلیاں آچکی تھیں، اس لئے کہ اب وہ طالب علم نہیں بلکہ استاد بن چکے تھے۔اب ان کے لکھنے کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ احساسات وجذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی کر دی جائے بلکہ ان کی پیش نظر مقصدیت اوراصلاح بھی تھی۔اسی وجہ سے ناول کے ابتدائی ابواب میں ہمیں جو رومانیت اور جنسیت نظر آتی ہے وہ ناول کے آخر کے ابواب میں اس طرح نظر نہیں آئی۔چنانچہ اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے ملک زادہ منظور احمد رقمطراز ہیں:۔

" مگراب میں طالب علم کے بجائے استاد تھا۔میرے نزدیک اس وقت ادب کا مقصد صرف حالات اورواقعات کی صحیح صحیح عکاسی تھا مگر منصب استادی پر فائز ہونے کے بعد اب میری طبیعت کے اندر غیر شعوری طور پر ایک اصلاحی رگ بیدار ہو گئی تھی۔اور یہ خطرہ تھا کہ اگر خدانخواستہ اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تو حقیقت نگاری کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا،مگر میری امکانی کوششوں کے باوجود ادبیت اور مصلح کی اسی کشمکش میں مجھ سے اپنے ہیرو جاوید کا خون گیا۔" (کالج گرل: پیش لفظ)

1950ء میں ملک زادہ نے اپنے ناول میں کالج کی جو منظر کشی کی اور طلبہ وطالبات کے جو مسائل ذکر کئے، وہ سرسری مشاہدہ کے بعد لکھے ہوئے معلوم نہیں ہوتے ہیں بلکہ گہرے مشاہدے اور تجربے کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آٹھ سال بعد جب ان کے کالج میں مخلوط تعلیم شروع ہوئی تو انھیں وہی مسائل محسوس ہوئے جو پہلے تھے اور ماضی میں لکھا ہوا ناول حال کا بھی ترجمان نظر آیا

۔اور یہ ملک زادہ کے فن کا کمال ہے کہ آج بہتر 72 سال بعد بھی ان کا ناول پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ناول ابھی کچھ عرصے پہلے ہی لکھا گیا ہے۔اس لئے کہ طلباء وطالبات کے مسائل آج بھی وہی ہیں جو پہلے تھے،بس سائنسی ترقیات کی وجہ سے رہن سہن میں تبدیلیاں آگئیں ہیں، باقی طلباء کی سوچ اور فکر آج بھی وہی ہے جو ناول میں پیش کی گئی ہے۔اس طرح اڑتالیس 48 ابواب پر مشتمل ملک زادہ منظور احمد کا ناول پایۂ تکمیل کو پہونچ کر مکتبہ کلیاں لکھنؤ سے شائع ہو کر 1960ء میں منظر عام پر آ گیا۔لیکن جس طرح ملک زادہ منظور احمد نے اس ناول کو تحریر کرتے وقت کوئی خاص توجہ اس پر نہیں دی تھی اسی طرح اس کے شائع ہونے کے بعد بھی خاص التفات نہیں کیا۔جس کی وجہ سے ملک زادہ کا ناول "کالج گرل" منظر عام سے غائب ہو گیا۔اور ایک طویل عرصے تک اردو دنیا میں نایاب رہا، یہی وجہ ہے کہ ملک زادہ کے فکر وفن پر لکھے جانے والے مضامین میں کوئی بھی مضمون راقم الحروف کو ان کی ناول نگاری پر نہیں ملا۔ایک دو جگہ صرف چند سطروں میں سرسری تبصرہ ہی ملا لیکن اب ملک زادہ کا ناول دستیاب ہو چکا ہے اور ریختہ کی ویب سائٹ پر اپلوڈ بھی ہے۔

ناول فکشن کی ایک اہم صنف ہے۔اور ایک کامیاب فکشن وہ ہوتا ہے جو حقیقی زندگی کی اس طرح عکاسی کرے کہ قاری اسے پڑھتے پڑھتے فیکٹ محسوس کرنے لگے۔ چنانچہ ملک زادہ اس معاملے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان کا ناول مناسب کرداروں، برمحل اور برجستہ مکالموں،مؤثر جذبات نگاری اور خوبصورت منظر نگاری کا مجموعہ ہے حالانکہ کہانی کی فضا کچھ زیادہ ہی رومانوی ہے جو ناول کو حقیقت سے دور کرتی ہوئی نظر آتی ہے،لیکن رقص شرر میں ملک زادہ نے یہ کہہ کر اپنے ناول کو حقیقت کے بہت قریب لا کر کھڑا کر دیا ہے کہ:۔

"یہ ناول واقعات کے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اس افلاطونی محبت کی یادگار ہے جس میں، میں گرفتار ہوا، اور جس میں مرکزی کردار میں نے ادا کیا۔شائع تو یہ بعد میں ہوا مگر یہ لکھا اسی دور میں گیا جب میں اس کالج کا طالب علم تھا، تبھی وہ ایک بنت مریم دزدیدہ نگاہی ملاقاتوں میں تبدیل ہوئی، روشن چاندنی اور کہر آلود راتوں میں دو سائے پارکوں اور سڑکوں پر ملتے رہے۔ پھر ایک تیسرا سایہ جو اس کے ماضی سے ابھرا، اس کہانی میں شامل ہوا۔ الجھن، گھٹن، کشمکش کے شب وروز گورکھپور کی سڑکوں اور گلیوں نے دیکھے۔ تیسرا سایہ اپنے احسانات کے بوجھ سے اس کو دباتا رہا۔ آخر میں وہ ٹوٹ گئی اور پہلا سایہ بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا" (رقص شرر:ص،56،57)

بقول ملک زادہ مرکزی کردار جاوید خود انہوں نے ادا کیا ہے اور حقیقی زندگی کی وہ بنت مریم

جس کے لئے ان کا دل اس طرح دھڑکا کہ اس کی یادیں انھیں تادم تحریر محسوس ہوتی رہیں اور جس کے عشق میں چوٹ کھا کر ان کے ہاتھ قلم اور خون جگر قلم کی سیاہی بن گیا اور وہ کہانیاں لکھنے لگے، اس بنت مریم کا عکس ناول میں ایڈنا" کے اندر نظر آتا ہے۔ مرکزی کردار جاوید جب اپنی محبت میں ناکام ہو کر ٹوٹ سا جاتا ہے اور قریب ہی تھا کہ وہ بکھر جاتا تو اس کو سنبھالنے کے لئے ناول نگار نے اپنے تخیل کو بروئے کار لاتے ہوئے" نیلوفر" کا کردار وضع کیا۔ جو دھیرے دھیرے جاوید سے قریب ہو جاتی ہے اور جاوید کی زندگی میں دوبارہ بہار لے آتی ہے۔ چنانچہ جاوید اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔

پھر نیلوفر کے ماضی سے ایک اور کردار نکل کر سامنے آتا ہے جو جاوید سے نیلوفر کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے اور نیلوفر کو اپنے احسانات تلے دبا تا ہے۔ اس مقام پر پہونچ کر ملک زادہ کی حقیقی دنیا کی بنت مریم کی جھلک ناول کی" نیلوفر" میں نظر آنے لگتی ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک زادہ نے حقیقی زندگی کی بنت مریم کو دو کرداروں" ایڈنا" اور " نیلوفر" میں تقسیم کر دیا ہے ایڈنا کو بے وفا اور نیلوفر کو سراپا وفا کی دیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں ایڈنا سے زیادہ نیلوفر کا کردار جاندار ہے جو ناول کے اکثر حصے پر چھایا ہوا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ملک زادہ منظور احمد کا ناول" کالج گرل" اپنے موضوع اور زبان و بیان کے باعث نمایاں مقام پانے کا مستحق ہے۔

☆☆☆

Prem Chand by Rashida Tasneem,Neha Rafeeque(Research Scholars,dept.of urdu Barkatullah University,Bhopal)

راشدہ تسنیم، نیہا رفیق (ریسرچ اسکالرز، شعبہ اردو، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال)

پریم چند

پریم چند اردو افسانہ نگاری میں ایک ایسا عظیم المرتبت نام ہے جو اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ سرفہرست رہے گا۔ پریم چند سے اردو افسانہ نگاری کا آغاز ہوا اور پریم چند نے اردو ناول کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ پریم چند کا ادبی سفر ۱۹۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں ختم ہوجاتا ہے۔ اس چھتیس سال کے عرصہ میں پریم چند نے اردو افسانوی ادب کو اس قدر بیش قیمت ادبی سرمایہ دیا کہ اُسے نظر انداز کر کے کوئی بھی ادبی مورخ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پریم چند نے پہلی بار اردو ادب کو گاؤں دکھایا۔ پریم چند چونکہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، وہیں اُن کی پرورش ہوئی۔ گاؤں کی تہذیب اُن کے لاشعور کا حصّہ بن گئی تھی اسی لیے جب انھوں نے قلم اُٹھایا تو اُن کے لاشعور میں بسی تصویریں کاغذ پر اُبھر آئیں۔ کسان اور اُس سے وابستہ مسائل اُن کی تخلیقات کے موضوع بن گئے۔

پریم چند کی تصنیفی زندگی کی ابتدا ۱۹۰۲ء سے ہوئی جب انہوں نے بنارس کے ایک ہفتہ وار ''خلق'' میں ''اسرار معابد'' کے نام سے قسط وار ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ''ہم خرما و ہم ثواب'' اور ''کشن'' دو ناول لکھے۔ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''سوز وطن'' ۱۹۰۸ء میں منظرِ عام پر آیا جس میں ان کی تحریر کردہ پہلی کہانی ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' شامل تھی۔ یہ پانچ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کے افسانوں میں وطن پرستی اور آزادی کے جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، واردات، خواب وخیال، زادراہ، پریم چالیسی، آخری تحفہ وغیرہ اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔

پریم چند کے افسانوں کا بنیادی موضوع غریب کسان اور مزدور ہے۔ پریم چند کے لاشعور میں بسا گاؤں اور وہاں کے رہنے والوں کے مسائل ان کی تخلیقات میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں ہندوستان دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہندوستان جو دبی کچلی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ہندوستان جو

برطانوی حکومت کے ظلم کا شکار تو تھا ہی۔ اپنے ہی ملک کے زمینداروں، مہاجنوں، مذہبی رہنماؤں کے چنگل میں بھی پھنسا ہوا تھا۔ پریم چند نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو اپنے افسانوں کے ذریعہ سب کے روبرو کر دیا ہے۔ وہ مظلوموں اور اچھوتوں سے ہمدودری رکھتے تھے۔ ان کی تکلیفوں کو افسانوں میں بیان کر کے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پریم چند کی تصانیف ان کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سُنا اُس کو اپنے کرداروں کے ذریعہ اپنی تصانیف میں پیش کر دیا۔ پریم چند کے افسانے اُن کے وسیع مشاہدے اور گہرے نفسیاتی مطالعے کے سبب فطرتِ انسانی کے بہترین مرقعے بن گئے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہندوستان کے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ پریم چند کے افسانے نے کسی ایک طبقے، نسل، ذات یا تہذیب تک محدود نہیں۔ وہ پورے ہندوستانی سماج کی مکمل تصویر ہیں، جس میں دیہات اور شہر بھی دکھائی دیتا ہے اور ان میں رہنے والے مختلف طبقوں کے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ پریم چند کے موضوع اور مواد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پریم چند کی کہانیوں ہی سے سماجی حقیقت نگاری کا آغاز ہوتا ہے، پریم چند نے تین سو کے قریب افسانے لکھے۔ جن میں انہوں نے سماج کے مختلف گوشوں کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کے عہد میں جہالت، غیر ضروری رسم و رواج، توہم پرستی، سماجی نابرابری، ذات پات جیسی برائیاں عام تھیں۔ پریم چند نے ان کے خلاف آواز اُٹھائی، اس آواز میں اتنی قوت تھی کہ اس کی گونج ترقی پسند اور دوسرے افسانوں نگاروں کی تخلیقات میں بھی سنائی دی۔ ان کی حیثیت ایک مصلح کی معلوم ہوتی ہے۔ اصل پریم چند ''راہ نجات''، ''سوا سیر گیہوں''، ''قربانی''، ''مشعل ہدایت''، ''بوڑھی کا کی''، ''دو بیل''، ''پوس کی رات''، ''دودھ کی قیمت''، ''پنچ پرمیشور''، ''روشنی''، ''نئی بیوی''، ''بڑے گھر کی بیٹی'' اور ''کفن'' جیسے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ پریم چند سے پہلے اردو میں افسانے کی کوئی روایت نہیں تھی، اس کے باوجود وہ افسانے کے فن پر دسترس رکھتے تھے۔ آخر میں ''کفن'' جیسا لکھ کر انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ انھیں افسانہ نویسی پر کس قدر قدرت حاصل ہے۔

مذکورہ اور ان جیسے افسانوں میں کہیں کوئی کردار قرض کے بوجھ سے دبا ہوا نظر آتا ہے۔ کہیں سرکاری اہل کاروں کی دست درازی کا شکار ہے۔ کہیں زمیندار اور پروہت کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غرض کہ پریم چند کے افسانوں میں ہر طبقے کے افراد کی مظلومیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہی افسانے میں سماجی حقیقت کی ابتدا ہے جسے پریم چند نے انتہا تک پہنچانے کی

کوشش کی ہے۔ پریم چند سے اردو زبان میں ایک نئے اسلوب کا آغاز ہوا، پریم چند سے قبل اردو ادب کا دائرہ محض چند شہروں تک محدود تھا پریم چند نے اردو ادب کو شہروں سے نکال کر دیہات میں پہنچایا اور عوام سے اس کا رشتہ جوڑا۔ اسی لیے ان کی زبان و بیان اُن سے پہلے کے ادیبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سیدھی سادی بیانیہ تکنیک استعمال کی ہے جو ان کی بات قاری تک بآسانی پہنچا دیتی ہے۔ بلاشبہ پریم چند ایک ادیب ہی نہیں ایک ادارہ تھے۔ ایک دبستان تھے جن سے بعد کے ادیبوں نے لکھنے کا سلیقہ سیکھا۔

☆☆☆

Sinf-e-Nazm ke Tadrisi maqasid aur tariqa-e-kar by Dr. Md.Arsad Ansari(Asst.Prof. dept.of teacher training& Non-formal education (IASE) Jamia Millia Islamia,New Delhi)cell-9911543984

ڈاکٹر محمد ارسد انصاری (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تربیت اساتذہ وغیر رسمی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

صنف نظم کے تدریسی مقاصد اور طریقۂ کار

تلخیص: درس وتدریس کے میدان میں زبان کی بنیادی اہمیت ہے۔ زبان کو وسیلہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ یہ انسانی تجربات ومحسوسات کا سب سے مناسب ذریعۂ اظہار ہے۔ اس حقیقت کے باوجود زبان وادب کی تعلیم کے سلسلے میں پرانے طریقۂ تدریس کو عمل میں لایا جاتا ہے اور بہت ہی معمولی انداز میں تدریس وآموزش کا عمل کیا جاتا ہے۔ اسی لیے زیادہ تر طلبا زبان کی بنیادی مہارتوں میں کمزور نظر آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان کی تدریسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے نئے تدریسی طریقے اور منظم منصوبہ بندی کے ساتھ تدریس وآموزش کے عمل کیے جائیں۔ خاص طور سے نظم کی تدریس کے لیے ایک منظم طریقۂ کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے تدریس کا عمل کیا جانا چاہیے، جس سے نظم کے مقاصد کو آسانی کے ساتھ حاصل کیا جا سکے۔ نظم کی تدریس میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کیسے ان مقاصد کو بہتر طریقے سے حاصل کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کو شعر وسخن سے غیر معمولی دلچسپی بھی ہونی چاہئے۔ اس کے بغیر صحیح اور مکمل طریقہ کار سے واقفیت نہیں ہونے سے تدریس کا حق ادا نہیں ہو پاتا ہے۔ اس لیے اساتذہ کو تدریس نظم کے طریقۂ کار سے واقف ہونا لازمی ہے۔ تدریس نظم کے انھیں طریقۂ کار پر اس پرچے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طریقۂ کار کو نقطۂ نظر بنا کر اساتذہ نظم کے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ نظم کی تدریس کو بہتر اور کامیاب بنانے کے لیے تدریسی طریقۂ کار کے تحت مختلف منازل کو اپنایا جاتا ہے۔ اس میں سبق کے اعلان سے قبل بہترین تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے متن پہ پہنچا جاتا ہے۔ اس کے بعد معلم ومتعلم کی بلند خوانی کا عمل اور تلفظ کی مشق کا کام کیا جاتا ہے۔ پھر نئے اور مشکل الفاظ کے معنی بتا کر شعر کی تشریح وتوضیح کا کام کیا جاتا ہے۔ اس سے قبل نظم کا مرکزی خیال طلبا کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے بعد نظم کے شعری محاسن کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اس طریقۂ کار کی مدد سے طلبا میں جمالیاتی اور وجدانی پہلوؤں کے ساتھ شخصیت کے ہمہ جہت نشوونما بھی کی جاسکتی ہے۔

کلیدی الفاظ: صنف نظم، مقاصد، نظم کی تدریس، طریقہ کار

تعارف: شخصیت کی ہمہ جہت نشو ونما تعلیم کا ایک اہم مقصد ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسکول میں متعدد مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن اسکول کے نصاب میں ان عناصر کے فروغ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا جاتا، جن کو ہم شخصیت کے جمالیاتی اور وجدانی پہلو سے تعبیر کرتے ہیں۔ جمالیاتی اور وجدانی پہلو کو فروغ دینے کے لیے اسکول کے اندر شعر وسخن کی تدریس ایک بہتر طریقہ ہے۔ اسی لیے زبان وادب کی تعلیم میں شعر وسخن کی تدریس پر زور دیا گیا ہے۔ عام طور پر اسکول کے کمرۂ جماعت میں طالب علم کے وقوفی اور معلوماتی ذہانت والے مضامین پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جب کہ جذباتی و جمالیاتی پر کم۔ حالانکہ طلبا کی ہمہ جہت نشو ونما میں سبھی طرح کے مضامین کی یکساں اہمیت ہے۔ نظم طلبا کی شخصیت کے جذباتی اور جمالیاتی پہلوؤ ں کی نشو ونما میں بھر پور مدد کرتی ہے۔ جس سے طلبا کی شخصیت کی ہمہ جہت ترقی ممکن ہوسکتی ہے۔ نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی قصہ، کوئی واقعہ، کوئی تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونے اور یکجا کرنے کے ہیں۔ باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز حقیقت میں نظیر اکبرآبادی سے ہوا جو عوامی شاعر تھے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام نظم گوئی کے مشاعرے منعقد کئے۔ حالی نے بعد میں اس کو ایک تحریک بنا دیا اور اردو شاعری کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔
اس کے بعد کے شعرا نے جدید نظم کی اس روایت کو اپنایا۔ درگا سہائے سرور، چکبست، مولوی اسماعیل میرٹھی، جوالا پرساد برق، نظم طباطبائی نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آخر کار علامہ اقبال نے نظم نگاری کی اس روایت کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ نظم جدید کو اقبال نے جیسی رفعت فکر ونظر اور آب وتاب بخشی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اقبال کے زمانے میں سیماب اکبرآبادی اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری وغیرہ نے بھی نظموں میں اپنے جوہر دکھائے۔ جب ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی تو جدید نظم نگاری کو ایک نیا موضوع مل گیا۔ ترقی پسند نظم نگاروں میں سرفہرست فیض احمد فیض ہیں۔ انھوں نے نظم کے فن کو ایک نیا رخ عطا کیا اور نئے رنگ وآہنگ سے روشناس کرایا۔ ان کے ہم عصروں میں سردار جعفری، مجاز، فراق، کیفی اعظمی، ساحر، احمد ندیم قاسمی نے بھی نظم نگاری کے فروغ میں حصّہ لیا۔

نظم کے تدریسی مقاصد: نظم کی تدریس کا اصل مقصد یہ ہے کہ طلبا کے جذبات کو متحرک کیا جائے۔ ان میں شعر پڑھنے اور شعر فہمی کی صلاحیت پیدا کیا جائے۔ شعر کے وزن وآہنگ کا احساس دلایا جائے۔ شاعری کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے۔ ان کے قوت تخیل کو فروغ دیا جائے اور قوت تخلیق کو ابھارا جائے اور بچوں پر کم وبیش وہی جذبات واحساسات طاری کرنے کی کوشش کی جائے جو نظم لکھتے وقت شاعر کے دل ودماغ پر جاری وساری تھے۔ یعنی نظم کی تدریس کا مقصد نثر کی طرح بچوں کے لیے صرف الفاظ ومعلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ نظم کی

تدریس کا اولین مقصد بچوں کے حسِ لطیف کو بیدار کرنا، ان کی قوت متخیلہ کو ابھارنا، ان کے ذوقِ جمال کو حرکت میں لانا اورخوب صورت چیزوں کومحسوس کرنے اوران سے لطف اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔
نظم کے تدریس مقاصد میں طلبا کی جذباتی اوراخلاقی نشوونما کرنا، اصناف شاعری سے واقف کرانا اورشعرا کے طرزِ اسلوب سے واقف کرانا بھی شامل ہے۔تدریس نظم کا ایک اہم مقصد لطف اندوزی بھی ہے۔تدریس نظم کے ان مقاصد کوحاصل کرنے اورتدریس کا حق ادا کرنے کے لیے اساتذہ کو یہ جاننا ضروری ہے کہ کیسے پر اثر طریقے سے تدریس کا عمل کیا جائے اور کیسے ان مقاصد کو حاصل کیا جائے تا کہ طلبا میں جمالیاتی اور وجدانی پہلوؤں کی نشوونما ہو سکے۔مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ تدریس نظم کے نام پہ اکثر ایسا نہیں ہوتا ہے۔طلبا سے بلند خوانی کرائی جاتی ہے یا صرف شعر کی تشریح معمولی انداز سے کردی جاتی ہے۔ان طریقوں کے استعمال سے نظم کے جومقاصد ہیں وہ حاصل نہیں ہو پاتے اوراس سے بچوں کے اندر مالیاتی اوروجدانی پہلوؤں کی نشوو نمانہیں ہو پاتی ہے۔ درج ذیل تدریسی طریقۂ کار کے اقدامات کو اپنا کرنظم کی تدریسی مقاصد کوبہتر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔اس مقصد کوحاصل کرنے اورسبق کودلچسپ اورموثر بنانے کے لیےتدریس میں رنگارنگی اورندرت کے پہلوکو مدنظر رکھا جائے۔معاون اشیا اورجدید ٹکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے ہم دنیا جہان کو کمرۂ جماعت میں پیش کر سکتے ہیں۔نظموں کوڈرامائی شکل دے کربھی طلبا میں دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔
تمہیدی گفتگو: تدریس نظم کے آغاز کا پہلا زینہ تمہید ہے۔تمہید کےلغوی معنی فرش بچھانے یا کسی کے استقبال کی تیاری کرنے کے ہیں۔اس جگہ تمہید سے وہ عمل مراد ہے جو بچوں کی سابقہ معلومات اورزیرتدریس سبق میں رابطہ پیدا کرتا ہے۔تمہید کے ذریعے بچوں کی معلومات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔تدریسی اقدامات میں تمہید کوغیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسی لیے کامیاب تمہید کوعموماً سبق کی کامیابی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔یہ جس کسی نے بھی کہا ہے کہ ’’جس کام کا آغاز اچھا ہوتا ہے بالعموم اس کام کا انجام بھی اچھا ہوتا ہے، غلط نہیں ہے۔‘‘ اچھی تمہیدسبق کوکامیاب بنانے میں بڑی مدد کرتی ہے۔نظم کی تدریس کے لیےایک خوشگوارتدریسی فضا تیارکرنا ہی تمہید کا مقصد ہے۔سبق کی طرف طلبا کوراغب کرانے کے لیے دلچسپ اورمؤثر انداز میں تمہیدی گفتگو کی جاتی ہے تا کہ طلبا میں سبق کو پڑھنے کے لیے آمادگی اورجستجو پیدا ہوجائے۔تمہیدی گفتگو کا مقصد سابقہ معلومات کی بنیاد پر نئے سبق تک طلبا کی رہنمائی کرنا ہے۔کسی بھی طریقے سے تمہید کاعمل ہوسکتا ہے۔مثال: سوالات، بات چیت، شاعر کی تصویر، کہانی وغیرہ۔شرط یہ ہے کہ پڑھائے جانے والےنفس مضمون سے اس کاتعلق ہو۔ تمہید ویسی ہونی چاہیے کہ طلبا کا رجحان ذہنی طور پرنظم پڑھنے کی طرف آمادہ ہوجائے اورسوالات ہوں یا گفتگو ہرصورت میں تسلسل قائم رکھا جائے۔تمہید سبق کی طرف رجوع کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔اس لیے اسے سبق

کا جزو خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اس منزل پر زیادہ سے زیادہ دو سے تین منٹ تمہید کے لیے دینا چاہیے۔ اس کے بعد سبق کا آغاز کر دینا چاہیے۔

اعلانِ سبق: تمہیدی گفتگو کے آخری سوال یا بات چیت اور اعلان سبق میں ربط ہونا ضروری ہے۔ تمہید کے بعد جب یہ اندازہ ہو جائے کہ طلبا تدریس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئے ہیں تو سبق کا اعلان کر دینا چاہیے۔ اس کے بعد طلبا سے کہنا چاہیے کہ وہ اپنی درسی کتاب کا فلاں سبق کھولیں۔ اس منزل پر معلم کو نظم کا پس منظر، شاعر کا تعارف، اس کے سوانحی حالات اور ادبی کارناموں کا ذکر بھی کرنا چاہیے تاکہ شاعر اور سبق کی ایک جھلک طلبا کے سامنے آجائے اور ان میں نظم پڑھنے کے لیے ذوق پیدا ہو جائے۔

نمونے کی بلند خوانی: سبق سے طلبا کو متعارف کرانے کے بعد اب نظم کی پیش کش کی منزل آتی ہے۔ یہ سبق کی اہم منزل ہے۔ اس کا آغاز مؤثر بلند خوانی سے کیا جا سکتا ہے۔ معلم کو زیر تدریس سبق بلند آواز میں پڑھ کر طلبا کے سامنے نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ معلم کی جانب سے کی جانے والی بلند خوانی واقعی مثالی ہونی چاہیے۔ مؤثر بلند خوانی سے صرف سن کر ہی بچہ نظم کے مفہوم کو بہت حد تک سمجھ لیتا ہے۔ نظم پڑھتے وقت تلفظ، آہنگ، روانی اور وقفوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ نظم کے مزاج کے مطابق اس کی بلند خوانی ہونی چاہیے مثلاً پُرجوش نظمیں، مرجھائی ہوئی اور دبی ہوئی آواز میں نہ پڑھی جائیں۔ ان کو پڑھتے وقت آواز جوشیلی ہو، سنجیدہ نظمیں قدرے اطمینان سے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں پڑھی جائیں۔ مجموعی اعتبار سے نظم اس طرح پڑھی جائے کہ طلبا اس سے لطف اندوز ہو سکیں اور نظم میں پیش کردہ شاعر کے جذبات و احساسات کو محسوس کر سکیں۔ تدریس نظم کی کامیابی کا سارا انحصار مثالی بلند خوانی پر ہے۔ نظم کا پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے۔ بعض معلمین نظم پڑھنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہیں اور نظم پڑھنے کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن بعض معلمین نظم پڑھانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ نظم پڑھنے میں تحت یا ترنم دونوں طریقوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔ اس لیے معلم کو سوچ سمجھ کر نظم پڑھنے کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ یقیناً کامیاب نظم خوانی کا مفہوم یہ ہے کہ طلبا کے دل و دماغ پر تھوڑی دیر کے لیے کم و بیش وہی فضا طاری ہو جائے جو نظم لکھتے وقت شاعر پر طاری تھی۔

تقلیدی بلند خوانی: مثالی بلند خوانی کے بعد معلم کو چاہیے کہ وہ پڑھی ہوئی نظم کو طلبا سے پڑھوائے۔ اس عمل کے لیے سبق کو جزو میں تقسیم کر کے مختلف طلبا سے فرداً فرداً پڑھوانا چاہیے۔ تقلیدی بلند خوانی کے دوران اس بات کا خیال رکھا جائے کہ نظم کا تلفظ، آہنگ، روانی، اور وقفوں کا صحیح حق ادا ہو۔ تدریسی مواد کو ہر دن الگ الگ طالب علم سے پڑھوانا چاہیے تاکہ پوری جماعت بلند خوانی کرنا سیکھ سکے۔ اس کے لیے ایک دن کی تدریس میں کچھ اس طرح سے طالب علموں کو موقع دینا چاہیے کہ پوری جماعت کی نمائندگی ہو سکے۔ اگر جماعت میں

کچھ طلبا پڑھنے میں کمزور ہوں تو انہیں بار بار بلند خوانی کا موقع دینا چاہیے۔

تلفظ کی مشق: اس منزل پر طلبا کے ذریعہ غلط پڑھے ہوئے لفظ کی تصحیح کا عمل کیا جاتا ہے۔ طلبا کی تقلیدی بلند خوانی کے وقت ان کے تلفظ اور لب ولہجہ پر خاص نظر رکھنی چاہیے۔ بلند خوانی کے دوران طلبا کو ان کی غلطیوں پر ٹوکنا یا روکنا درست نہیں بلکہ بلند خوانی کے بعد ان کی توجہ غلطیوں کی طرف مبذول کرانا چاہیے۔ تلفظ کی درستگی کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ جب طالب علم مصرعہ یا شعر پڑھتے وقت کسی لفظ کی غلط ادائیگی کریں تو معلم انہیں خود صحیح کرائے۔ بلند خوانی میں اگر کوئی طالب علم کسی لفظ کا تلفظ غلط کرتا ہے تو معلم کو چاہیے کہ وہ مصرع یا شعر کو بلند آواز میں دوبارہ پڑھ کر سنائے جس شعر میں وہ لفظ ہے اور اس طالبِ علم کو پھر سے غور کرنے کی ہدایت دے اور پھر سے بلند خوانی کرنے کے لیے کہے تا کہ وہ درست تلفظ اختیار کرنے کے قابل ہو سکے۔

اخذِ معنی: اردو تدریس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبا کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا جائے۔ اس لیے نئے اور مشکل الفاظ کے معنی اور استعمال پر زور دینا نہایت ہی ضروری ہے۔ لیکن نظم کی تدریس میں الفاظ کے معنی پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں۔ نظم کی تدریس کا خاص مقصد چونکہ طلبا کے جذبات کو متحرک کرنا، شعر وسخن کا ذوق اور مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور نظم خوانی سے انہیں لطف اندوز کرانا ہے۔ اس لیے دورانِ تدریس الفاظ کی تشریح ،ان کی ساخت اور ان کے معنی کا مسئلہ چھیڑ کر تدریس کو بے کیف بنانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اگر نظم میں چند الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی جانے بغیر تشریح کو سمجھنے میں مشکل ہو تو ایسے الفاظ کے مفہوم کو واضح کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ مشکل اور نئے الفاظ کے معنی نظم کی تشریح سے پہلے واضح کر دیئے جائیں۔ اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایسے مشکل الفاظ اور ان کے معنی کی ایک فہرست کا چارٹ تیار کر کے جماعت میں لٹکا دیا جائے یا تختہ سیاہ پر لکھ دیا جائے تا کہ تشریح وتوضیح کا عمل طلبا کو آسانی سے سمجھ میں آ جائے۔

اجمالی جائزہ: بلند خوانی اور تلفظ کی مشق کے بعد نظم کا اجمالی جائزہ کیا جاتا ہے۔ یہ منزل اس اعتبار سے اہم ہے کہ لطف اندوزی اور استحسانِ شعر کا آغاز اسی منزل پر ہوتا ہے۔ اس لیے اس منزل پر نظم کے مرکزی خیال کی طرف طلبا کے ذہن کو مبذول کرایا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں نظم کا اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہیے۔ معلم کو چاہیے کہ زیر تدریس نظم سے متعلق طلبا سے سوال و جواب کیے جائیں اور ان مناظر، کیفیات اور واقعات کو اخذ کرایا جائے جو نظم میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر معلم طلبا سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اس نظم میں کن مناظر اور کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے یا شاعر اس نظم میں کیا کہنا چاہتا ہے وغیرہ۔ اس عمل میں طلبا کا پورا پورا اشتراک ہونا چاہیے۔

تفصیلی جائزہ: نظم کے مرکزی خیال کی طرف طلبا کی توجہ دلانے کے بعد نظم کی تشریح وتوضیح کا عمل کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں دلچسپی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جب طلبا کا اشتراک حاصل کیا جائے۔ اس منزل پر نظم کی تشریح کے لیے متعلق شعر کی روشنی میں سوال وجواب کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔معلم کو چاہیے کہ وہ نظم سے متعلق ایسے سوالات ترتیب وتشکیل کرے کہ ان کے جوابات سے اشعار کی تشریح ہوجائے۔نظم کی تشریح کے لیے زیادہ سے زیادہ فکر انگیز سوالات کیے جائیں۔ایسے سوالات سے طلبا کو غور وفکر کا موقع ملتا ہے اوران کے تخیل کے استعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔سوالات فرداً فرداً اشعار پڑھ کر کرنا چاہیے۔مثال: نظم جگنو کے اس شعر کے لیے درج ذیل سوالات کیے جاسکتے ہیں۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

سوالات: 1۔ جگنو کی روشنی کہاں ہے؟ 2۔ جگنو کو شاعر شمع کیوں کہہ رہا ہے؟ 3۔ پھولوں کی انجمن سے یہاں کیا مراد ہے؟ اگر طلبا جواب دینے میں دشواری محسوس کریں تو معلم مزید واضح سوالات کرے اور جوابات کے لیے اشارے بھی فراہم کرے۔طلبا اگر جواب نہ بتا پائیں تب معلم بتائے۔اسی طرح سے نظم کے سبھی اشعار کی تشریح وتوضیح کا عمل کیا جاسکتا ہے۔

استحسانِ شعر: تفصیلی جائزہ کی منزل میں تشریح وتوضیح کا عمل اس خوبی کے ساتھ ہونا چاہیے کہ نظم کے صوتی آہنگ اور امیجری سے طلبا لطف اندوز ہوسکیں۔استحسانِ نظم اسی وقت ممکن ہے جب الفاظ کی موزونیت، آہنگ، صوت اور امیجری کو بہترین ڈھنگ سے اجاگر کیا جائے اور نظم کی مجموعی فضا سے طلبا کو روشناس کرایا جائے۔استحسانِ شعر کے عمل میں نظم کا تنقیدی جائزہ بھی ضروری ہوتا ہے۔معلم کو چاہیے کہ اس موقع پر پوری نظم کو زیر بحث لائے، شاعرانہ کمالات کی جانب اشارہ کرے، مناظر، سراپا اور کردار کی تصویر کشی کرے اور نظم کے حسن بیان، حسن زبان اور حسن خیال کی طرف طلبا کو متوجہ کرائے۔لطف اندوزی اور استحسان شعر کے عمل کو پر اثر بنانے کے لیے بچوں کی شخصیت اور انفرادیت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہر بچہ ایک انوکھی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔اس کی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے اوراس کے تجربات متنوع اور رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر بچہ نظم کا تاثر انفرادی طور پر قبول کرتا ہے۔ معلم کو چاہیے کہ اس تاثر کو حاصل کرنے میں طلبا کی مدد کریں اوراس بات کا پتا بھی لگانا چاہیے کہ طلبا پر نظم کا صحیح تاثر قائم ہوا یا نہیں۔صحیح تاثر کی جانچ کے لیے معلم کو چاہیے کہ وہ طلبا سے دریافت کرے کہ زیر تدریس نظم میں انہیں کون سا شعر سب سے زیادہ پسند آیا اور کیوں؟ اگر طلبا پسند کا سبب بیان کردیتا ہے تو یقیناً صحیح تاثر قائم ہوگیا اور استحسانِ شعر کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔

اعادہ یا غور کرنے کی باتیں: اعادہ کے معنی ہیں کسی چیز کا دہرانا۔ اس جگہ اعادہ سے ایسا اقدام مراد ہے جس میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ طلبا زیر تدریس نظم کو پوری طرح ذہن نشین کر سکے ہیں یا نہیں۔ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اعادہ کے ذریعے اسے پورا کیا جائے۔ اعادے کے ذریعے سبق بحیثیت مجموعی طلبا کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس لیے اس کا ایک مقصد یہ ہے کہ اگر سبق کی تفہیم میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو اعادے کے ذریعے اس کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ اعادہ میں سوالات بھی کیے جا سکتے ہیں اور سبق کو دوبارہ پڑھوایا بھی جا سکتا ہے۔ اعادہ گویا طلبا کے اکتساب کی نوعیت اور معلم کی کارکردگی کا پیمانہ بھی ہے جس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ پڑھایا ہوا سبق موثر رہا یا نہیں۔ نظم کے سبق کے اعادے میں نظم کو دوبارہ پڑھوا کر لطف اندوزی کے ساتھ سبق کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔

اختتام: زبان و ادب کی تعلیم میں نظم کی تدریس کے ذریعے طلبا میں کئی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے نظم کی تدریس کے لیے معلم کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے معلم کو مندرجہ بالا اقدامات کو مدنظر رکھتے ہوئے نظم کی تدریس و آموزش کا عمل کرنا چاہیے۔ اگر معلم نظم کی تدریس کے لیے تدریسی طریقۂ کار کے طور پر ان اقدامات کو استعمال کرتے ہیں تو تدریس موثر اور دلچسپ ہوگی۔ اور نظم کے تدریسی مقاصد کی حصولیابی بھی آسانی سے ہو سکے گی۔

حوالہ جات

1۔ اردو تدریس: جدید طریقے اور تقاضے، ریاض احمد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2013

2۔ اردو تدریسیات، سید جلیل الدین، دکن ٹریڈرس ایجوکیشنل پبلیشرز، حیدر آباد، 2020

3۔ اردو زبان کی تدریس، معین الدین، قومی کانسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2011

4۔ تدریس اردو، زبیدہ حبیب، ادبستان پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2012

5۔ تدریس اردو، فرمان فتح پوری، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، 1986

6۔ تدریسِ زبانِ اردو، انعام اللہ خاں شروانی، مارکوئس اسٹریٹ، کلکتہ، 1989

7۔ تدریس اردو، نجم الحرا اور صابرہ سعید، پریمئر پبلشنگ ہاؤس، حیدر آباد، 2007

8۔ رہنما کتاب، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، 2010

☆☆☆